شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ
کے چند علمی، دینی، اصلاحی اور سیاسی مقالات و بیانات
کا حسین اور نادر مجموعہ

جلد دوم

مرتّب
مولانا شفیع اللہ صاحب
جامعہ دار العلوم کراچی

مقالاتِ عثمانی

جلد دوم

مقالاتِ عثمانی

جلد دوم

مولانا ظفر احمد عثمانی قدس اللہ سرہٗ

مرتب

مولانا شفیع اللہ صاحب

جامعہ دار العلوم کراچی

بیت العلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

کتاب: مقالات عثمانی (جلد دوم)

مؤلف: حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

مرتب: مولانا شفیع اللہ صاحب

باہتمام: محمد ناظم اشرف

ناشر: بیت العلوم۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور

فون: ۷۳۵۲۴۸۳

﴿ملنے کے پتے﴾

بیت العلوم = ۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور

ادارہ اسلامیات = ۱۹۰ انارکلی، لاہور

ادارہ اسلامیات = موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی

دارالاشاعت = اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت القرآن = اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت الکتب = گلشن اقبال، کراچی

ادارۃ المعارف = ڈاک خانہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دارالعلوم = جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن = اردو بازار کراچی

مکتبہ سید احمد شہید = الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

عرض مرتب

اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضرت اقدس مفتی محمود اشرف عثمانی زید مجدہم کو جہاں اور نمایاں خصوصیات سے نوازا ایک خاص بات ان میں یہ بھی ہے کہ انہیں بزرگوں کی تصانیف سے گویا عشق ہے، وہ اکابر کی تحریرات سے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں۔ بلکہ اکابر علماء کی تحریرات کو محفوظ رکھنے کے دلی خواہشمند ہیں۔

اسی وجہ سے وہ اکابر کی نایاب تحریر کو تلاش کر کے چھپواتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے اسی سلسلے میں احقر کے ذمہ کام لگایا کہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نایاب تالیفات کو جمع کر دوں۔ حضرت کی دعا و توجہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے قریباً تمام مضامین و کتابیں جو اکثر و بیشتر مختلف رسائل کی فائلوں میں دفن تھے حاصل کر لئے گئے، ہندو پاک میں جہاں جہاں سے حضرت والا رحمہ اللہ کے مضامین ملنے کی امید تھی خطوط لکھے بعض علاقوں کا سفر کیا۔ اس طرح نادر و نایاب مضامین یکجا ہو گئے جن میں سے چند کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور انہیں علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اب یہ مختلف مضامین و رسائل کا مجموعہ و مقالات عثمانی (جلد ثانی) کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ مگر اب یہ ادارہ

اسلامیات کی بجائے بیت العلوم لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ کیونکہ بیت العلوم کے مالک مولانا محمد ناظم اشرف صاحب مدظلہ نے اس سے پہلے مقالات عثمانی کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔

احقر نے جب ان مضامین و رسائل کا مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد اشرف صاحب عثمانی مدظلہم کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت والا نے فرمایا۔ چونکہ پہلا مجموعہ مولوی ناظم اشرف نے شائع کیا ہے یہ بھی ان کو دیدو تاکہ ایک جگہ سے چھپ جائے۔ اس طرح یہ مجموعہ بیت العلوم لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ان کتابوں و رسالوں کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

شفیع اللہ عفا اللہ عنہ
جامعہ دار العلوم کراچی کورنگی
١١-٨-١٤٢٥ھ

﴿فہرست مقالات﴾

فہرست

طریقہ تعلیم قرآن

﴿طریقہ تعلیم القرآن﴾

بسم اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

﴿اَلرَّحمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ O عَلَّمَهُ الْبَیَانَ O اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ O وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ O وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ O اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ O وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ O وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ O فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ O وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ O فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ O وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ الْاَتَمَّانِ الْاَكْمَلَانِ O عَلٰی صَفْوَةِ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهٖ سَیِّدِ الْاِنْسِ وَالْجَآنِّ O سَیِّدِنَا وَحَبِیْبِنَا وَنَبِیِّنَا مُحَمَّدِنِ الْعَرَبِیِّ الْهَاشِمِیِّ الْمَبْعُوْثِ مِنْ بَنِیْ عَدْنَانَ O وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَهْلِ بَیْتِهٖ وَذُرِّیَّتِهٖ وَالتَّابِعِیْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ O رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنَّا وَعَنْهُمْ وَعَنْ كُلِّ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی بِاِحْسَانٍ O﴾

''رحمٰن ہی نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔ اس کو صاف صاف بولنا سکھایا۔ آفتاب و ماہتاب حساب مقررہ سے چل رہے ہیں۔ بیل دار تنا دار درخت جھکے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو رفعت دی اور ایک میزان مقرر کی اور یہ حکم دیا کہ میزان میں ظلم

نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو اس میں کمی نہ کرو۔
زمین کو مخلوق کیلئے پست کر دیا۔ اس میں میوے ہیں اور کھجوریں
غلاف دار اور بیج والی غذا جس میں کوئی بھوسہ کے ساتھ ہے۔ کوئی
بغیر بھوسہ کے اب تم بتاؤ کہ اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار
کرو گے؟ اور درود وسلام کامل و تمام تر اس ذات ستودہ صفات پر
جو تمام مخلوق میں اللہ کا برگزیدہ جن و انسان کا سردار ہے۔ یعنی
ہمارے آقا ہمارے محبوب ہمارے نبی سیدنا محمدؐ عربی ہاشمی پر جو قبیلہ
عدنان سے مبعوث ہوئے اور آپ کی آل واصحاب واہل بیت اور
اولاد پر اور ان لوگوں پر جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کا اتباع
کیا اللہ تعالیٰ ہم سے اور ان سے اور ہر اس شخص سے راضی ہو جس
نے ایمان کے ساتھ ہدایت کی پیروی کی۔''

اَمَّا بَعْد.

محترم حاضرین جلسہ!

تشکر وامتنان

میں آپ کا تہہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کو اپنے اس مہتم بالشان جلسہ میں مدعو فرمایا اور تعلیم قرآن کریم کے متبرک اور مقدس عنوان پر تقریر کرنے کے لئے مجھے منتخب کیا چونکہ وقت زیادہ نہیں اس لئے مختصر طور پر مکرر شکریہ ادا کرتے ہوئے اصل مقصد کو شروع کرتا ہوں۔

تمہید

مجھے اس وقت قرآن کی تعلیم پر تقریر کرنا ہے جس کی دو جزو ہیں۔ قرآن اور اس کی تعلیم تقاضائے عقلی تو یہ تھا کہ میں اول قرآن کے متعلق کچھ بیان کرتا پھر تعلیم کے متعلق، کیونکہ کسی کتاب کی تعلیم اور اس کے طریقہ تعلیم پر روشنی ڈالنا اسی وقت مفید ہے

جب اول خوداس کی حقیقت عظمت اور غایت سے سامعین کو مطلع کر دیا جائے۔ مگر چونکہ یہ جلسہ ایجوکیشنل بورڈ کے زیر اہتمام ہو رہا ہے۔ جس کا مقصود غالبًا طریقہ تعلیم قرآن پر تقریر کرنا ہے۔ اس لئے میں اول طریقہ تعلیم ہی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وقت نے موقعہ دیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ نفس قرآن پر بھی کچھ عرض کرونگا۔

تعلیم قرآن کے درجات

معزز حضرات! تعلیم قرآن کے تین درجے ہیں جن سے آپ بخوبی واقف ہوں گے (۱) قاعدہ پڑھانا (۲) قرآن ناظرہ کرانا (۳) قرآن حفظ کرانا۔

قاعدہ کی تعلیم

قاعدہ کی تعلیم کو بنیاد اور اساس کہنا چاہیے۔ جو معلم قاعدہ اچھی طرح پڑھا سکتا ہے اور قاعدہ ہی میں بچوں کو صحیح روان پڑھنے پر قادر اور تیز کر دیتا ہے وہ یقیناً کامیاب مدرس ہے۔

طریقہ تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ بچوں کی نازک طبیعت پر ذرا بوجھ نہ پڑے اور ان کی استعداد روز بروز بڑھتی جائے، ان کے شوق میں اضافہ ہو علم میں ایسی لذت آنے لگے کہ گھر سے زیادہ اسکول اور مدرسہ میں ان کا دل لگے۔

مدرس کو خوش خلق، بردبار، متحمل، قانع صابر و شاکر ہونا چاہیے۔ خود غرض، لالچی، تندخو، ترش رو نہ ہو اس صورت میں نازک بدن، نازک مزاج، ناز پروردہ، لاڈلے بچوں کو مار پیٹ اور خفگی کا سماں دیکھنے کی نوبت نہ آئے گی۔

قاعدہ شروع کرانے کا طریقہ

سب سے پہلے اسکول منیجر اور اسکول ماسٹر کو قاعدہ عربی کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کیونکہ بعضے پرانے قاعدے آجکل کی طبائع کے مناسب نہیں ہیں اس سے ترقی استعداد میں دیر لگتی ہے میرے تجربہ میں قاعدہ تعلیم القرآن اور نورانی قاعدہ بہت زیادہ مفید ثابت ہوئے تجربہ ہو چکا ہے کہ نورانی قاعدہ ہدایات کے موافق پڑھایا جائے تو چھ سال کے بچے

چار پانچ مہینوں میں ناظرہ قرآن ختم کر لیتے ہیں۔

قاعدہ پڑھانے کے اصول

قاعدہ پڑھانے میں مدرس کو چند باتوں کا لحاظ کرنا اشد ضروری ہے۔

(۱) یہ کہ قاعدہ پڑھنے والے بچوں کی جماعت بندی کا اہتمام کیا جائے سب بچوں کو الگ الگ قاعدہ کا سبق دینا سخت دشوار ہے۔ اور بچوں کو حرف شناسی میں دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

(۲) محبت و پیار کے ساتھ بچوں کو پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پڑھاؤ اور تاکید کرو کہ ہر کام بسم اللہ الخ سے شروع کرے۔ اس کے بعد شہادت کی انگلی ایک ایک حرف پر رکھوا کر تھوڑا تھوڑا سبق پڑھاؤ اور عربی حروف کے عربی نام یاد کراؤ۔ مثلاً۔ با۔ تا۔ ثا۔ جیم۔ حا۔ خا۔ را۔ زا۔ طا۔ ظا۔ فا۔ وغیرہ۔ بے۔ تے۔ ثے۔ حے۔ خے۔ رے۔ زے۔ نہ کہو کیونکہ یہ نام فارسی ہیں نہ کہ عربی۔

(۳) جب بچہ الف۔ با کی پہلی تختی ختم کر لے جب تک اس کو پوری طرح حروف کی پہچان اور شناخت نہ ہو جائے ہرگز آگے سبق نہ دو۔

(۴) حروف مفردہ کی شناخت میں نقطوں کی پہچان کو بہت بڑا دخل ہے کیونکہ ب۔ ت۔ ث۔ تینوں کی ایک ہی شکل ہے۔ اسی طرح ج۔ ح۔ خ۔ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ وغیرہ میں نقطوں ہی کے ذریعہ امتیاز ہوتا ہے۔ اس لئے مدرس کو لازم ہے کہ قاعدہ پڑھانے کے وقت تختہ سیاہ اور چاک اپنے پاس رکھے اور ب کی شکل بغیر نقطہ کے بنا کر اس کو کبھی ب بنائے کبھی ت کبھی ث اور کبھی بچوں سے کہے کہ اس شکل کو ب بناؤ پھر ت بناؤ پھر ث بناؤ اس طرح نقطہ لگا کر ح کو جیم اور خا بناؤ اور بچوں سے اس کا نام دریافت کر کے ان کو ہر حرف کی شناخت اچھی طرح کراؤ۔

علیٰ ہذا القیاس ب اور ں۔ ی کو نقطوں سے خالی بنا کر بچوں سے سوال کرو۔ کہ یہ کیا ہے؟ اگر کوئی جواب دے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس کو شاباش دو اور پوچھو کہ اگر ہم

اس کو بَا اور نوُن اور یا بنانا چاہیں تو کیا کریں! تو وہ کہے گا کہ اس کے نیچے ایک نقطہ رکھو۔ اور اس کے نیچے دو اور اس کے بیچ میں ایک، اگر کوئی بچہ بدون نقطہ کے (ب) کی شکل کو با اور نون کی شکل نون اور ی کی شکل کو یا کہے اس کو سمجھاؤ کہ اس کے نیچے ایک نقطہ یا دو نقطہ یا بیچ میں نقطہ کہاں ہے۔ جو تم نے با اور نون اور یا کہہ دیا۔

(۵) بچوں کی فطرت ہے کہ وہ الف سے لے کر یا تک تمام حروف زبانی یاد کر لیتے ہیں اس لئے اگر آپ شروع سے ایک ایک حرف کو پوچھیں گے تو وہ بے تکلف ہر حرف کا نام بیان کرتے چلے جائیں گے جس سے بظاہر آپ یہ سمجھیں گے کہ ان کو حروف کی پہچان ہوگئی حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوگی جس کا تجربہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ الٹی طرف سے ایک ایک حرف پوچھیں تو وہ ان کا نام نہ بتلا سکیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ حروف مفردہ کی تختی ایک دفعہ الف سے یا تک پڑھا کر پھر ی سے الف تک الٹی پڑھائی جائے اور ہر لائن کو اول سے آخر تک اور آخر سے اول تک اور اوپر سے نیچے کو نیچے سے اوپر کو سنو اور یہ طریقہ قاعدہ کی ہر تختی میں ملحوظ رکھو تو بچے محض یاد سے کام نہ لیں گے بلکہ ہر لفظ پہچان کر بتلائیں گے۔

(۶) قاعدہ پڑھانے والے مدرس کو اپنے پاس حروف مفردہ الگ الگ موٹے کاغذ پر لکھے ہوئے رکھنا چاہئیں بچوں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے ایک ایک ورق بلا ترتیب میز پر ڈال کر ان سے پوچھے کہ یہ کیا ہے؟ یہ کونسا حرف ہے؟ روزانہ یہ عمل کیا جائے گا تو اس سے بچوں کو حروف کی پہچان ہوگی۔ اور ان کا دل بھی بہلے گا۔ جب وہ بے تکلف تمام حروف کو پہچاننے لگیں تو اب سیپارہ ان کے سامنے رکھ کر حروف مفردہ کو پوچھو اگر کوئی بچہ نہ بتا سکے تو گھبراؤ نہیں، نہ غصہ کرو، بلکہ وہی حرف قاعدہ میں دکھلاؤ۔ پھر بھی نہ آئے تو خود بتلا دو کہ دیکھو یہ فلاں حرف ہے، قاعدہ اور سیپارہ میں اس کی ایک ہی شکل ہے، پھر تم نے پہچاننے میں کیوں دیر کی؟

الغرض پہلی ہی تختی میں اس قدر حرف شناسی ہو جانا چاہیے کہ جس کتاب اور جس سیپارے سے بھی جو مفرد حرف پوچھو بلا تامل بتلا دیں یہ امتحان روزمرہ لیا کرو۔ جتنا

امتحان لیا کرو گے اور جتنی دیر اس میں لگاؤ گے اسی قدر فائدہ ہوگا، روزمرہ کے سبق سے اس امتحان کو مقدم سمجھو بلکہ اس امتحان ہی کو سبق جانو اگر کسی دن سبق نہ ہو تو مضائقہ نہیں، مگر یہ امتحان ضرور ہو۔

(نوٹ)

ان ہدایات کو قاعدہ کی ہر تختی میں ملحوظ رکھنا چاہیے اور یہ ہدایات عربی قاعدہ ہی کے لئے مختص نہیں بلکہ اردو کے قاعدہ میں بھی اس کی رعایت بہت نافع ہوگی حروف مفردہ کی پہلی تختی میں ۲۹ تک گنتی بھی بچوں کو یاد کرادینا چاہیے، پہلے دن چار حروف پڑھاؤ تو ان کو چار تک گنتی بھی یاد کرادو اور دوسرے دن پانچ حروف پڑھاؤ تو نو تک گنتی بھی سکھلا دو، اور یہ بھی بتلا دو کہ ۴+۵=۹ ہوئے ہیں روزانہ اسی طرح کیا جائے تو ان کو ۲۹ تک گنتی بسہولت آجائے گی۔

(۷) حروف مفردہ کی پہچان پوری ہو جائے تو اب مرکبات کی تختی شروع کراؤ، اکثر حروف جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں، مرکبات میں ن۔ی۔ب۔ت۔ث ہم شکل ہو جاتے ہیں صرف نقطوں کی تعداد اور ان کے اوپر نیچے ہونے سے امتیاز ہوتا ہے اس لئے مرکبات میں بچہ اسی وقت چل سکے گا جبکہ نقطوں کی شناخت کامل ہو چکی ہو۔

مرکبات کی تختی میں بھی ان ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے جو ہم نے اوپر بتلائی ہے اس تختی میں بچوں کو مطالعہ کا طریقہ بتلاؤ، مثلاً پارہ عم کا ایک صفحہ یا چند سطریں مقرر کر کے طلبہ سے کہو کہ اس کے تمام حرفوں کو پہچانیں جس حرف کو نہ پہچان سکیں اس کو قاعدہ کی تختی مرکبات میں دکھلاؤ اس تختی میں اتنی مشق ہو جانا چاہیے کہ پارہ عم اور قرآن مجید کے جس مقام سے حروف پوچھے جائیں بچے بلا تامل حرفوں کے نام بتلاتے چلے جائیں۔ مثلاً عَبَسَ وَتَوَلّٰی کو یوں بتلا سکیں ع۔ب۔س۔و۔ت۔و۔ل۔ی۔ جب تک اتنی مشق نہ ہو جائے آگے نہ پڑھاؤ قاعدہ میں حروف کی شناخت ہی مقصود ہے سبق

دینا مقصود نہیں یاد رکھو! جو استاد قاعدہ پڑھانے میں جلدی کرتا ہے اور کوشش و محنت سے کام نہیں لیتا وہ بچوں کی عمر اور استعداد کو برباد کرتا ہے اس کا گناہ چوری اور رہزنی سے بھی زیادہ ہے کیونکہ مال و اسباب پھر بھی مل سکتا ہے لیکن ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' اور بگڑی ہوئی استعداد درست نہیں ہوتی۔

(۸) مفرد اور مرکب حروف کی پوری پہچان ہو جائے تو اب بچوں کو حرکات و سکون کی تعلیم دی جائے جس کو زبر، زیر، پیش اور جزم کہتے ہیں اس کے بارے میں مجھ کو چند ضروری باتیں عرض کرنی ہیں۔

(الف) حرکتوں کو اتنا نہ کھینچنا چاہیے کہ زبر سے الف، زیر سے یا اور پیش سے واؤ پیدا ہو جائے مثلاً بَ کو با اور بِ کو بی اور بُ کو بو پڑھا جائے۔ ورنہ بَ بِ بُ اور با، بی، بو میں کچھ بھی فرق نہ ہوگا۔

(ب) زیر اور پیش کو بچے مجہول نہ پڑھیں بلکہ معروف پڑھیں۔

(ج) اسم ذات اللہ سے پہلے اگر زبر یا پیش ہو تو لام کو پُر کرنا چاہیے جیسے ذَهَبَ اللّٰهُ، وَلَعَنَهُ اللّٰهُ، اور زیر ہو تو باریک پڑھنا چاہیے جیسے بِسْمِ اللّٰهِ

(د) راء کے اوپر اگر زبر یا پیش ہو تو پُر پڑھنا چاہیے اور زیر ہو تو باریک اور جزم ہو تو اس سے پہلے حرف کی حرکت کو دیکھنا چاہیے جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰن. میں دونوں جگہ راء پُر ہے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ میں پہلی راء پُر اور دوسری باریک ہے۔

(ہ) دو زبر، دو زیر، دو پیش کو تنوین کہتے ہیں اور وہ پڑھنے میں نون ساکن کی طرح پڑھی جاتی ہے۔ جس حرف پر دو زبر ہوں اس کے آخر میں ایک الف لکھا جاتا ہے اور بعض جگہ ی بھی، مگر یہ دونوں نہ پڑھنے میں آتے ہیں نہ ہجوں میں، یہ قاعدہ بچوں کو خوب سمجھا دینا چاہیے۔

(و) حرکات کی تختیوں کو رواں اور ہجے دونوں طرح سے پڑھانا چاہیے رواں اول سے آخر اور آخر سے اول کی طرف بھی پڑھائی جائے اور ہر لائن کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھی پڑھانا چاہیے۔

(ز) ان تختیوں میں بچوں کو حروف کا نام نہ بتلایا جائے کیونکہ حروف مفردہ اور مرکبات کی پہچان ان کو ہوچکی ہے اب وہ خود ہر ہر حرف کو پہچانیں اور بتلائیں استاد کا کام صرف زیر، زبر، پیش کی آواز بتلانا ہے اس سے زیادہ جو بتلائے گا وہ بچوں کی استعداد کو خراب کرے گا۔

(۹) جب حرکات کی خوب پہچان ہو جائے تو اب مد اور تشدید بتلانا چاہیے کہ جس حرف پر مد ہو اس کو اچھی طرح دراز کیا جائے تشدید وادغام کو بخوبی ادا کیا جائے۔

(۱۰) جب بچوں کو حرکات، مد و تشدید کی خوب شناخت ہو جائے تو اب پارہ عم سامنے رکھ کر سوال کرنا چاہیے کہ یہ لفظ کیا ہے ہجے کرو، روان بولو، نورانی قاعدہ میں جو مرکبات کلمات دیئے گئے وہ سب قرآن ہی کے الفاظ ہیں اور پارہ عم کے زیادہ ہیں ان الفاظ کو پارہ عم کے اندر بھی ضروری پوچھنا اور بتلانا چاہیے اس طریقہ پر قاعدہ پڑھایا جائے تو اس کے بعد پانچ چھ مہینے میں ناظرہ قرآن ختم کرنا معمولی بات ہے۔

تصحیح مخارج

تنبیہ: قاعدہ پڑھانے والے کو لازم ہے کہ قاعدہ ہی میں بچوں کے مخارج حروف صحیح کر دے بچہ اگر ایک حرف کو غلط بولتا ہے تو تم لاڈ اور پیار میں ہرگز غلط نہ بولو بچے کے سامنے ہر حرف کو ہمیشہ صحیح ادا کرو، بچہ استاد کے لب ولہجہ کی نقل کرنے میں خود کوشش کرتا اور رفتہ رفتہ صحیح تلفظ پر قادر ہو جاتا ہے اور اگر مدرس قاعدہ میں شروع سے آخر تک ہر لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرتا رہے اور بچہ کو بھی تاکید کرتا رہے کہ ت ط اور ذ ز ظ۔ض۔ س۔ص۔ث۔ق۔ک کو الگ الگ صحیح ادا کرے تو یقیناً قاعدہ ختم ہونے سے پہلے بچے کے تمام مخارج ٹھیک ہو جائیں گے ورنہ استاد کی ذرا سی غفلت ہمیشہ کے لئے بچہ کے حق میں وبال جان بن جائے گی اور سارے قرآن میں بھی اس کے مخارج درست نہ ہوں گے اور جس کے مخارج غلط ہوں اس کا قرآن پڑھنا صحیح معنوں میں قرآن پڑھنا نہیں ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جب تک حروف کو عربی زبان کے قاعدہ سے ادا نہ کیا

جائے گا اس وقت تک صحیح قرآن پڑھنا صادق نہیں آئے گا۔

ناک میں پڑھنے سے احتراز

تنبیہ: بعض لوگ الف اور واؤ اور یا ساکن کے ساتھ نون کی آواز بھی نکالتے ہیں مثلاً مَا۔ مو۔ مِی۔ اور نا۔ نو۔ نِی کو ماں۔ موں۔ میں اور ناں۔ نوں۔ نِیں پڑھتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے اس سے بچنا چاہیے اور بچوں کو بھی روکنا چاہیے۔

ناظرہ قرآن پڑھانے کا طریقہ

قاعدہ عربی کا طریقہ تعلیم عرض کر دینے کے بعد اب میں ناظرہ قرآن پڑھانے کے متعلق چند ضروری اصول عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے مدرس کو اپنا دل قرآن کریم کی عظمت و شوکت سے لبریز کرنا چاہیے اور مدرس جتنا قرآن کا ادب کرے گا بچے بھی اتنا ہی ادب کریں گے۔ بچوں کو تنبیہ کرنا چاہیے کہ سیپارے کے پھٹے ہوئے اوراق کو بے پرواہی سے ادھر ادھر نہ ڈالیں بلکہ ایک صندوق میں رکھ دیں جو اس کام کے لئے بنایا گیا ہو۔

(۲) مدرس کو لازم ہے کہ بے وضو قرآن کو ہرگز ہاتھ نہ لگائے اور سمجھ دار اور ہوشیار بچوں کو بھی وضو کرنے کی تاکید کرے، قرآن کی طرف پیر لمبے کرنا اور پشت کرنا سخت جرم ہے اس سے خود بھی احتیاط لازم ہے اور بچوں کو بھی روکنا چاہیے۔

(۳) ناظرہ قرآن پڑھانے میں حرکات کا صحیح ہونا۔ مخارج کا درست ہونا، اظہار و اخفا و غنہ وغیرہ کا ادا کرنا اور روان کا عمدہ ہونا بہت ضروری ہے، پارہ عم ہی کے اندر بچوں کو رواں اور ہجے میں تیز کر دینا چاہیے اور آموختہ کو سبق تک روزانہ پڑھ لینے کی تاکید کی جائے۔

(۴) اگر قاعدہ میں جماعت بندی کا اہتمام کی گیا ہو تو پارہ عم میں جماعت بندی سہل ہوگی اس صورت میں ناظرہ قرآن پڑھانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اول ایک بچہ ایک آیت کو ہجے اور روان سے پڑھے پھر دوسرا اور تیسرا اسی طرح پڑھے، پھر باقی

بچوں میں سے ہر ایک اس آیت کو روان پڑھے جب ایک بچہ پڑھتا ہو تو ساری جماعت سنتی رہے اس کے بعد دوسری آیت اسی طرح ہر بچہ پڑھے اور باقی سنیں۔ اگر سبق زیادہ دینا ہو تو ایک دم سے نہ دو بلکہ ایک ایک آیت کو سب سے پڑھوا کر دوسری تیسری آیت پڑھاؤ۔

(۵) جماعت بندی کی صورت میں آموختہ کی نگہداشت بہت آسان ہے دو دو بچوں کی جوڑی مقرر کر دی جائے کہ ایک اس کا آموختہ سنے اور دوسرا اس کا سنے۔

(۶) بچوں کو ہدایت کی جائے کہ ایک کلمہ کے بیچ میں وقفہ کبھی نہ کریں۔ شروع پارہ عم میں اگر بچہ کمزور ہو اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کو رَبِّلْ عَا لَمِيْنَ. پڑھے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر مدرس کو خیال رکھنا چاہیے کہ یہ کمزوری پارہ عم کے ختم ہونے تک نکل جائے اور بچہ بخوبی رواں پڑھنے لگے۔ کیونکہ حرفوں کو کاٹ کاٹ کر پڑھنا بڑا عیب ہے۔

(۷) جب ایک پارہ ختم ہو جائے تو اب روزانہ سبق تک آموختہ نہ ہو سکے گا اس لئے اس کی مقدار مقرر کر دیں کہ روزانہ نصف یا ربع پارہ پڑھ لیا جائے۔

(۸) ہفتہ میں ایک دن جمعرات یا اور کوئی دن آموختہ کی دیکھ بھال کے لئے رکھا جائے اس دن سبق نہ دیا جائے۔

(۹) بچوں کو زور زور سے اور ہل ہل کر پڑھنے سے منع کیا جائے اس کو یاد ہونے میں کچھ بھی دخل نہیں بس اتنی آواز سے پڑھنا چاہیے کہ پاس والا سن سکے قرآن کے پڑھنے سے تھوڑی سی حرکت تو بدن کو ضرور ہوتی ہے جس کا منشا نشاط روحانی ہے مگر زیادہ ہلنے سے بچوں کو منع کر دیا جائے۔

(۱۰) قرآن پڑھانے والے کو رسم خط قرآنی سے واقف ہونا چاہیے۔ قرآن کو جس شخص نے کسی استاد سے نہیں پڑھا وہ یقیناً صحیح پڑھنے پر قادر نہ ہوگا کیونکہ قرآن کا رسم خط تمام کتابوں سے الگ ہے۔ ایک یورپین بہادر نے قرآن میں الٓـــر لکھا ہوا دیکھا تو کہنے لگے یہ کیا ہے؟ آلو! کسی مسلمان نے ہنس کر کہا کہ عرب میں آلو کہاں وہ تو یورپ میں ہوتے ہیں اور اپنا قرآن اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

بہت سے کلمات قرآن کے اندر لکھنے میں اور طرح اور پڑھنے میں اور طرح ہیں مثلاً سورہ کہف میں لٰکِنّا لکھا ہوا ہے مگر پڑھا جاتا ہے لٰکِنَّ اس طرح بہت سی جگہ الف لکھا ہوا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا اور بعض جگہ صاد لکھا ہوا ہے اس کو سین پڑھا جاتا ہے اس کا جاننا استاد کے بتلانے پر موقوف ہے اگر مدرس قرآن کے رسم خط سے ناواقف ہو تو اس کا شاگرد یقیناً غلط خواں ہوگا۔

حفظ قرآن کے اصول

ناظرہ قرآن پڑھانے کے متعلق میں ضروری باتیں عرض کر چکا۔ چونکہ رنگون و برما کے سرکاری سکولوں میں حفظ قرآن کا اہتمام نہیں ہے اس لئے اس کے اصول بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر یہ باتیں دو خیال سے عرض کرتا ہوں ایک اس لئے کہ میرا مضمون ناقص و ناتمام نہ رہے مکمل ہو جائے۔ دوسری اس لئے کہ شاید یہاں بھی کبھی کسی کو توفیق ہو جاوے۔ حفظ قرآن کا آسان قاعدہ یہ ہے۔

(الف) بچہ کا حافظہ کمزور ہو تو پانچ آیت سے زیادہ سبق نہ دیا جائے اور قوی ہو تو گیارہ آیات تک دے سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ۔

(ب) بچہ کو تاکید کی جائے کہ ہر آیت کو کم از کم گیارہ بار یاد کرے، پانچ دفعہ دیکھ کر اور چھ دفعہ بغیر دیکھے ایک آیت کو گیارہ بار کہہ کر پھر دوسری آیت کو گیارہ بار اسی طرح کہے۔ پھر دونوں کو ملا کر گیارہ بار کہے پھر تیسری کو گیارہ بار الگ کہہ کر تینوں کو ملا کر گیارہ بار کہے اسی طرح پانچ یا گیارہ آیتوں کو الگ الگ بھی گیارہ بار کہے اور شروع سبق سے ملا کر بھی، انشاء اللہ تعالیٰ ایک گھنٹہ میں سبق پختہ ہو جائے گا۔

(ج) جب تک ایک منزل پوری نہ ہو شروع سے سبق تک روزانہ آموختہ سنا جائے اور بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ استاد سنے اور ایک دفعہ شاگرد خود پڑھ لیا کرے۔ جب ایک منزل پوری ہو جائے تو سبق تک ایک سیپارہ اور سنا جائے اور آموختہ کا بھی کم از کم ایک سیپارہ مقرر کر دیا جائے۔

(د) جب سیپارہ سناتے ہوئے طالب علم کو تشابہ ہونے لگے تو استاد صرف غلطی درست کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ یہ پوچھے کہ تم کو یہ تشابہ کس سورت اور کس سیپارہ سے لگا ہے'' وہ سوچ کر بتلائے گا اگر نہ بتلا سکے تو استاد خود بتلا دے کہ تم کو فلاں سورت اور فلاں سیپارہ سے لگا تھا۔ یہ آیت وہاں اس طرح ہے اور یہاں اس طرح، اگر متشابہات پر اس طرح روک ٹوک سے کام لیا گیا تو شاگرد کو متشابہات قرآن محفوظ ہو جائیں گے اور آئندہ غلطی سے محفوظ رہیں گے۔

(ہ) طالب علم کو تنبیہ کی جائے کہ قرآن نہ اتنا تیز پڑھے کہ حروف کٹنے لپٹنے لگیں اور نہ اتنا آہستہ پڑھے کہ بھولنے لگے، پڑھتے وقت وقف و وصل کی رعایت بہت ضروری ہے۔ بعض آدھے لفظ پر اس طرح سانس توڑتے ہیں کہ معنے بگڑ جاتے ہیں جیسے فی نار جہنم خا، یہ بہت بڑی غلطی ہے بلکہ فی نار جہنم خالدین کہہ کر سانس توڑنا چاہیے حروف مشدد پر وقف ہو تو تشدید ظاہر کر کے وقف کرنا چاہیے جیسے این المفرّ، کل امر مستقرّ، لم یطمثھن اِنْسٌ ولا جانّ، کو اَیْنَ المفرُ مُسْتَقَرُ ولاجَانُ پڑھنا غلط ہے۔

(و) حفظ قرآن تمام ہو جانے کے بعد سال بھر تک استاد کو کم از کم ایک پارہ روز سنایا جائے اور اسی سیپارے کو مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد نفلوں میں تنہا پڑھنا چاہیے۔

(ز) رمضان شریف میں حافظ کو قرآن سنانا یا سننا نماز تراویح میں بہت ضروری ہے۔ ورنہ حفظ کمزور ہو جائے گا۔ اگر پڑھنے کا اتفاق نہ ہو اور سامع بننا پڑے تو اس سیپارے کو خود بھی نفلوں میں پڑھنا چاہیے۔

(ح) بعض لوگ تنہا بدوں استاد کے حفظ کرنے لگتے ہیں اس طرح قرآن کا حفظ بہت دشوار ہے۔ کسی کو حفظ میں استاد بنانا ضروری ہے ورنہ یا تو حفظ ہی نہ ہوگا یا غلط حفظ ہوگا۔

(ط) جس کو حفظ قرآن میں دشواری ہوتی ہو، اس کو دعائے حفظ قرآن تین چار

ہفتہ تک باقاعدہ ہر جمعہ کی رات میں پڑھنا چاہیے ان شاء اللہ تعالیٰ حفظ آسان ہو جائے گا۔ جس کی ترکیب مناجات مقبول میں لکھی ہے۔

(ی) حافظ قرآن کو ضروری ہے کہ قرآن کو دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بنائے اور استاد کی بے ادبی نہ کرے اس سے گناہ بھی ہوتا ہے اور تعلیم میں برکت بھی نہیں ہوتی۔ نہ آئندہ کو فیض جاری ہوتا ہے۔

مطالب قرآن پڑھانے کا طریقہ

جب مسلمان ناظرہ یا حفظ قرآن سے فارغ ہو جائے تو اس کو لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کی کوشش کرے جس کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ عربی زبان کا ادب وصرف ونحو ولغت پہلے سیکھے پھر قرآن کی معتبر تفاسیر کے ذریعہ اس کے معانی ومطالب کو حل کرے لیکن جس کو اس کی فرصت نہ ہو اسے کم ازکم اردو تراجم اور تفاسیر کے ذریعے سے مطالب قرآن سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اگر کوئی عالم پڑھانے والا مل جائے تو بہتر صورت یہ ہے کہ اس سے سبقاً سبقاً ترجمہ قرآن پڑھ لیا جائے ورنہ خود مطالعہ کیا جائے اور جہاں مطلب سمجھ میں نہ آوے اپنی عقل سے مطلب نہ بنا دے بلکہ وہاں نشان کر کے کسی موقعہ پر محقق عالم سے زبانی دریافت کرے یا بذریعہ خط وکتابت کے حل کرلے۔ سرکاری مدارس کے طلبہ کو معانی قرآن پڑھانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک پیریڈ میں کوئی عالم یا باقاعدہ ترجمہ جاننے والا ماسٹر قرآن مترجم سامنے رکھ کر سب طلبہ کو بطور وعظ وتقریر کے سنا دیا کرے اور اس کے لئے علماء محققین کا ترجمہ اختیار کیا جائے قدیم تراجم میں شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ بہت عمدہ ہے اور جدید تراجم میں حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب دام مجدہم[1] اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کا ترجمہ بہترین تراجم سے ہے۔ طریقہ تعلیم بتلا دینے کے بعد میں یہ بھی بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کیا چیز ہے؟ اس کو قرآن کیوں کہتے ہیں؟ اس کی تعلیم کا خلاصہ اور نتیجہ کیا ہے؟

---

[1] اس تقریر کے وقت حضرت اس عالم ناسوت میں تشریف فرما تھے اور اس تقریر کو ملاحظہ فرما کر جا بجا اس میں اصلاحات بھی فرمائی ہیں۔

قرآن کیا چیز ہے؟

قرآن مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے جو زمین و آسمان اور تمام کائنات کے پیدا کرنے والے خدا نے اپنے محبوب پیغمبر خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمائی ہے اور اس وقت سے اس وقت تک بنقل متواتر محفوظ چلی آرہی ہے جس کا ایک لفظ اور شوشہ بھی متغیر نہیں ہوا۔

قرآن کو قرآن کیوں کہتے ہیں؟

قرآن قرأت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پڑھنا، پس قرآن کے معنی ہوئے پڑھنے کے لائق کتاب ممکن ہے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ پڑھنے کے لائق تو اور بھی کتابیں ہیں، اس میں قرآن ہی کی کیا خصوصیت ہے؟ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ قرآن میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن پر غور کرنے کے بعد ہر صاحب انصاف تسلیم کرے گا کہ واقعی سب سے زیادہ پڑھنے کے لائق کتاب قرآن ہی ہے۔

منجملہ قرآن کی بہت سی خصوصیات کے قرآن میں یہ خاص بات ہے کہ اس کا پڑھنا ہر قوم اور ہر شخص کے لئے آسان ہے دنیا میں کوئی کتاب ایسی موجود نہیں ہے جس کو اصلی صورت اور بعینہ الفاظ میں عربی اور عجمی یورپ والے اور ایشیا والے مصری اور سوڈانی اور افریقی اور چینی، روسی اور امریکہ والے بچے اور جوان، بوڑھے اور ادھیڑ عالم و جاہل، مرد و عورت سب پڑھ سکتے ہوں۔ یہ شرف خاص قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کو اس کی اصل زبان اور بعینہ الفاظ میں دنیا کا ہر طبقہ سہولت سے پڑھ سکتا ہے بلکہ پڑھ رہا ہے۔

قرآن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا پڑھنے والا ایک دو دفعہ پڑھ کر اس سے اکتاتا اور گھبراتا نہیں ہے۔ جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں اور ایسے لوگ ہر ملک میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں وہ اس کو سال بھر میں بار بار ختم کرتے اور شروع کرتے ہیں اور ہر دفعہ نیا لطف حاصل کرتے ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدیؒ را سخن پایاں   بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی!

دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی تلاوت قرآن کی طرح پابندی کے ساتھ کی جاتی ہو اور ایک دو دفعہ پڑھنے کے بعد دل نہ گھبراتا ہو اگر قرآن کی تلاوت سے اہل عرب ہی کو حظ آتا تو یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کی مضامین کی دل کشی ان کو بار بار تلاوت پر مجبور کرتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی تلاوت سے نہ عربی کا دل اکتاتا ہے نہ عجمی کا نہ سمجھنے والے عالم کا نہ کسی جاہل کا نہ بچہ کا نہ عورت کا۔ پس کیا اس سے یہ دعویٰ صاف طور پر ثابت نہیں ہو جاتا کہ واقعی اگر کامل درجہ میں پڑھنے کے لائق کوئی کتاب ہے تو وہ قرآن ہے اور صرف قرآن دوسری کتابوں کے تراجم ہر زبان میں کر دیئے جائیں تو ان کے پڑھنے والے تمام ممالک میں مل سکیں گے لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں کہ بدون ترجمہ کے صرف اس کے الفاظ ہی کو تمام ممالک کے لوگ پڑھتے ہیں۔ خواہ سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں یہ خصوصیت صرف قرآن کے لئے ہے۔

تیسری خصوصیت قرآن میں یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر پڑھنے والے بھی بہت ہیں اور بغیر دیکھے پڑھنے والے بہت ہیں کیونکہ قرآن کے الفاظ میں ایسی حلاوت اور دلکشی رکھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس کا حفظ کرنا بہت آسان ہے۔ قرآن جب سے نازل ہوا ہے اس وقت سے اس وقت تک لاکھوں کروڑوں حفاظ قرآن دنیا میں ہو چکے ہیں جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی بچے بھی ہیں، بوڑھے بھی جوان بھی ادھیڑ بھی عربی بھی ہیں، ہندی بھی، سندھی بھی، بنگالی بھی، مصری بھی اور اس وقت بھی باوجود مسلمانوں کی غفلت مذہبی کے ہر ملک میں ہزاروں حفاظ قرآن موجود ہیں جن کے وجود سے رمضان شریف میں تمام مسجدیں منور اور بارونق بن جاتی ہیں اور یہی حفاظ ہیں جن کے دم سے آج تک قرآن اپنی اصلی صورت میں زندہ ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کا اعتراف ہر انصاف پسند طبقہ نے کیا ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم سر ولیم میور نے جہاں قرآن شریف کا ذکر کیا ہے اس بات کو صاف طور سے مانا ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی کتاب نہیں جو بلاتغیر و تبدل تیرہ سو سال سے بچی ہو۔ لیکن مسلمانوں کا قرآن اپنے حروف و الفاظ سے ویسا ہی ہے جیسے اول تھا۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہماری قوم میں ہر زمانہ میں لاکھوں زندہ قرآن

موجود ہے، جن کے حفظ نے ایک زیر زبر کا ہیر پھیر نہ ہونے دیا۔ وہ زندہ قرآن یہی حفاظ ہیں جن کی بدولت ہمارے دین کی یہ مقدس کتاب آج تک بلاکم و کاست ہمارے سینوں میں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ہورڈ نے حال ہی میں اسلامیات پر لیکچر دیتے ہوئے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہم لوگ خواہ کتنا ہی انکار کریں مگر واقعات کو پیش نظر رکھ کر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے وہ اس قوم پر حکومت کر رہا ہے جو ازمنہ مظلمہ میں عیسائیوں کے لئے شمع ہدایت بنی رہی اور جس نے اپنے علوم وفنون سے ہمارے دماغوں کو سیراب و شاداب کیا ہے، میرا خیال ہے اگر اسلامی حکومتیں دنیا سے نابود بھی ہو جائیں تو اسلام اور مسلمان فنا نہیں ہو سکتے، کیونکہ جو چیز ان کو حیات تازہ بخشی ہے وہ ان کی کتاب ''قرآن'' ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایسی محفوظ ہے جیسا کہ آسمان اپنی پیدائش کے وقت سے اس کا حال بائبل کی طرح نہیں ہے جو اپنی تمام مذہبی اور تاریخی خصوصیات گم کر چکی ہے اور نہ اس کی تعلیم بیرونی تعلیم و عقائد سے ملوث ہوئی ہے عیسائیت اور بت پرستی ان دونوں میں فرق نہیں رہا اور اگر کوئی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا کیونکہ بت پرستی کے جراثیم نے اصلی عیسائیت کو چٹ کر لیا ہے۔ قرآن ایک حیات بخش کتاب ہے، اور مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی مسلمان جس طرح قرآن (شریف) کی عزت کرتے اتنی انجیل کے لئے ہمارے دلوں میں عزت نہیں مسلمان اپنے دل و دماغ کو اسلام کے حوالہ کر چکے ہیں اور عیسائی رسماً یا بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اس کو مان رہے ہیں، ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اگر قرآن کی تعلیم کا صحیح ظہور ہوا تو اس سے عیسائی دنیا کو بھی بہت کچھ فوائد پہنچیں گے۔

روحانیت اور قرآن

قرآن کریم کی تعلیم کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے میں ایک نکتہ پر تنبیہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ تمام عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے مرکب ہے روح کا جسم سے الگ ایک چیز ہونا ہر شخص کو اپنے اندر کی تصدیقی آواز سے

معلوم ہوسکتا ہے انسان جب میں یــا مَــنْ کہتا ہے تو اس سے مراد نہ جسم ہے نہ جسم کا کوئی حصہ، بلکہ اور کوئی چیز ہے جو کسی کو نظر نہیں آتی مگر جسم میں اس کی گل کاریاں موجود ہیں جسم کی پرورش اور حیات اسی تعلق پر موقوف ہے جو اس کو روح کے ساتھ ہے اگر یہ تعلق منقطع ہو جائے تو انسان کا بدن اور پتھر برابر ہے جن لوگوں کو روحانی طاقتوں کا انکشاف ہو چکا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ روح ایک پاکیزہ نورانی شئی ہے۔ مادہ سے مرکب نہیں بلکہ مجرد ہے اور جسم کی ترکیب مادی عناصر سے ہے اس لئے جسمانی طاقت کو روحانی طاقت سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس کے بعد مجھے یہ کہہ دینے کی اجازت دیجئے کہ جیسا جسم اور اجسام کے لئے ایک مرکز ہے جو حواس جسمانی سے ہم کو نظر آتا ہے اور روح کے الگ ہو جانے کے بعد بھی بدن اسی مرکز میں رہ جاتا ہے اور اجزاء جسم کے منتشر ہو کر پانی پانی میں مٹی مٹی میں مل جاتی ہے اسی طرح روح کا بھی ایک مرکز ہے جس کی وہ اسی طرح طالب ہے جیسا جسم اپنے مرکز کا طالب ہے قرآن کی اصطلاح میں مرکز روح کو عالم آخرت اور مرکز اجسام کو عالم دنیا کہا جاتا ہے انسان خواہ کتنی ہی کوشش کرے عالم دنیا میں کسی کے لئے بقا نہیں کیونکہ وہ روح کا مرکز نہیں انسان کی بقا اسی عالم میں ہوسکتی ہے۔ جو اس کی روح کا مرکز اور اصلی وطن ہے، موت کا ہر انسان کو یقین ہے اس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں مگر ایسے بہت کم ہیں جن کو یہ فکر ہو کہ ہم کہاں سے آئے تھے؟ اور کہاں آئے تھے؟ اور کہاں جانے والے ہیں؟ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ..... ترجمہ، کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو فضول ہی پیدا کیا اور تم ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے۔

قرآن

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.﴾

ترجمہ: ”یہ دنیا کی زندگی لہو ولعب کے سوا اور کچھ بھی نہیں زندگی تو

عالم آخرت کی زندگی ہے کاش لوگوں کو اتنی بات معلوم ہو جائے''۔

ممکن ہے کوئی یہ شبہ پیش کرے کہ عالم آخرت تو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بغیر دیکھے ہم اس کو کیونکر مان لیں ان لوگوں سے کہہ دیا جائے کہ تم نے اپنے آپ ہی کو کہاں دیکھا ہے؟ تم صرف اپنے بدن کو دیکھ سکتے ہو مگر جسم کا نام انسان نہیں تم جو کچھ ہو خود اپنی آنکھوں سے بھی مستور ہو اور دوسرے انسانوں کی نگاہ سے بھی۔ جب اپنے وجود کا بدوں دیکھے تم کو یقین ہو گیا تو عالم ارواح و عالم آخرت کا بھی بدون دیکھے مخبر صادق کے کہنے سے یقین کر لینا چاہیے تم نے امریکہ کو نہیں دیکھا مگر دیکھنے والوں کی باتیں سن کر یقین کر لیا۔ اسی طرح عالم ارواح و عالم آخرت کو ان لوگوں کے کہنے سے مان لو جو روحانی منازل طے کر چکے ہیں اور یہ حضرت انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت ہے جن میں حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام، اور خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی سے ایک عالم خبردار و واقف ہے جن کا صادق، و امین، مقدس و بزرگ ہونا ان کے سوانح حیات سے بخوبی عیاں ہے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ جو شخص روح اور روحانی طاقت اور عالم ارواح و عالم آخرت سے واقف بننا چاہے ان کو انبیاء علیہم السلام کے دامن تلے آ جانا چاہیے ان کی تعلیم و تربیت سے اس کی باطنی آنکھیں کھلیں گی۔ اور جسم و روح میں امتیاز حاصل ہوگا اور معلوم ہوگا کہ جس بدن کے پیچھے وہ لگا ہوا ہے یہ اس سے چھوٹنے والا ہے اور عالم آخرت و عالم ارواح میں پہنچ کر اس کو دوسرا جسم ملنے والا ہے جس کی طاقت روح کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے ساتھ دینے والی ہوگی۔

خلاصہ تعلیم قرآن

قرآن کی تعلیم کا مختصر خلاصہ یہی ہے کہ وہ ہم کو اس عالم اجسام دنیا کے سوا ایک دوسرے عالم کی خبر دیتا ہے جس کا نام عالم ارواح و عالم آخرت ہے اور بتلاتا ہے کہ اے انسان! جسم کی پرورش اور اس کی زیب و زینت میں کب تک لگا رہے گا اس کی تکلیف و

راحت کا کب تک بندوست کرتا رہے گا دیکھ ذرا اپنی حقیقت میں غور کر، یہ جسم تو اسی جگہ ایک دن رہ جائے گا اور تو اس سے الگ ہو کر دوسری جگہ پہنچے گا جہاں سے آیا تھا شب و روز تو بدن کی فکر میں اس کی پرورش میں لگا رہتا ہے، ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی لمحہ خود اپنی فکر میں تو صرف کرتو اپنی بیوی بچوں دوستوں کی فکر میں گھلا جاتا ہے حالانکہ وہ صرف تیری صورت کے آشنا ہیں تجھے نہ کسی نے دیکھا نہ کسی نے پہچانا۔

ہر کسے از ظن خودِ شد یار من! وزدرونِ من نہ جست اسرار من

ذرا کچھ دیر اپنی فکر بھی کر! اور دیکھ تجھ کو چاہنے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے کیونکہ محبت کا مدار معرفت پر ہے اور خدا کے سوا روح انسان کی معرفت کسی کو نہیں خدا کے بعد اگر روح کی معرفت کسی کو ہے تو انبیاء، وصدیقین وصلحاء و عارفین کو ہے، مگر انسان خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ دوسروں کا گرویدہ ہے۔ جس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے مادی طاقتوں کو روحانی قوتوں پر غالب کر دیا ہے قرآن کریم انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنی روحانی طاقتوں کو مادی طاقتوں پر غالب کرے۔ اس لئے وہ نیک اخلاق اور نیک اعمال کی تاکید کرتا اور برے اخلاق اور برے اعمال سے روکتا ہے کیونکہ نیک اخلاق واعمال سے خدا راضی ہوتا ہے اور اس کی رضا مندی سے روح کو راحت و طاقت پہنچتی ہے، اور برے اخلاق واعمال سے خدا کا غضب ہوتا ہے جس سے روحانی طاقتوں کو ضعف اور مادی طاقتوں کو ترقی ہوتی ہے قرآن کریم انسان کو معرفت الٰہی اور ذات صفات خداوندی کی ایسی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے کہ کوئی کتاب اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی قرآن وتوحید کا علمبردار ہے اور دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ دنیا کو قرآن نے توحید کا سبق ایسے وقت پڑھایا جب تمام لوگ اس کو بھلا چکے تھے اور اس سے بہتر توحید کی تعلیم کسی کتاب میں اس وقت موجود نہیں۔

قرآن تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور تمام انبیا علیہم السلام کی تعظیم و تصدیق کو فرض قرار دیتا ہے اس سے ہر منصف کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اسلام دنیا کے لئے پیام امن ہے وہ تمام مخلوق کو فرقہ بندی اور اختلاف سے ہٹا کر باہم رواداری کا سبق

پڑھاتا ہے۔ مگر چونکہ پہلے انبیاء کی تعلیمات اپنی اصلی صورت میں اس وقت باقی نہیں ہیں بلکہ لوگوں نے تحریف وتبدیل سے ان کو مسخ کر دیا ہے اس لئے نزول قرآن کے بعد ان مسخ شدہ کتابوں پر عمل کے لئے گنجائش نہیں رہی قرآن کریم اپنی حقانیت کے لئے تمام عالم کے سامنے صرف ایک بات پیش کرتا ہے کہ تعصب سے علیحدہ ہو کر انصاف کے ساتھ اس کی تعلیمات میں تدبر و تامل کیا جائے تو خود بخود انسان اس کی حقانیت کا قائل ہو جائے گا۔

﴿قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾

''فرما دیجئے کہ میں تم کو صرف ایک ہی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو مل کر اور کبھی الگ ہو کر پھر سوچو غور کرو! تو تم کو معلوم ہوگا کہ تمہارے صاحب کو جنون نہیں۔ وہ تو تم کو ایک بڑے آنے والے عذاب سے ڈرانا چاہتے ہیں''۔

قرآن کریم بتلاتا ہے کہ راحت عالم آخرت کی راحت ہے جس نے وہاں کی راحت کا سامان نہیں کیا وہ خسارہ میں ہے کیونکہ دنیا کی راحت چند روزہ ہے قرآن کریم کسی قوم کو دوسری قوم پر نسب پر یا مال و دولت یا رنگ و زبان کی وجہ سے فضیلت نہیں دیتا بلکہ تقویٰ و کرم نفس اور روحانی پاکیزگی کو فضیلت بتلاتا اور بقیہ امور میں تمام بنی آدم کو مساوی حقوق دیتا ہے۔

نتیجہ تعلیم قرآن

جب انسان کو تعلیم قرآن میں تامل کرنے سے اپنی حقیقت کا کچھ انکشاف ہوتا ہے اور خالق کائنات سے تعلق اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے تو دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی اور عالم آخرت کا ہمہ تن مشتاق بن جاتا ہے فنائے دنیا کا نقشہ پیش نظر رہتا اور یہ عالم باوجود وسعت کے ایک تنگ و تاریک جیل خانہ نظر آتا ہے۔

﴿اَلدُّنیا سِجنُ المُؤمِنِ وَجَنَّۃُ الکَافِرِ﴾

''دنیا مومن کا جیل خانہ اور کافر کی جنت ہے۔''

خدا کی یاد اور اس کی محبت میں سرشار اور اعمال صالحہ کے لئے ہمہ تن مستعد و تیار رہتا ہے مصائب و حوادث میں کوہ استقلال بنا رہتا ہے اور جامِ موت کو خوش گوار سمجھتا ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم و زپئے جاناں بردم

نذر کردم کہ گرآید، بسرایں غم روزے تا درمیکدہ شادان و غزل خواں بردم

اگر کوئی مسلمان ان صفات سے خالی نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس نے تعلیم قرآن سے پورا سبق حاصل نہیں کیا مگر مجموعی طور پر مسلمان تمام اقوام سے زیادہ دنیا سے بیزار اور آخرت کے لئے تیار ضرور ہیں، دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ غیر مسلم کو روحانیت اور عالم ارواح اور خالق جل و علا کی ذات و صفات کے انوار و تجلیات کی ہوا بھی نہیں لگی، ننگا رہنا، سانس بند کر لینا، نکاح نہ کرنا، بھوکا مرنا، ہوا میں ہاتھ سکھا لینا روحانیت نہیں ۔ اسلام اور قرآن کو فخر ہے کہ وہ نوع انسانی کے تمام شخصی و منزلی و تمدنی و ملکی حقوق کی حفاظت کرتا ہوا روحانیت کی تکمیل کرتا ہے، اسلام میں نہ رھبانیت ہے نہ عریانی نہ جنگل میں رہنے کی ضرورت ہے۔ نہ حبس دم کی، تاجر تجارت میں بادشاہ بادشاہت میں، کاشتکار زراعت میں مشغول رہ کر بھی روحانیت اور منازل معرفت طے کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ قرآن اور پیغبر اسلام کی اطاعت و تابعداری کا حلقہ گلے میں ڈال لے قرآن مجید نے جہاں حضرت بلال حبشی، ابوذرغفاری، شبلی اور جنید، جیسی فقیر ہستیوں کو روحانیت کے آسمان پر پہنچایا اسی طرح حضرت ابوبکر، وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے خلفاء وسلاطین کو روحانی منازل کا ایسا آفتاب و ماہتاب بنا دیا کہ دنیا ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

﴿وَمَنْ یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

''جو شخص اسلام کے سوا دین اختیار کرے گا خدا کے نزدیک ہرگز

مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ میں رہے گا''۔

محمندار سعدی کہ راہ صفا! توان یافت جز بر پے مصطفی
خلاف پیغمبر کے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید
بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ!

قرآن مجید غیر مسلم لوگوں کی نگاہ میں

خوشتر آں باشد کہ سر دلبران! گفتہ آید در حدیث دیگران!

چیمبرز نے ان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''مذہب اسلام کا وہ حصہ بھی جس میں بہت کم تغیر وتبدل ہوا ہے اور جس سے اس کے بانی کی طبیعت نہایت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے اس سے ہماری مراد قرآن کریم کے اخلاق سے ہے، ناانصافی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزاء، طمع، اسراف، عیاشی، بے اعتباری، بدگمانی، نہایت قابل ملامت بیان کی گئی ہیں۔

نیک نیتی، فیاضی، تحمل، صبر، بردباری، حیا، کفایت شعاری، سچائی، راستبازی، ادب، صلح، سچی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا سچی ایمان داری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے۔

راڈویل لکھتا ہے کہ'' قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

منجملہ ان خوبیوں کے جن پر قرآن فخر کرسکتا ہے دو نہایت ہی عیاں ہیں، ایک تو وہ مودبانہ انداز اور عظمت جس کو قرآن اللہ کا ذکر یا اشارہ کرتے ہوئے ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے کہ وہ اس کی طرف خواہشات رذیلہ اور انسانی جذبات کو منسوب نہیں کرتا کہ وہ تمام

نامہذب اور ناشائستہ خیالات، حکایات اور بیانات سے بالکل پاک ہے جو بدقسمتی سے یہود کے صحیفوں میں عام ہیں قرآن تمام ناقابل انکار عیوب سے مبرا ہے۔ اس پر خفیف سے خفیف حرف گیری نہیں ہوسکتی اس کو شروع سے آخر تک پڑھ لیا جائے مگر تہذیب کے رخساروں پر ذرا بھی چھینپ کے آثار نہیں پائے جائیں گے۔''

مشہور جرمن فاضل گوئٹے لکھتا ہے:

''قرآن بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور متحیر کر دیتا ہے اور آخر میں ہم اس کی عزت و احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس طرح یہ کتاب تمام زبانوں میں نہایت قوی اثر کرتی رہے گی۔''

لڈولف کریہل (جس نے ۱۸۸۴ء میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات شائع کئے تھے) لکھتا ہے۔

قرآن میں عقائد، اخلاق، اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے، اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھ دی گئی ہیں، تعلیم عدالت، حربی انتظامات، مالیات، اور نہایت محتاط قانون، غرباء وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے۔

''کسی مذہبی کتاب کے فوائد عامہ کا اندازہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس میں فلسفی خیالات کیسے ہیں (کیونکہ یہ عموماً بہت ہی کمزور ہوا کرتے ہیں) بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اعتقادات دینی کی تعلیم اس کتاب میں دی گئی ہے انہوں نے دنیا میں کیا اثر پیدا کیا؟ اور جس وقت اسلام کو اس نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے ان مذاہب میں جنہوں نے قلوب پر حکومت کی ہے، یہ ایک نہایت عالیشان مذہب ہے۔ البتہ اسلام میں بھی نیکی، انصاف، عبادت وغیرہ کی ویسی ہی تعلیم ہے جیسی کل اور ادیان میں لیکن یہ تعلیم ایسی سادگی اور وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے کہ ہر شخص کی سمجھ میں آتی ہے۔ اسلام قلوب میں اس قسم کا اندازہ اور پرجوش ایمان پیدا کر دیتا ہے کہ پھر اس میں

مطلقاً شک اور تذبذب کی گنجائش نہیں رہتی، اسلام وہ مذہب ہے جس کی اعتقادات کا خاصہ یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کو نرم کریں اور ہم میں نیکی اور انصاف اور دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری پیدا کریں۔ مذہب اسلام کے اعتقادات کو زمانہ مٹا نہیں سکا اور آج بھی ان کا اثر ویسا ہی پرزور ہے جیسا پہلے تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں جب کہ اسلام سے کہیں پرانے مذاہب کی حکومتیں قلوب پر کم ہوتی جاتی ہیں قانون اسلام کی وہی پہلی حکومت اس وقت تک قائم ہے ان آیات قرآنی میں جو اوپر نقل کی گئی ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنے ماقبل کے مذاہب کی اور علی الخصوص مذہب یہود ونصاریٰ کی بے انتہا رواداری کی ہے۔ یہ اس قسم کی رواداری ہے جو اور مذاہب کے بانیوں میں نہایت شاذ ہے۔"

راڈویل اپنے انگریزی ترجمہ قرآن پاک کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا جو تخیل بلحاظ صفات، قدرت، علم، عام ربوبیت اور وحدانیت کے قرآن میں موجود ہے اس بنا پر قرآن بہترین تعریف اور توصیف کا مستحق ہے اس کتاب میں آسمان وزمین کے واحد خدا پر کامل یقین اور بھروسہ کی گہری اور پرجوش تعلیم موجود ہے قرآن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کتاب کی تعلیم میں ایسے عناصر موجود ہیں جن کے ذریعہ سے زبردست اقوام اور فتوحات کرنے والی سلطنتیں بن سکتی ہیں۔ قرآن مجید اس قوت عظیم کا حامل ہے اور اس کی تعلیم میں وہ اصول موجود ہیں جو عملی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ بہ حیثیت ایک مجموعہ قوانین ہونے کے اور بحیثیت اپنی مذہبی نظام تعلیم کے اس کتاب کی فوقیت اور خوبیوں کا اندازہ ان تبدیلیوں سے ہوسکتا ہے جو اس کی کتاب کے ذریعہ سے ان لوگوں کے عادات واطوار اور عقائد میں واقع ہوئیں۔ جنہوں نے اس کتاب کو قبول کیا۔ قرآن بے شک اپنے پیرو کے لئے باعث رحمت اور برکت ہے۔"

حضرات! میں اس مبحث کو پوری طرح بیان کرنا چاہوں تو عرصہ دراز کی ضرورت ہوگی۔ غیر مسلموں کی شہادات کا ہمارے پاس کافی ذخیرہ موجود ہے مگر میں سمجھتا

ہوں کہ عاقل کے لئے یہ چند نمونے کافی ہونگے۔ جواس وقت پیش کئے گئے۔تو کیا اس وقت میں یہ کہہ دینے میں حق بجانب نہ ہوں گا کہ ہمارے نوتعلیم یافتہ مسلمان بھائی جو دوسروں کی تقلید کو ذریعہ ترقی اور دیگر اقوام کی دریوزہ گری کو سبب عروج سمجھتے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے قرآن کو اتنا بھی نہیں سمجھا، جتنا امریکہ اور یورپ کے عیسائی محققین نے سمجھا ہے ہمارے یہ بھائی اپنی گھر کی دولت سے اس قدر غافل ہیں کہ دیگر اقوام ان سے کہیں زیادہ اس سے خبردار ہیں۔اقوام عالم فیصلہ کر چکی ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی و عروج کا راز قرآن کریم کی تعلیم میں مضمر ہے مگر خود مسلمانوں کی بے خبری ملاحظہ ہو کہ دریائے شیریں کے کنارے پر بیٹھے ہوئے پیاسے ہیں،بس اب مجھ کواپنی تقریر ختم کر دینا چاہیے کہ وقت بھی پورا ہوگیا ہے اور جو کچھ بھی میں کہنا چاہتا تھا وہ بھی بقدر ضرورت ادا ہوگیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا مولٰینا محمد و علی الہٖ و اصحابہٖ واھل بیتہٖ اجمعین. وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

پاکستان اور قرآن

پاکستان اور قرآن

از حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ

یہ مضمون حضرت مولانا موصوف نے اسلامک سیموزیم کے لئے لکھ کر بھیجا تھا۔ جو کہ ۸، ۹، ۱۰ ستمبر کو ڈھاکہ میں منعقد ہوئی۔

اس کانفرنس کے انعقاد میں گورنر مشرقی بنگال اور وزراء شریک تھے۔ اس حیثیت سے یہ مضمون نہایت اہم ہے کہ اس میں حکومت اور عوام ہر دو کو اپنے اپنے فرائض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اگر اہلیان پاکستان اس قرآنی پروگرام کو اپنا لیں جو اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سی سورت یعنی سورۃ الکوثر میں بیان فرمائی ہے اور جس کی بہترین تفسیر اور تشریح نہایت واضح اور سہل الفاظ میں حضرت مولانا موصوف نے بیان فرمائی ہے تو آج ہی پاکستان کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

اب چونکہ اسلامی دستور کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اس لئے اس مضمون کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مضمون کو ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں طبع کر کے ہر پاکستانی کے ہاتھ پہنچایا جائے۔ ہم حضرت مولانا کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے عین ضرورت کے وقت پر اس مقالہ کو مرتب فرما کر ادارہ الصدیق کو نشر کے لئے عطا فرمایا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

عن قریب ادارہ نشر و اشاعت اس مضمون کو رسالہ کی شکل میں طبع کرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ (ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ○

تمہید

حضرات! اس وقت ہم جس غرض کے لئے جمع ہوئے ہیں وہ بڑا عظیم الشان مقصد ہے۔ اور اگر آج ہم نے اس مقصد کا راستہ اتفاق کے ساتھ طے کرلیا تو یقین جانئے کہ یہ اس اجتماع کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

چند ذہنی سوالات وشبہات

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت پاکستان جس نازک دور سے گزر رہا ہے وہ سخت پریشان کن ہے جس کی وجہ سے بعض لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے سوالات پیدا ہونے لگے ہیں کہ پاکستان کے وجود سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا۔ پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی اور اقتصادی حالت کیسی تھی؟ پاکستان بننے کے بعد اس میں کچھ ترقی، ہوئی یا تنزل ہوا؟ پاکستان کا مستقبل روشن ہے یا تاریک؟ کیا پاکستان میں کسی جدید انقلاب کے نمودار ہونے کا خطرہ ہے؟ پاکستان کے موجودہ ادبار کا علاج کیا ہے؟ دنیا میں خصوصاً عالم اسلام میں پاکستان کی ساکھ قائم ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ یہ سوالات اور اس قسم کے دوسرے خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہورہے تھے۔ مگر حکومت کی طرف سے خاموشی ہی خاموشی تھی جس سے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ ہمارا برسر اقتدار طبقہ انجام کی طرف سے بالکل غافل ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ پاکستان ترقی کر رہا ہے یا تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے باشندے اپنے مستقبل کی طرف مطمئن ہیں یا پریشان؟ مقام شکر ہے کہ یہ گمان غلط ثابت ہوا۔ حکومت نے اس اجتماع کو دعوت دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کی ترقی اور تنزل اور مستقبل کی طرف سے غافل نہیں، اس کو نزاکت حال کا احساس ہے اور اس کے علاج کا بھی فکر ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ حقیقت حال کو صاف صاف بیان کر کے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں جس کے لئے یہ اجتماع بروئے کار لایا گیا ہے۔

پاکستان سے قبل مسلمانوں کی حالت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وجود پاکستان سے پہلے متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی اور اقتصادی حالت اچھی تھی مگر سیاسی حیثیت سے وہ محض ایک اقلیت تھے۔ اس لئے قوی اندیشہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں کمزور سے کمزور تر ہو جائیں گے۔ اسی لئے حصول پاکستان کی جدوجہد کی گئی تاکہ ان کا دین، مذہب، تمدن، کلچر، زبان محفوظ رہے وجود پاکستان سے ایک نئی اسلامی سلطنت نقشہ عالم پر ظہور پذیر ہو گئی۔ جو بقیہ تمام اسلامی سلطنتوں میں سب سے بڑی ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان بننے کے وقت پاکستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ اتفاق و اتحاد تھا۔ ہر شخص خلوص دل سے پاکستان کی ترقی میں کوشاں تھا۔ ذاتی مفاد کو پاکستان کے مفاد پر قربان کر رہا تھا۔ عصبیت، جنبہ داری، اقربا نوازی، دغا، فریب، رشوت وغیرہ سے احتراز کیا جا رہا تھا۔ شعائر اسلام کا احترام تھا اور پاکستان کو حقیقی معنوں میں اسلامی مثالی حکومت بنانے کا جذبہ ترقی پر تھا۔ جس کے نتیجہ میں ''قرار داد مقاصد'' دنیا کے سامنے آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سال کے عرصہ میں پاکستان نے یہ مقام حاصل کرلیا جو دوسری سلطنت دس سال میں بھی حاصل نہ کر سکتی تھی۔ حالانکہ شروع میں پاکستان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر اتحاد و اتفاق اور خلوص و اخلاص اور شعائر اسلام کے رقم نے مشکلات کے باوجود پاکستان کو دن دونی رات چوگنی ترقی سے ہم کنار کر دیا۔ ہمارا ہمسایہ ملک مرعوب تھا اور فوجی سامان کی قوت و طاقت کا لوہا مان چکا تھا۔

قائد ملت کی کوشش تھی کہ تمام ممالک اسلامی باہم متحد ہو کر یک جان ہو جائیں۔ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو آج دنیا بجائے دو کیمپوں میں تقسیم ہونے کے تین کیمپوں میں تقسیم ہو جاتی۔ مسلمان و امریکہ و روس۔ مگر افسوس! اب ہم بجائے مستقل کیمپ ہونے کے انہی دو کیمپوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

پاکستان کی موجودہ حالت

لوگ کہتے ہیں پاکستان ترقی کر رہا ہے اور ترقی کے نشانات میں کاغذمل، جوٹ مل، شوگرمل، سوئی گیس اور کوٹری بیراج کا نام لیا جاتا ہے مگر مبصرین کی نظر میں یہ ایسی ترقی نہیں جس پر ناز کیا جائے کیونکہ دوسری طرف وہ ہندوستان کو مسئلہ کشمیر میں پہلے سے زیادہ بے باک اور دلیر پاتے ہیں۔ پاکستان کی کیبنٹ میں آئے دن تبدیلی سے دنیا ہمارا انداق اڑا رہی ہے۔ دستور آج تک مکمل نہیں ہوا جس کی وجہ سے مکمل آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ پاکستان میں اس وقت کوئی ایسا لیڈر نہیں جو قوم کا محبوب ہو جس کے ایک اشارہ پر قوم ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جائے۔ حکومت اور رعیت میں وہ ارتباط نہیں جس سے دوسرے مرعوب ہوں۔ عصبیت کا دور دورہ ہے۔ اتحاد و اتفاق ہمدردی واخوت مفقود ہے۔ ہر شخص کو اپنا ذاتی مفاد پیش نظر ہے پاکستان کی بربادی یا آبادی سے کچھ غرض نہیں۔ اقتصادی اعتبار سے بھی اکثریت تنزل ہی میں ہے۔ ایک خاص طبقہ کلیدی اسامیوں پر قابض ہے۔ اقربا نوازی، جنبہ داری، صوبائیت سے کام ہو رہا ہے۔ اہلیت اور قابلیت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جس کے پاس کچھ وسائل ہیں وہ کامیاب ہے اگر چہ نالائق ہو۔ جس کے پاس وسائل نہیں وہ ناکام ہے گو کیسا ہی قابل ہو۔ زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے حصول پاکستان کے لئے کچھ بھی جدوجہد نہیں کی بلکہ بعض تو اس نظریہ ہی کے خلاف تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو پاکستان کا درد نہیں ہوسکتا۔ نہ ان کو اس مقصد سے ہمدردی ہوسکتی ہے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو تین سال کے اندر متعدد انقلابات سے پاکستان کو دوچار ہونا پڑا۔ اگر یہی لیل ونہار ہیں تو مستقبل روشن نہیں بلکہ سخت تاریک ہے اور ہر دم جدید انقلاب کا خطرہ لگا ہوا ہے۔

آسمانی آفتیں

قدرت آسمانی آفتوں سیلاب وغیرہ کے ذریعہ ہم کو بار بار تنبیہ کرتی ہے مگر کوئی

نہیں سمجھتا کہ یہ آفتیں ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ان کو محض اتفاقات پر محمول کرلیا جاتا ہے حالانکہ قرآن میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے ہمارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝﴾

حضرات! میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں کا واحد سبب حیدرآباد و جوناگڑھ اور کشمیر پر اس کا ناجائز قبضہ ہے اور مسلمانان ہندوستان پر ظلم و ستم۔ وہ اس ظلم سے باز آ جائے تو یہ مصیبت خود ہی ٹل جائے گی اور پاکستان میں سیلاب وغیرہ کی تباہ کاری کا واحد سبب وہ وعدہ خلافی ہے جو دستور اسلامی اور قانون شرعی کے اجراء میں تاخیر کی جارہی ہے۔ پاکستان میں آج قانون شرعی کا اجراء کر دیا جائے، شراب خانے، قحبہ خانے، سینما اور فلم سازی، بے حیائی، بے پردگی، رشوت و ظلم وغیرہ وغیرہ بند کر دیئے جائیں اسی وقت یہ آفتیں دور ہو جائیں گی۔ خدا کو ناراض کر کے ہم جتنی بھی ترقی کریں گے وہ دم کے دم میں اس کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہم خدا کی قدرت کو بھلا بیٹھے ہیں۔

سورت کی تفسیر

اس تمہید کے بعد میں اس سورت کی تفسیر کرنا چاہتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھی جس میں بہت اختصار کے ساتھ بڑے بلیغ عنوان سے مسلمانوں کو سہل راستہ بتلایا گیا ہے جس پر چل کر وہ بہت جلد کامیاب ہو جائیں اور ان کے دشمن ناکام و دم بریدہ ہو جائیں۔

یہ بات خیال میں رکھی جائے کہ اس سورت کا نزول منیٰ میں ہوا ہے جہاں حج کے موقعہ پر ہر طرف کے آدمی جمع ہوتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس سورت کے

مضمون کو ایسے اجتماعات میں ضرور بیان کیا جائے جہاں ہر طرف کے نمائندے جمع ہوں تاکہ وہ اطراف عالم کے مسلمانوں میں اس کو پھیلائیں اور اس پر عمل کرنے کے لئے سب کو ابھاریں۔ کسی بات کا پھیلا دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس پر عمل کرنا اور ساری قوم کو مل کر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی وقت ثمرہ مرتب ہوسکتا ہے۔ اس لئے اس اجتماع ہونے والے ارکان کو سب سے پہلے اس سورت کے مضمون پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔ پھر قوم میں پوری طرح اشاعت کر کے اس کو بھی اس پر عمل پیرا کرنا چاہیے۔ ورنہ محض تقریر و گفتار پر کفایت کر کے اجتماع کو ختم کر دینا نشستند و گفتند و برخاستند کا مصداق ہوگا جیسا کہ آج کل ہمارے اکثر اجتماعات کا یہی حشر ہو رہا ہے اسی لئے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

اب سنیے اس سورت میں تین آیتیں ہیں۔ دو آیتوں میں طریق عمل بتلایا گیا ہے تیسری میں ثمرہ اور نتیجہ کا ذکر ہے۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے رسول! ہم نے آپ کو بہت بڑی خیر دی ہے جس سے قرآن کریم مراد ہے۔ دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پھر آپ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھتے رہئے اور قربانی کرتے رہیے۔ تیسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ یقیناً آپ کا دشمن ہی دم بریدہ ہے بے نام ونشان ہے (آپ ان اعمال کے ساتھ ناکام نہیں ہوسکتے)

(تفسیر پہلی آیت) ''قرآن کریم سب سے بڑی خیر'' ہے

پہلی آیت میں قرآن کو ''سب سے بڑی خیر'' کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس کے متعلق اپنے عقیدہ کو پختہ کریں، قرآن ہی کو بڑی خیر سمجھیں اور عقیدہ وہی پختہ ہے جس کا ثبوت عمل سے بھی ہو رہا ہو۔ حکومت پاکستان کو اپنے عمل سے اس کا ثبوت دینا چاہیے کہ اس کے نزدیک قرآن ہی سب سے بڑی خیر ہے انسان جس چیز کو سب سے بڑی خیر سمجھتا ہے اس کا اہتمام واحترام سب سے زیادہ اور سب سے پہلے کرتا ہے۔ اگر ہم واقعی قرآن کو سب سے بڑی خیر سمجھتے ہیں تو ہم کو اس کی تعلیم وتحصیل اور تحقیق اور

تدبیر کا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یرفع اللّٰہ بہ اقواما و یضع بہ اٰخرین کہ قرآن کی وجہ سے حق تعالیٰ بہت سی قوموں کو رفعت و بلندی عطا فرماتے ہیں (جو اس کو سب سے بڑی خیر سمجھ کر اس کے سمجھنے اور اس کے موافق عمل کرنے کا اہتمام کرتی ہیں) اور بعض قوموں کو پستی اور ذلت کی طرف پہنچا دیتے ہیں (جو قرآن کو پس پشت ڈال کر دوسرے علوم کو مقدم کرتے اور ان کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں)

حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے پاس جب کوئی مسجد میں آ کر بیٹھتا وہ اس سے یہ دریافت کیا کرتے تھے کہ تمہارے پاس قرآن کا کتنا حصہ ہے؟ تاکہ ہر شخص سے اس کے درجہ کے موافق برتاؤ کیا جائے۔ ان کے نزدیک فضیلت کا معیار قرآن ہی تھا۔ جس کو جتنا حصہ قرآن سے حاصل ہوتا اسی کے موافق اس کی عزت کی جاتی تھی۔ آج کل معاملہ برعکس ہے۔ فضیلت کا معیار ہی بدل گیا۔ جو اصلی معیار تھا اس کو نہ صرف بھلا دیا گیا بلکہ اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کتاب الٰہی کی پوری عظمت و عزت کی تھی تو خدا نے بھی ان کو وہ عزت و شوکت دی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جب سے ہم مسلمانوں نے قرآن کی عظمت اپنے دلوں میں کم کر دی خدا نے بھی ان کی عزت دنیا والوں کے دلوں سے نکال دی۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝﴾

"یہ کتاب کامل ہے اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جن کے دل میں اللہ کا خوف ہے ان کے لئے ہدایت ہے۔"

قرآن مضبوط محبت ہے، ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے یہ ہم کو انسان کی ابتداء و انتہا کی خبر دیتا ہے۔ یہ بتلاتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اس کی ڈیوٹی کیا ہے؟ کہاں جانے والا ہے؟ نیک انجام اور بدانجام سے خبردار کرنے والا ہے،

قوموں کے تنزل و ترقی کے اسباب کو روشن دلائل سے بیان کرتا ہے۔ چھپے ہوئے بھیدوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اس نے نجات پائی، نفع حاصل کیا، دنیا میں بھی چین پایا، مرنے کے بعد بھی راحت سے ہمکنار ہوا جو اس سے ہٹ گیا پشیمان ہوا، خدا سے الگ ہو گیا، اور اپنے کو بھی بھول گیا۔ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ○ جو اس پر عمل کرتا ہے خدا اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جس کے ساتھ خدا ہو اس کی کامیابی میں کیا شبہ ہے؟ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ھُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ○

قرآن مجید کے ساتھ روحانیت زندہ ہے

بزرگو! جب تک قرآن دنیا میں موجود ہے روحانیت باقی رہے گی۔ اگر یہ اٹھا لیا گیا جیسا حدیث میں آتا ہے ایک دن قرآن دنیا سے اٹھا لیا جائے گا اس وقت دنیا مادیت سے بھر جائے گی اور مخلوق گمراہی میں بھٹکتی اور راہ حق سے بہکتی رہے گی۔ آج کل سب مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اس وقت وہ روحانیت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی بلکہ مادیت کا غلبہ ہے مگر کسی کو اصل حقیقت کا پتہ نہیں کہ روحانیت کا سرچشمہ کہاں ہے؟ ایک زمانہ میں قرآن کے سمجھنے والے بھی زیادہ تھے پڑھنے والے اور عمل کرنے والے بھی بہت تھے اس وقت کا تو پوچھنا ہی کیا؟ اس کے بعد دوسرا زمانہ آیا جس میں سمجھنے والے عمل کرنے والے کم اور پڑھنے والے زیادہ تھے۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی حالت آج سے بہتر تھی۔ اب یہ تیسرا زمانہ ہے کہ قرآن کے سمجھنے والے بھی کم عمل کرنے والے بھی کم اور پڑھنے والے بھی کم ہیں۔ بلکہ بعضے تو اس کے پڑھنے پڑھانے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں تو کیا ہم اپنی اس بے توجہی اور بے پروائی سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کی ضرورت نہیں رہی اور اس کو اٹھا لیا جائے؟ مگر یاد رکھو اگر خدا نے قرآن کو دنیا سے اٹھا لیا تو مسلمانوں کی کچھ بھی ہستی اور قیمت باقی نہ رہے گی۔ مجھے امید نہیں ہے کہ کوئی مسلمان بھی اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ قرآن دنیا سے اٹھا لیا جائے۔

قرآن کریم کی طرف سب کو توجہ کرنی چاہیے

پھر سب کو مل کر اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے جس کا طریقہ خود قرآن ہی نے بتلا دیا ہے۔

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''جیسا ہم نے تمہارے اندر تم ہی سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی باتیں سکھلاتا ہے اور تم کو وہ باتیں بتلاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس میں قرآن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند فرائض بتلائے گئے ہیں اول تلاوت آیات۔ (۲) تزکیہ ظاہر و باطن (۳) کتاب اللہ کی تعلیم (۴) حکمت کی تعلیم (۵) ایسی باتیں بتلانا جو بغیر آپؐ کے بتلائے کوئی بھی قرآن سے نہ سمجھ سکتا تھا۔ اگر ہم قرآن پر توجہ کرنا چاہتے ہیں تو ان پانچوں اجزاء کو جمع کرنا چاہیے۔ تلاوت قرآن کا اہتمام کرنا چاہیے۔ سرکاری اسکولوں میں قرآن کی صحیح تلاوت کا انتظام کیا جائے اس کو بے کار نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے آیات قرآن کی تلاوت ہی کا فرض ادا کیا ہے اور تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ صرف قرآن کی تلاوت سے بھی دل کو راحت اور سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ ذکر اللہ کی اعلیٰ فرد ہے اور ذکر اللہ سے قلوب کو اطمینان حاصل ہونا قرآن کا دعویٰ ہے اور خدا کی بات اٹل ہے جس کا خلاف ناممکن ہے۔ اَلاَ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب. یہ تو سمجھدار آدمی کی تلاوت کا فائدہ ہے اور بچوں کو ابتداء میں قرآن پڑھانے سے ان کا ذہن تیز اور صاف ہوتا ہے بچپن ہی سے ان کو کتاب اللہ کے ساتھ تعلق ہوگا تو ان کے دل میں جذبہ دینی جڑ پکڑ لے گا۔ اس کے بعد تعلیم قرآن کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے معانی و مطالب سے

اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو باخبر کیا جائے جس کے لئے ماہران تعلیم قرآن کی خدمات حاصل کی جائیں۔ سرکاری ملازموں اور حکمران طبقہ کے لئے بھی انتظام کیا جائے کہ وہ بھی معانی ومطالب قرآن سے واقف ہوں اور یہ واقفیت صرف ترجموں اور تفسیروں کے مطالعہ سے حاصل نہ ہوگی باقاعدہ پڑھنے سے ہوگی۔ حدیث میں ہے۔

﴿انما العلم بالتعلم﴾

''علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے''

تجربہ شاہد ہے کہ ازخود ترجمے دیکھنے سے نہ کوئی جج بن سکتا ہے نہ ڈاکٹر نہ طبیب اور نہ بیرسٹر ہر علم باقاعدہ سیکھنے ہی سے آتا ہے۔ بغیر استاد کے تو قرآن کا صحیح پڑھنا بھی نہیں آتا سمجھنا تو بہت دور ہے اور اس سے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ کے تعارض شبہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ کسی چیز کے آسان ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے لئے ارادہ اور ہمت اور طلب اسباب کی بھی ضرورت نہ ہو۔ قرآن کریم قوم عرب کی زبان میں ہے مگر ان کو بھی تعلیم رسول کی احتیاج تھی۔ اسی لئے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا کے بعد وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ فرمایا گیا ہے۔ اور بھلا جس کو قرآن کی حقیقت ہی معلوم نہیں نہ اس کے نازل ہونے کو جانتا ہے نہ نازل کرنے والے کو پہچانتا ہے نہ اس کو جس پر قرآن نازل ہوا وہ قرآن کو کیا سمجھے گا؟

قرآن ایک بحر محیط ہے جس کے کناروں پر عنبر واگر ہر قسم کی خوشبوئیں ہیں اس کے درمیانی جزیروں میں قسم قسم کے جواہرات ہیں قرآن کا ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ ایک حد ہے ایک مطلع۔ ان ہی چار بنیادوں پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے۔ ظاہر تو یہی عبارت ہے جو نازل کی گئی۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۔ باطن وہ ہے جس کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ جیسا حدیث میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا کی تھی۔

﴿اللهم فقهه فى الدين و علمه تاويل الكتاب﴾

''اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ دے اور کتاب اللہ کی تفسیر کا علم۔''

یہ دعا قبول ہوئی اور عبداللہ بن عباسؓ حبر الامتہ اور ترجمان القرآن کے لقب سے ممتاز ہوئے۔

حد وہ مقام ہے جہاں سمند عقل کی باگ روک دینا اور ٹھہر جانا ضروری ہے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

یہی وہ موقعہ ہے جو تشبیہ اور تعطیل کو الگ الگ کر دیتا ہے کہ انسان نہ تو خدا کو مخلوق کے مشابہ سمجھے نہ صفات سے خالی اور معطل۔

مطلع، وہ دروازہ ہے جس سے کشف والہام غیبی اور روحانی روشنی حاصل ہوتی ہے جو سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی اور آپؐ کے بعد اس عالم مومن کو اس سے حصہ ملتا ہے جو تقویٰ کے ساتھ کمال اتباع سنت سے رنگا ہوا ہو۔

قرآن کی حقیقت کو وہی جان سکتا ہے جس کو الہام اور مشاہدہ سے حصہ ملا ہو جس کا دم تمام روگوں سے صحیح سالم اور سچا تابع دار ہو کر اللہ کے آگے جھک گیا ہو۔ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ۝﴾

”بے شک قرآن میں اس شخص کے لئے نصیحت ہے جس کے پاس (اچھا) دل ہو یا توجہ کے ساتھ (اہل دل کی باتوں کی طرف) کان جھکا دے۔“

قرآن سمجھنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ قرآن کی عبارت کو سمجھے۔ زبان عربی کے قواعد نحو و بلاغت وغیرہ سے واقف ہو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ علم تفسیر میں مہارت حاصل کرے۔ تفسیر کی بنیاد عبارت قرآن ہی ہے اس لئے صحیح تفسیر عبارت کی موافقت سے باہر نہیں ہو سکتی ورنہ قرآن کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے گا اور ہر شخص جو چاہے گا مطلب بنا لے گا۔ جیسا آج کل بعض مدعیان فہم قرآن کی تفسیروں کا حال ہے کہ وہ عبارت قرآن ہی کو

نہیں سمجھتے اور ایسی تفسیر کرتے ہیں جو عبارات قرآن سے اصلاً موافقت نہیں کرتی۔ تیسرا درجہ درمیانی ہے یعنی اس حد کو معلوم کرنا جو قرآن کی ظاہری عبارت اور باطنی تفسیر کو جامع اور تشبیہ و تعطیل وغیرہ سے مانع ہے۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ قرآن کا نور تقویٰ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ نور سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ تو سب سے پہلے اس تفسیر کو معلوم کرنا ضروری ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں منقول ہے۔ اسی راستہ سے یہ نور حاصل ہوتا ہے جو متقی علماء کے سوا کسی کے پاس نہیں پایا جاتا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ.

تفسیر رسولؐ کے خلاف قرآن کی نئی تفسیر مقبول نہیں

قرآن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''کتاب اللہ'' کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتے ہیں اس سے مراد وہی علوم ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سے سمجھے ہیں جن کو دوسرے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وَيُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوا تَعْلَمُوْنَ ٥ اب جو لوگ تفسیر رسول کے خلاف قرآن کی نئی تفسیر کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو رسول کے برابر یا ان سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں ان کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے۔ تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ ہمیں خود کو اور اپنے طلبہ کو تقویٰ اور پاکیزہ اخلاق کا عادی بنانا چاہیے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو متقی اور پاکیزہ اخلاق، نیک کردار، خوش اطوار بنا دیا تھا، اگر قرآن کو سمجھ کر پڑھا اور پڑھایا جائے تو اس سے خوف خدا ضرور پیدا ہوگا جس کا لازمی نتیجہ تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق ہے۔

(تفسیر دوسری آیت) نماز

دوسری آیت میں اول نماز کا حکم ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ اہل علم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حرف فا ترتب کے لئے آتا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگلا مضمون پہلے مضمون پر مرتب ہے۔ اس میں بتلایا گیا ہے کہ جب ہم نے تم کو اتنی بڑی خیر دی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے رب کے لئے نماز پڑھو۔ یہ قرآن کا بھی تقاضا ہے۔ چنانچہ

قرآن میں سینکڑوں جگہ نماز کی تاکید آئی ہے اور امت کا بھی اتفاق ہے کہ طاعات بدنیہ میں سب سے افضل اور سب سے مقدم نماز ہے۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے لا الہ الا اللہ کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تنہا وہی عبادت کے لائق ہے۔ تو ہر مسلمان کو عمل سے اس کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کی پابندی کی جائے۔ نماز ہی سے اسلام ظاہر ہوتا ہے۔ حدیث میں صاف اعلان ہے کہ ہمارے اور مشرکین و کافرین کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والی چیز نماز ہی ہے جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا اس کا ظاہر کافروں سے ممتاز نہیں۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے۔

﴿لاخیر فی دین لاصلوۃ فیہ﴾

''جس کے دین کے ساتھ نماز نہ ہو اس میں کچھ خیر نہیں۔''

نماز سے دل کو راحت، اطمینان اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بے حیائی اور برے کاموں سے روک دیتی ہے۔ بشرطیکہ اللہ کے واسطے نماز ہو۔ یعنی اس طرح ادا کی جائے کہ جس کو دیکھ کر ہر شخص محسوس کرے کہ یہ اللہ کے لئے نماز پڑھ رہا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے نماز کی طرف سے توجہ ہٹا لی ہے۔ بہت سے تو نماز پڑھتے ہی نہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی اس طرح نہیں پڑھتے جیسی اللہ کے لئے نماز پڑھنی چاہیے۔ نہ خشوع ہے نہ خضوع، نہ دل کو نماز کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ نماز میں علاوہ انفرادی مصالح کے اجتماعی مصالح بھی بہت ہیں۔ جو نماز باجماعت سے حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اسلام نمازوں میں خود امام بنتے تھے۔ اسی طرح ہر حاکم پانچ وقت مسلمانوں کو خود نماز پڑھاتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سب مسلمان نماز کے پابند تھے۔ کیونکہ حکومت جس کام کی پابند ہوتی ہے رعایا کو بھی اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر اس صورت میں ہر حاکم اور خلیفہ پبلک کا آدمی ہو جاتا ہے پبلک سے جدا نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح حاکم و محکوم میں ارتباط اور تعلق یگانگت پیدا ہوتا ہے اور رعایا کے قلوب میں حکام سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

حکومت پاکستان کو عوام سے شکایت اور اس کے ازالہ کی صورت

آج کل حکومت پاکستان کو یہ شکایت ہے کہ عوام حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ اگر وہ عوام کا تعاون دل سے چاہتی ہے تو اوپر سے نیچے تک تمام حکام نماز باجماعت کی پابندی شروع کردیں اور نماز پڑھانے کا طریقہ سیکھ کر خود نماز پڑھائیں۔ انشا اللہ چند روز میں معلوم ہو جائے گا کہ عوام حکومت کے ساتھ کس درجہ تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں۔ تعلیمات قرآن کی خوبی ہی یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے سے ہر مسلمان کی انفرادی حالت بھی درست ہوتی ہے اور اجتماعی حالت بھی ترقی پذیر ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے اس لئے اس میں روزہ اور زکوۃ و حج کا ذکر نہیں کیا گیا کہ یہ اعمال بعد کو مدینہ میں نازل ہوئے ہیں اس لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سورت میں اعمال بدنیہ میں سے صرف نماز کو اس لئے بیان کیا گیا کہ وہ بہت مہتمم بالشان ہے جو اس کی پوری پابندی کرتا ہے وہ دوسرے اعمال کو بھی شوق سے کرنے لگتا ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عمال کو ایک خط لکھا تھا:۔

﴿ان اهم امورکم عندی الصلوۃ فمن حافظ علیها کان لما سواها احفظ ومن ضیعها کان لما سواها اضیع﴾

''مجھے تمہارے تمام کاموں میں سب سے زیادہ فکر نماز کا ہے کیونکہ جو اس کی پوری پابندی کرتا ہے وہ دوسرے کاموں کی بھی خوب نگہداشت کرتا ہے اور جو اس کو برباد کرتا ہے وہ دوسرے کاموں کو زیادہ برباد کرتا ہے۔''

اگر نماز قاعدہ سے ادا کی جائے تو اس کی یہی خاصیت ہے کہ اس سے سب کاموں کی نگہداشت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تفسیر تیسری آیت (زکوۃ وقربانی)

اس کے بعد قربانی کا حکم ہے کہ اللہ کے لئے قربانی کرو۔ اس میں طاعات مالیہ

کی تاکید ہے کہ طاعات بدنیہ کے ساتھ طاعات مالیہ کا بھی اہتمام کیا جائے۔ چونکہ مکہ میں قربانی ہی واجب تھی۔ اس لئے اس کا ذکر کر دیا گیا۔ مدینہ پہنچ کر زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض ہوگئی۔ اس میں اختلاف ہے کہ زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد قربانی بھی لازمی رہی یا اس کا وجوب ساقط ہوگیا۔ حنفیہ کے نزدیک قربانی بھی واجب ہے زکوٰۃ کے فرض ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ قرآن میں نماز کے ساتھ ہی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم جا بجا آیا ہے۔ مانعین زکوٰۃ سے حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کا جہاد کرنا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔

علماء سلف نے فرمایا ہے کہ لوگوں میں غنی زیادہ ہوتے ہیں اور فقیر کم۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کی زکوٰۃ میں صرف چالیسواں حصہ فرض کیا ہے وہ بھی جب کہ مال بقدر نصاب ہو کہ چاندی پانچ اوقیہ ہو (یعنی دو سو درہم جس کی مقدار ساڑھے باون تولہ ہوتی ہے) اور سونا بیس مثقال (ساڑھے سات تولہ) ہو اور اس پر ایک سال پورا گزر جائے۔ اور باغات و زمین کی پیداوار میں (دسواں یا بیسواں حصہ فرض کیا ہے اور ظاہر ہے کہ خدائے علیم وقدیر رحمٰن ورحیم اپنے غریب بندوں کے لئے ایسی مقدار فرض نہیں کرسکتا جو ان کے لئے کافی نہ ہو۔ حالانکہ وہ ان کا شمار بھی جانتا ہے اور حالت سے بھی باخبر ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فقیر کم ہوں گے اور جتنے بھی ہوں گے ان کو مال داروں کی دولت کا چالیسواں حصہ اور باغات و زمین کی پیداوار کا دسواں بیسواں حصہ کافی ہو جائے گا تو یہی مقدار فرض کر دی گئی۔ اب اگر مال دار اور زمیندار مسلمان سب کے سب زکوٰۃ وعشر باقاعدہ نکالتے رہیں تو کبھی کسی مسکین کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آج کل تو مسلمانوں میں غریب زیادہ ہیں امیر کم ہیں۔ اس صورت میں مال داروں کی زکوٰۃ وعشر سب غریبوں کے لئے کیوں کر کافی ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ آج کل مال داروں میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بھی تو ہیں۔ اگر سب کے سب

با قاعدہ زکوٰۃ وعشر نکالیں اور دیانت وامانت کے ساتھ اس کو فقراء میں تقسیم کیا جائے یقیناً تمام فقراء کو کافی ہو جائے گی۔ اس وقت مسلمانوں میں افلاس زیادہ ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اغنیاء پابندی کے ساتھ پوری زکوٰۃ وعشر نہیں نکالتے اور یہ مرض صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں میں افلاس بڑھ رہا ہے۔ اور چوری ڈکیتی ترقی کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں کی ایک جماعت نے بھیک مانگنے کو ہنر سمجھ لیا ہے۔ اس کو عیب نہیں سمجھتے بلکہ مستقل پیشہ بنالیا ہے۔ ان سے لاکھ کہا جائے کہ ہٹے کٹے تندرست آدمی کو بھیک مانگنا جائز نہیں۔ تم کو مزدوری کرنی چاہیے یا کوئی دست کاری سیکھ کر پیٹ پالنا چاہیے مگران کی عقلیں مسخ ہوگئی ہیں کہ بھیک مانگنے ہی کو اچھا سمجھتے ہیں۔ مسلمان مال داروں کی زکوٰۃ وخیرات کا زیادہ حصہ انہی کے قبضہ میں جاتا ہے۔ یہ لوگ ہزارہا روپے جمع کرنے کے بعد بھی بھیک ہی مانگتے رہتے ہیں جب وہ مرتے ہیں ان کی جھونپڑیوں میں بڑی دولت نکلتی ہے۔ ان کو غریب فقیر سمجھنا غلط ہے ان کو زکوٰۃ و خیرات دینا رقم برباد کرنا ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہیے۔ پھر ہر بستی کے فقراء کی تحقیق کرنی چاہیے۔ تحقیق کے بعد زکوٰۃ دی جائے۔ اور فقراء کو زکوٰۃ دے کر ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ زکوٰۃ کے بھروسہ ہی پر نہ رہو بلکہ جو کچھ اس وقت دیا جا رہا ہے اس سے کوئی کاروبار شروع کرو تاکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ پہلے زمانہ کے فقیر ایسے ہی تھے وہ بار بار زکوٰۃ نہیں لیتے تھے بلکہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ البتہ یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بوڑھے اور اپاہج زکوٰۃ کے بھروسہ پر رہتے تھے۔ مگر یتیم بچے تعلیم وتربیت پاکر بالغ ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے اور بیوہ عورتیں نکاح ثانی کو عیب نہ جانتی تھیں وہ بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کر کے زکوٰۃ سے مستغنی ہو جاتی تھیں۔ اگر اب بھی اس کا رواج پوری طرح ہو جائے تو بیوہ عورتیں بہت کم رہ جائیں۔ زکوٰۃ کے بھروسہ پر صرف اپاہج اور معذور رہ جائیں گے تو ان کی تعداد زیادہ نہیں ان کو مال داروں، زمین داروں کی زکوٰۃ وعشر یقیناً کافی ہو جائے گی۔

حکومت پاکستان کو نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی باقاعدہ انتظام کرنا چاہیے۔ مگر

جب تک دستورِ اسلامی اور قانونِ شرعی نافذ نہ کیا جائے اور حکومت کے افسر نماز کے پابند نہ ہو جائیں اس وقت تک نہ حکومت کو مسلمانوں سے زکوٰۃ لینے کا حق ہے نہ مسلمان ہی اپنی زکوٰۃ حکومت کے حوالہ کریں گے۔

پہلے سوال کا جواب اور خلاصہ

یہاں تک پہلے سوال کا جواب تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت پاکستان قرآن کی عظمت کا حق ادا کرے، تلاوتِ قرآن، تعلیمِ قرآن، درسِ قرآن کا اہتمام کرے، نماز کی تاکید کرے، ملک میں دستورِ اسلامی اور قانونِ شرعی نافذ کر کے زکوٰۃ و صدقات کا باقاعدہ انتظام کرے۔ شعائرِ اسلام کی پوری تعظیم کرے تو اس کے دشمن ناکام ہو جائیں گے، دنیا میں اس کی عزت و شوکت کا پرچم لہرائے گا، آسمانی بلائیں بھی ٹل جائیں گی، خدا کی مدد اس کے ساتھ ہوگی، رعایا اور حکومت میں محبت و الفت پیدا ہو جائے گی۔ مخالف طاقتیں مرعوب ہو جائیں گی۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ o

دوسرے سوال کا جواب اور اسلام و کمیونزم

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام اور کمیونزم میں کچھ مناسبت نہیں۔ اسلام کو کمیونزم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اعتقادی طور پر کمیونزم کی بنیاد خدا دشمنی اور مذہب دشمنی پر ہے اور اسلام سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور توحید کا سبق دیتا ہے۔ پابندی مذہب کا ہر حال میں حکم دیتا ہے۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سیاست بھی اسی طرح مذہب کا جز ہے جس طرح عبادات و معاملات اور اخلاق و معاشرت اس کے اجزاء ہیں بشرطیکہ اسلامی سیاست ہو کافرانہ سیاست نہ ہو۔ عملی طور پر کمیونزم ذاتی ملکیت کا دشمن ہے اور اسلام ذاتی ملکیت کا دشمن نہیں۔ اسلام مال داروں، زمین داروں کو ان کے اموال و جائیداد کا مالک قرار دیتا ہے

اور ان میں فقراء کا حق بھی لازم کرتا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾

''اے ایمان والو! جو کچھ تم کماؤ اور جو کچھ ہم زمین کی پیداوار میں سے تم کو دیں اس کا پاکیزہ عمدہ حصہ (اللہ کے راستہ میں) خرچ کیا کرو۔''

حکم انفاق کا مطلب ہی یہ ہے کہ مال دار اپنے اموال کے اور زمیں دار اپنی زمینوں کے مالک مان لئے گئے۔ پھر ان کو اس میں سے فقراء پر کچھ خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ میت کے ترکہ میں میراث و وصیت کا جاری ہونا۔ مالکان زمین کو اپنی جائیداد کے وقف یا ہبہ کرنے کا اختیار ہونا ذاتی ملکیت کی کھلی دلیل ہے۔ زکوٰۃ میں ۴/۱ اور مملوکہ زمین کی پیداوار میں ۱۰/۱ یا ۲۰/۱ فقراء کے لئے تجویز کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ باقی سب مال والے اور زمین والے کا ہے۔ البتہ سمندر، دریا، پہاڑ اور جنگلات، دور افتادہ زمینیں اور معادن حکومت کے تحت ہوں گے۔ ان پر بغیر حکومت کی اجازت کے کسی کو قبضہ کرنے کا حق نہیں۔

اسلام معاشی مساوات کا قائل نہیں۔ قرآن میں صاف صاف کہا گیا ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط﴾

''ہم نے ہی لوگوں کے درمیان معاشی تقسیم کی ہے اور بعض کو بعض پر رفعت دی ہے تا کہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔ (اور اس طرح نظام عالم قائم رہے)۔''

اگر معاشی تقسیم برابر کر دی جاتی کہ سارے دولتمند ہی ہوتے تو کوئی بھی کسی کا کام نہ کرتا۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک کے پاس دولت ہے طاقت وقوت نہیں۔ ایک کے

پاس طاقت ہے دولت نہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے اسی طرح نظام قائم ہے۔

مگر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام ذاتی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ دولتمند طبقہ ساری دولت کو اپنے ہی اوپر خرچ کرتا رہے۔ بلکہ وہ اس کی دولت میں، زمین کی پیداوار میں فقراء کا حق بھی قائم کرتا ہے تاکہ معیشت میں توازن قائم رہے۔ اسلام دولتمندوں کو اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ سودی کاروبار سے دولت کو بڑھائیں۔

○ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ط وَاللّٰهُ لَایُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ O ○

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں کرتا''۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اسلامی بیت المال میں زکوٰۃ وعشر کی آمدنی جمع ہوتی رہی اور باقاعدہ فقراء پر تقسیم ہوتی رہی تو ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ زکوٰۃ و صدقات لینے والا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ کمیونزم آج تک ایسی مثال قائم نہیں کر سکا، اور اس کا دعویٰ معاشی مساوات محض ڈھونگ ہے۔

آخر میں ایک بات پر تنبیہ

اخیر میں ایک بات پر اور تنبیہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں دولت بڑھانے کا طریقہ زراعت، تجارت وصنعت وحرفت ہے۔ سرکاری ملازمت نہیں۔ ملازمان سرکاری کو ضرورت سے زیادہ تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ خلیفہ اسلام کی تنخواہ اتنی ہی ہوتی تھی کہ متوسط درجہ کے آدمی کی طرح گزر کر سکے۔ حکام کو تاکید تھی کہ ویسا ہی کھانا کھائیں جیسا عام مسلمان کھاتے ہیں اور ویسا ہی لباس پہنیں جیسا عام مسلمان پہنتے ہیں۔ جو شخص سرکاری ملازمت اپنی دولت بڑھانے کے لئے اختیار کرتا ہے وہ اسلام کو بدنام کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام نے تاجروں کو بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ اپنے مال کی قیمت اتنی بڑھا

دیں جس سے خریدار غبن فاحش (سخت نقصان) کا شکار ہو جائیں۔ جو تاجر ایسا کریگا، اسلامی حکومت اس کو تجارت کی اجازت نہیں دے گی۔ ان اصول پر کام کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ چندروز میں اقتصادی حالت درست ہو جائے گی۔

حکومت پاکستان کو اسلامی اصول کے موافق ملک میں مذہبی تعلیم عام کرنا، بے کاری اور بے روزگاری کو دور کرنا چاہیے۔ شراب خواری، زنا کاری، جوا بازار، ریس، سود خواری، سینما، فلم سازی کو بند کر دینا چاہیے کہ اس سے رعایا کی دولت بھی برباد ہوتی ہے۔ عادات واخلاق بھی بگڑتے ہیں، خدا کی پھٹکار بھی برستی ہے۔

اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اور سب مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اعجاز القرآن

اعجاز القرآن

بقلم العلامة مولانا ظفر احمد العثمانی

الرحمٰن علم القراٰن خلق الانسان علمه البیان فالحمد للّٰه الذی نصر عبده و انجز وعده وهزم الاحزاب وحده والصلوة والسلام علےٰ من لانبی بعده.

اما بعد فاعلموا ان المعجزة امر خارق للعادة مقرون بالتحدی سالم عن المعارضة وهی اما حسیة کاکثر معجزات الانبیاء من بنی اسرائیل او عقلیة کاکثر معجزات سیدنا محمد صلی اللّٰه علیه وسلم و من اکبرها القرآن الذی لایأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید. قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم. مامن الانبیاء نبی الا اعطی مامثله اٰمن علیه البشر و انما کان الذی اوتیته وحیا اوُحَاهُ اللّٰه الی فارجوان اکون اکثرهم تابعا یوم القیمة اخرجه البخاری عن ابی هریرة ای الأیة التی تحدیت بها القوم هی الوحی الذی انزل علی وهو القرآن لما اشتمل علیه من الاعجاز الواضح ولیس المراد حصر معجزاته فیه ولا انه لم یؤت من المعجزات ما اوتی من تقدمه بل المراد انه المعجزة العظمیٰ التی اختص بهادون غیره لان کل نبی اعطی معجزة خاصة به لم یعطها غیره تحدی بها قومه و کانت معجزة کل نبی تقع مناسبة

لحال قومه كما انهٗ كان السحر فاشيا عند فرعون وقومه فجائهم موسیٰ عليه السلام بالعصیٰ علی صورة مايصنع السحرة لكنها تلقفت ماصنعوا (والسحر لا يأكل السحر فَاُلقی السحرة سجدًا) ولم يقع ذلک بعينه لغيره و كذلک احياء عيسیٰ عليه السلام الموتیٰ وابراءه الا كمه و والا برص لكون الاطباء والحكماء فی ذلک الزمان فی غاية من الظهور فأتاهم من جنس عملهم بمالم تصل قدرتهم اليه وهكذا لما كان العرب الذين بعث فيهم النبی صلی الله عليه وسلم فی الغاية من البلاغة..... جاء هم بالقرآن الذی تحدا هم ان يأتوا بحديث مثله ان كانوا صادقين ثم قرعهم بقوله "ام يقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثله مفتريات وادعوا من استطعتم من دون اللّٰه ان كنتم صادقين". حين قالوا "لونشاء لقلنا مثل هٰذا اِن هٰذا الا اساطير الاولين". ای و نحن قوم اميون لا علم لنا باخبارا لا وائل ولو كان لنا بذلک من علم لقلنا مثل هٰذا فقال تعالیٰ فليأتوا بعشر سور مثله مفتريات من غير تقييد بكونه مطابقاللواقع ولاشک ان اتيان المفتریٰ من اسهل مايتكلم به الانسان و ينطق به فان لم بستجيبو لكم فاعلموا انما انزل بعلم اللّٰه وان لا الٰه الا هو فهل انتم مسلمون. ثم تحدا هم بقوله "فأتوا بسورة من مثله و ادعوا شهدآء كم من دون اللّٰه ان كنتم صادقين فان لم تفعلوا ولن تفعا وافاتقوا النار

التی وقودها الناس و الحجارة اعدت للکافرین'' و فی ذلک رد صریح علی من زعم ان التحدی لم یقع ببلاغة القرآن وفصاحته وانما وقع بعلومه و معارفه التی قد اودعت فیه وجه الردان اللّٰہ تعالیٰ قد اطلق لهم ان یأتوا بمثله مفتریً. والمشتمل علی العلوم و المعارف الصحیحة لایکون مفتریً و اذا جازلهم المعارضة بالمفتری فلا یکون هو مثله الا فی بلاغته وفصاحته وسلاسته وجریانه و بدیع اسلوبه فهذا هوا الذی وقع به التحدی، و کیف یجوزان یطالب الا امیّون یأتوا بالعلوم والمعارف التی لم یعرفوهاقط، ولم یحوموا حولها وانما یتحدی القوم بما لهم معرفة به وهم یدعون فیه الکمال و هذا تاریخ العرب قبل الالسلام بین ایدیکم لم یدعوا العلم و المعرفة ساعة من الدهر وانما کانوا یفتخرون ببلاغة لسانهم و فصاحته وبراعته فتحداهم القرآن ان یأتوا بمثله فی ذلک فافهم. ثم دلائل اعجاز القرآن علی وجوه منها ماتعرفه العرب و العجم لکونه هدی للناس وهدی للعالمین ومنها ماتعرفه العرب خاصة لکونه قرآنًا عربیا بلسان عربی مبین ومنها ماتعرفه المهرة من البلغاء ولیس لعامة العرب فیه نصیب ولذا قال و ادعوا شهداء کم من دون اللّٰہ ای اعوانکم و انصارکم من مهرة البلغاء وکملة الشعراء فان الدرجة العلیا فی البلاغة لا یعرفها الا البلیغ. فاذاوقف مثله علی مافیه من البلاغة ظل

خاضعاً بين يديها. و اعترف بانها ماليس مقدوراً للبشر ونحن لما جئنا بعد العرب الاول ماكنا لنصل الى كنه ذلك ولكن القدر الذى علمناه ان استعمال الكلمات والتركيبات الجزلة العذبة مع اللطافة وعدم التكلف فى القرآن العظيم مما لا نظير له فى قصائد المتقدمين والمتأخرين ومن الغرابة فيه انه يلبس المعانى من انواع التذكير والمخاصمة فى كل موضع لباساً يناسب اسلوب السورة و نقصر يد المتطاول عن ذيلة تأمل ايراد قصص الانبياء فى سورة الاعراف وهود والشعراء، ثم انظر تلك القصص فى الصافات ثم فى الذاريات و نحوها. يظهر لك الفرق وكذلك ذكر تعذيب العصاة وتنعيم المطيعين فانه يذكر فى كل مقام باسلوب جديد و يذكر مخاصمة اهل النار فى كل موضع على حدة والكلام فيه يطول و ايضا نعلم انه لايتصوّر رعاية مقتضى المقام الذى تفصيله فى علم المعانى و رعاية الاستعارات والكنايات التى تكفل لها علم البيان مع رعاية حال المخاطبين الاميين الذين لايعرفون هذه الصناعات احسن مما يوجد فى القرآن العظيم فان المطلوب ههنا ان يذكر فى المخاطبات المعروفة التى يعرفها كل من الناس نكتة رائقة للعامة مرضيه عند الخاصة وهذا كالجمع بين النقيضين وههنا نكتة بديعة لابد من التنبيه عليها لكون بعض العلماء من اهل الهند قد غفل عنها فضلوا واضلوا وهى ان دراسة

القرآن ونحوه و صرفه واسلوبه انما هی دراسة عالية لاتنلقاها الا طبقة خاصة من المهرة البلغاء فكما ان للقرآن اسلوباً خاصاً قد انفرد به من بين اساليب العربية فان له نحوا خاصا يسمو فی كثير من المواضع عن القواعد التی نقرأها فی كتب النحو المتداولة بين المدارس حتی اننا لا نتجاوز الحق اذا قلنا ان هذه الكتب و حدها لاتكفی لاعراب بعض أيات القرآن بل لا بعد للتمكن من اعرابها من الاستعانة بالتفاسير والا فكيف نعرب كلمة الصابرين المنصوبة فی قوله تعالیٰ "والموفون بعهدهم اذاعا هدوا والصابرين فی الباساء والضراء مع كونها معطوفة علےٰ جميع المرفوعات التی سبقتها الا اذا عاوننا المفسرون ولاشک ان اصاب الدراسة العالية فی الادب والنحو وقفه اللغة يتعلمون فيما يتعلمونه اصول القواعد و تطوراتها و يقفون علی الادوار التی مرت بها فاذا اقرأ احدهم انّ هٰذان لساحران وهی قراءة معترف بها الی جانب القراءة الثانية اِنْ هٰذان لساحران لايقف حائراً عند هٰذان كما يقف المبتدی فی النحو. نعم ان صاحب الدراسة العالية لايقف عند هذا الرفع الذی يبدو شذوذًا وما هو بشذوذ بل سيعلم من اول نظرة ان الكتاب الكريم قد نزل بمختلف لغات العرب و ان من تلک اللغات لغة قبيلة بنی الحارث التی كانت تلزم المثنی الالف فی جميع حالاته و ان فی قوله ان هٰذان لساحران استعمالاً

لقاعدة كانت موجودة عن العرب الاول لا تحتو يها كتب النحو المتداولة وذكر ها المفسرون واللغويون العارفون بفقه اللغة العربية و تطور اتها و ادوار ها التى مرت بها. فاعلم ذلك والله يتولىٰ هداك و منها مالا يتيسر فهمه لغير المتقين المتدبرين فى اسرار الشرائع ولذا قال تعالى ذلك الكتب لاريب فيه هدًى للمتقين فالعلوم الخمسة التى بينها القرآن العظيم بطريق التنصيص عليها تدل على ان القرآن تنزيل من الله هداية الانسان كما ان الطبيب اذا انظر فى القانون لا بن سينا ولا حظ تحقيقه و تدقيقه فى بيان الامراض و اسبابها و علاما تها ووصف الا دوية لا يشك فى ان المؤلف كامل فى صناعة الطب كذلك عالم اسرار الشرائع قد وقعت موقعها بوجه لا يتصور احسن منها والنور يدل بنفسه على نفسه فكل من اراد تهذيب النفوس لا بدله من الرجوع الى القرآن فترى اقلام الفلاسفة والحكماء قد انشقت و انكسرت بنزوله وظلت اعنا قهم له خاضعين فقالوا لا حاجة لنا الى بيان الحكمة العملية فان الشريعة المصطفوية قد قضت الوطر عنها ولو اوتى هٰؤلاء حظاً من التقوى لا عترفوابان القرآن قد قضى الوطر عن كل حكمته مافر طنا فى الكتاب من شئ.﴾

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی
شیخ الحدیث دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار

ذلت یہود

﴿ذلت یہود اور عربوں کی حالیہ شکست﴾

حامدا و مصلیا و مسلما، اما بعد:

عرصہ سے حکومت اسرائیل کی وجہ سے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ قرآن میں تو اس قوم کے لئے ذلت و مسکنت کو لازم کہا گیا ہے، پھر ان کو حکومت و سلطنت کیسے مل گئی؟ زبانی جواب سے سوال کرنے والوں کی تسلی کر دی گئی مگر اب یہ سوال الصدیق (لکھنؤ) مورخہ ۵ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ میں شائع ہوا ہے تو تحریری جواب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس شبہ کے چند جوابات ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن کریم میں جہاں یہود کے لئے ذلت کو لازم کہا گیا ہے وہاں دو حالتوں کا استثناء بھی موجود ہے، چنانچہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾

"ان پر ذلت جما دی گئی ہے جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے، مگر ہاں (دو ذریعوں سے یہ ذلت رفع ہو جائیگی) ایک تو ایسے ذریعے کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعے کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہو۔"

اللہ کی طرف کا ذریعہ تو یہ ہے کہ کوئی یہودی اسلام لے آئے یا جزیہ دے کر رعایت لئے اسلام میں داخل ہو جائے تو حکومت اسلام اس کی جان و مال و آبرو کی محافظ ہوگی اور آدمیوں کی طرف کے ذریعے سے مراد یہ ہے کہ کسی قوم کی پشت پناہی ان کو حاصل ہو جائے تو اس صورت میں بھی ذلت رفع ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ اس وقت جو اسرائیل کی حکومت ہے اس کو برطانیہ اور امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے اور پہلے روس

کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اب قرآن پر کوئی اشکال نہیں۔ اگر کسی قوم کی پشت پناہی ان کو حاصل نہ ہو تو ایک دن بھی حکومت اسرائیل قائم نہیں رہ سکتی اور جیسے یہودی پہلے ذلیل تھے ویسے ہی ذلیل کے ذلیل رہیں گے۔

(۲) مسلم شریف میں صحیح حدیث موجود ہے۔

﴿عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال تقاتلکم الیهود فتسلون علیهم حتی یقول الحجریا مسلم هذا یهودی ورائی فاقتله﴾ (ج۲ ص ۳۹۶)

''عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے یہود جنگ کریں گے پھر تم ان پر مسلط اور غالب ہو جاؤ گے۔ یہاں تک کہ پتھر (اور درخت) بولیں گے اے مسلم! یہ یہودی میرے پیچھے (چھپا ہوا) ہے اس کو قتل کر دے!''

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تمہارے اور یہود کے درمیان جنگ نہ ہو جائے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ یہود کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا حوصلہ ہوگا۔ (اور اس کا سبب وہی ہوگا جو قرآن نے بتلا دیا ہے کہ کوئی دوسری قوم ان کی، پشت پناہی کرے گی۔ خواہ وہ دوسری قوم مسلمانوں ہی میں سے کچھ غدار ہوں یا نصاریٰ و ہنود وغیرہ ہوں)۔ رہا یہ سوال کہ حدیث میں تو مسلمانوں کے غلبہ کی خبر دی گئی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ یہود غالب اور قوم عرب مغلوب ہو رہی ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی جنگ کا خاتمہ کہاں ہوا ہے؟ جنگ کے دوران ایسا ہوا کرتا ہے۔ آپ کو سیرت رسولؐ سے فتح خیبر کا حال معلوم کرنا چاہیے کہ اس کا ایک قلعہ کئی دن تک فتح نہ ہوا، یہود غالب رہے اور مسلمان بغیر فتح کے واپس آتے رہے۔ تیسرے دن حضرت علیؓ نے اس قلعہ کو فتح کیا تو جنگ کا

خاتمہ ہوا۔ اب بھی انشاء اللہ انجام کار مسلمان ہی غالب رہیں گے۔ والعاقبة للمتقين آثار بتلا رہے ہیں کہ یہ جنگ ختم نہیں ہوگی بلکہ ملحمہ کبریٰ (جنگ عظیم) بن کر رہے گی اور یہود ایسے ذلیل ہوں گے کہ درخت اور پتھر بھی ان کے قتل کے لئے مسلمانوں کو پکاریں گے۔ وانتظروا انّا منتظرون! اس وقت مسلمانوں کو جو عارضی شکست ہوئی ہے، اس کے اسباب میں غور کرنا بھی مسلم حکومتوں کا فرض ہے۔ میرے خیال میں اس کے چند اسباب ہیں۔

(ا) عرب حکومتوں میں پورا اتحاد نہیں ہے یہ بڑی سخت بات ہے۔ اس کا بہت جلد تدارک ہونا اور جملہ سلاطین عرب کا متحد ہو جانا ضروری ہے۔ اور سلاطین عرب کے ساتھ تمام مسلم سربراہوں کو اسرائیل کے مقابلہ کے لئے متحد کیا جائے کیونکہ امریکہ اور برطانیہ اس کی مدد پر ہیں اور ان دونوں کے ساتھ دوسری مغربی طاقتیں بھی ہیں۔

(ب) جو حکومتیں اسرائیل سے برسرپیکار ہیں ان میں بھی جذبہ جہاد اسلامی نہ تھا بلکہ سوشلزم یا نیشنلزم کا جذبہ تھا۔ وہ قومیت عرب کا نعرہ لگا رہے تھے، اسلامی نعرہ نہیں! بجائے یاخیل اللہ ارکبی کے یا خیل العرب ارکبی ان کا مطمع نظر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ اسلامی جہاد میں ہے! سوشلزم یا نیشنلزم کی جنگ پر نہیں! حدیث میں صاف آچکا ہے کہ جو شخص محبت قومی یا اپنی ناموری کے لئے جنگ کرے وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے کیا جائے (بخاری) اسی پر نصرتِ الٰہی کا وعدہ ہے۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ. يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّيْنَ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّائِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظَاهِرِيْنَ﴾ O

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے قدم جمادے گا (سورہ محمدؐ) اے ایمان والو! تم اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے ان حواریین سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے وہ حواری بولے ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں سو اس کوشش کے بعد بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ منکر رہے سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی سو وہ غالب رہے۔'' (سورۃ الصف)

(ج) آپ کو غزوہ احد کا حال پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ پہلے حملہ میں کفار کو شکست فاش ہوئی تھی۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے مگر ایک مورچہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تیراندازوں کو متعین فرمایا تھا وہ کفار کی شکست کا منظر دیکھ کر اس مورچہ سے ہٹ گئے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ بغیر میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اتنی ذرا سی غلطی پر جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور فتح کے بعد شکست کا سامنا ہوا۔ حق تعالیٰ نے اس حقیقت کو اس طریقے سے بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰٮكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھلایا تھا جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ہی کمزور ہو گئے اور باہم حکم میں اختلاف کرنے لگے اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھلا دی تھی، تم میں سے بعض وہ شخص تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض تم میں

وہ شخص تھے جو آخرت کے طلب گار تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے
انہی کے لئے اپنی نصرت کو بند کر دیا اور پھر تم کو ان کفار سے ہٹا دیا
تا کہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمائش فرما دے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ
نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں
پر" (سورۂ آل عمران)

معلوم ہوا کہ معصیت سے رسولؐ کی موجودگی میں فتح شکست میں بدل جاتی ہے۔ اب ہم مسلمان اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہماری اس وقت کیا حالت ہے؟ سود خوری، قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری، عریانی بے پردگی اور فحاشی کا بازار ہم میں گرم ہے۔ ہماری صورت دیکھ کر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا یہ غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ باطن کا تو پوچھنا ہی کیا! پھر میدان جنگ میں بھی ہم توبہ کر کے نہیں جاتے، ویسے ہی چلے جاتے ہیں جیسے دوسری قومیں میدان میں آتی ہیں۔ مگر ہمارے اسلاف کی یہ حالت تھی کہ میدان جنگ میں توبہ، استغفار اور دعائیں کر کے اترتے تھے، نماز کا پورا احترام کرتے تھے، اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔

﴿یَـا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَـاثْبُتُوْا وَاذْکُرُو اللّٰهَ کَثِیْـرًا لَـعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ○﴾

"اے ایمان والو! جب تم کو کسی جماعت سے مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو اور امید ہے کہ تم کامیاب ہو"

کہ ہمارا لشکر ہی غالب ہوگا، اس لئے ہمیں خدائی لشکر بننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صورت دیکھ کر لوگ بول اٹھیں کہ یہ اللہ والے ہیں۔

میدان جنگ میں قائدین حرب کو اتحاد و اتفاق سے کام کرنا چاہیے۔ اختلاف و نزاع سے بچنا چاہیے۔

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ o﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کیا کرو اور نزاع مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جاوے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' (سورۂ انفال)

(د) اتحاد و اتفاق کی یوں تو ہر حال میں ضرورت ہے مگر میدان جنگ میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ طلیحہ بن خویلد اسدی مدعی نبوت کی سرکوبی کے لئے چار پانچ ہزار کا لشکر مدینہ سے بھیجا گیا تو اس نے چالیس ہزار کا لشکر جرار لے کر مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر بھاگا تو اپنے وزیر سے پوچھا کہ یہ بھی عرب ہیں، ہم بھی عرب ہیں اور ہماری تعداد ان سے آٹھ گنا زیادہ تھی پھر ہمیں یہ شکست کیوں ہوئی؟ وزیر نے کہا مسلمان تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہے مگر اتنی بات تو میں نے بھی دیکھی ہے کہ ہماری فوج کا ہر سپاہی یہ چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں، میرے پاس والے چاہے مارے جائیں اور مسلمانوں کا ہر فرد یہ چاہتا تھا کہ وہ شہید ہو جائے مگر اس کے بھائی محفوظ رہیں اور جو قوم موت کی مشتاق ہو اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا اور اس اشتیاق شہادت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے کہ میں پہلے مارا جاؤں، دوسرے زندہ رہیں یا میرے بعد شہید ہوں۔

اسی الفت و محبت سے پہلے مسلمان سرفراز تھے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

﴿ھُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ o﴾

''وہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی امداد سے اور مسلمانوں سے قوت دی اور ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے لیکن

اللہ ہی نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا۔ بے شک وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔''

(ہ) دشمن کے مقابلے کے لئے قوت حرب (جنگی قوت) کو اس حد تک بڑھانا چاہیے کہ دشمن پر ہیبت چھا جائے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۝﴾

''اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو، ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔'' (سورۂ انفال)

ہمارے پہلے خلفاء و سلاطین اس حکم پر پوری طرح عامل تھے، حضرت معاویہؓ نے خلافت عثمانؓ میں پانچ سو بحری جہازوں کا جنگی بیڑہ تیار کر رکھا تھا۔ دشمن کی جنگی قوت کی مدافعت کا پورا سامان تیار رکھتے۔ ہمارے سلاطین جنگی سامان خود تیار کرتے تھے۔ دوسروں کے دست نگر نہ تھے جیسا آج کل ہم دوسروں کے محتاج ہیں سب مسلمان سربراہوں کو مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے اور بحری و ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے قائم کرنے چاہئیں اور نئی نئی ایجادیں بھی کرنی چاہئیں۔ یہ سب وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ من قوۃ میں داخل ہے۔

(ز) مگر سامان پر یا سامان دینے والے پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے بھروسہ اللہ کی مدد پر کرنا چاہیے۔ غزوہ حنین میں اسلامی لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ بعض صحابہؓ کو خیال ہو گیا کہ اب تو ہماری بڑی فوج ہے اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اس اعجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے حملہ میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور مشت خاک سے فتح ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ

مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾

''تم کو اللہ تعالیٰ نے بہت موقعوں پر غلبہ دیا اور حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگی کرنے لگی۔ پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور دوسرے مومنین پر اپنی تسلی نازل فرمائی اور ایسے لشکر نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور یہ کافروں کی سزا ہے۔''

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ فتح اور غلبہ اللہ کی مدد سے ہوتا ہے۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہی ساتھ چھوڑ دے، اس کے بعد کون مدد کرسکتا ہے''۔

(ح) میدان جنگ میں نعرہ تکبیر دل سے بلند کرنا چاہیے اور بلند آواز سے سب مل کر نعرہ بلند کریں، انشاء اللہ کفار کے دلوں پر رعب طاری ہوجائے گا۔ اسلامی جہاد کا یہی طریقہ تھا۔ بینڈ باجے بجانا اسلامی جہاد میں نہ تھا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں یعنی اس کا بول بالا کرنے کے لئے ایسی مضبوط صف بندی کرتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو''

وہ بھاگنا جانتے ہی نہیں، مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹے رہتے ہیں۔ موت سے نہیں گھبراتے بلکہ شہادت کے طالب ہوتے ہیں۔ مگر قاعدہ سے لڑتے ہیں، بے فائدہ اپنی جان نہیں گنواتے۔

(ی) اگر کبھی مسلمانوں کو شکست ہو جائے جیسا اس وقت ہو گئی ہے تو اس سے افسردہ و پژمردہ نہ ہو جانا چاہیے۔ الحرب سجال: جنگ میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝﴾

''پست حوصلہ نہ ہو، غم گین و پریشان نہ ہو تم ہی غالب ہوگے اگر ایمان پر مضبوطی سے جمے رہے۔''

مجاہد کے دن اور رات

غزوہ یرموک کے موقعہ پر رومی عیسائیوں کی تعداد دو لاکھ اسی ہزار تھی اور مسلمان صرف چالیس ہزار تھے معلوم ہوتا تھا کہ نہتے انسانوں کا ایک مٹھی بھر گروہ امڈتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے جا رہا ہے۔ جنگ کی ابتداء حضرت مقدادؓ نے سورۂ انفال کی آیات جہاد پڑھ کر کی اور پورے دن کے خونریز معرکے کے بعد رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، بعض روایات میں ہے کہ ان کے صرف اسی آدمی بچ سکے، اور جب یہ اپنے بادشاہ ہرقل کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ وسائل کی اس بہتات کے باوجود تمہاری شکست میری سمجھ سے باہر ہے، خدا کے لئے بتاؤ کہ تم کیسے ہارے؟ اس پر رومی فوج کے ایک افسر نے کہا:

عالیجاہ! ہم ان لوگوں سے نہیں لڑ سکتے جن کی کیفیت یہ ہے کہ دن کے وقت ان سے بہتر شہسوار کوئی نہیں ہوتا اور رات کے وقت ان سے بڑھ کر عبادت گزار کوئی نہیں ہوسکتا۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہم

تقلید کے بارے میں ایک گفتگو

﴿تقلید کے بارے میں ایک گفتگو﴾

ہمارے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کا ایک بھانجا مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہو کر علی گڑھ میں ایک ڈاکٹر کا کمپونڈر بن گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب جماعت اہل حدیث سے منسلک تھے۔ اس نے اپنے کمپونڈر کو بھی جماعت اہل حدیث میں شامل کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسلک کی کتابیں مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ تین سال تک وہ اس مسلک کی کتابیں دیکھتا رہا بالآخر غیر مقلد بن گیا۔ تین سال کے بعد حضرت مولاناؒ سے ملنے سہارنپور آیا اور آتے ہی صاف کہہ دیا کہ اب میں حنفی نہیں ہوں بلکہ جماعت اہل حدیث میں شامل ہوگیا ہوں۔ حضرت مولاناؒ کو بہت افسوس ہوا اور مدرسہ مظاہر علوم کے علماء سے فرمایا کہ اپنے اس شاگرد کو سمجھاؤ اور اس کے شبہات کا ازالہ کرو تین دن تک وہ علماء مظاہر سے گفتگو کرتا رہا اور اپنے مسلک جدید پر جمارہا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ بندہ بھی حضرتؒ سے ملنے کو تھانہ بھون سے سہارنپور پہنچ گیا مجھے دیکھ کرؒ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا تم بڑے اچھے موقع پر آئے۔ یہ تمہارا شاگرد حقیقت سے بیزار ہو کر جماعت اہل حدیث میں شامل ہوگیا ہے۔ تین دن سے علماء مظاہر علوم اس کو سمجھا رہے ہیں مگر وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے تم بھی اس کو سمجھاؤ'' یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ بھی مجھ سے ملنے آگیا۔ میں نے کہا بعد عشاء کے مجھ سے ملو۔ جب وہ وعدہ کر کے چلا گیا۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اس نے تین سال تک اہلحدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس لئے نظر وسیع ہوگئی ہے۔ گفتگو میں اس کا لحاظ رہے۔ میں نے کہا انشاء اللہ اس کا لحاظ رکھوں گا کہ آپ بھی دعا وتوجہ سے مدد فرمائیں چنانچہ حسب قرارداد بعد عشاء کے وہ میرے پاس آیا جبکہ میں بستر پر لیٹ گیا تھا۔ وہ پاؤں دبانے لگا۔ میں نے بھی انکار نہ کیا۔ آخر تو شاگرد تھا۔ اب حسب ذیل گفتگو ہوئی:

ظفر:۔ ہاں صاحبزادے بتاؤ اب تمہارا مسلک کیا ہے؟

شاگرد:۔ عمل بالحدیث الصحیح۔

ظفر:۔ بس عمل بالحدیث الصحیح؟ عمل بالقرآن نہیں؟

شاگرد:۔ جناب والا! عمل بالقرآن تو سب سے پہلے ہے۔ اس کے بعد عمل بالحدیث الصحیح ہے۔

ظفر:۔ اگر تمہارا یہ مسلک ہوتا تو پہلے عمل باالقرآن کو بیان کر کے پھر عمل بالحدیث کا نام لیتے۔

شاگرد:۔ وہ تو ظاہر ہے اس لئے بیان کی ضرورت نہ سمجھی۔

ظفر:۔ یہ تو تم نے بات بنائی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اہلحدیث قرآن پر عمل نہیں کرتے۔ لیکن حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں۔ پھر احادیث کو۔ اور جس حدیث کو نص قرآن کے موافق پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور بقیہ احادیث کو محامل حسنہ پر محمول کرتے ہیں۔ اب میں تم کو بتلاتا ہوں کہ جن مسائل مشہورہ میں ہمارا اور اہل حدیث کا اختلاف ہے۔ ان کے لئے ہم نے اول قرآن کو دیکھا اور جن احادیث کو نصوص قرآنیہ کے موافق پایا ان کو ترجیح دی۔ قراۃ خلف الامام ہی کا مسئلہ لے لو۔ ہم نے اس کے لئے قرآن کو پہلے دیکھا۔ سورۂ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝﴾

''جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔''

اس سے صاف معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ ساتھ قرأت نہ کرنا چاہیے بلکہ قرآن کو سننا اور خاموش رہنا چاہیے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ یہ آیت بالاتفاق قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہم نے احادیث کو دیکھا تو کسی حدیث میں بھی یہ نہیں آیا کہ اِذَا قَرَأَ الاِمَامُ فَاقْرَءُوْا (جب امام قراءت کرے تم بھی

قرأت کرو)۔ اِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا وَ اِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہ لِمَنْ حَمِدَہٗ فَقُوْلُوْا رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ و اِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا۔ تو حدیثوں میں موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو، جب رکوع کرے، رکوع کرو جب سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہے تم ربنا ولک الحمد کہو۔ جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ مگر یہ کہیں نہیں کہ جب وہ قرأت کرے تو تم بھی قرأت کرو۔ بلکہ اگر ہے تو اذا قرأ فانصتوا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ امام مسلمؒ اور امام احمدؒ نے اور بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حنفیہ نے اس کو ترجیح دی اور بقیہ احادیث کو محامل حسنہ پر محمول کیا۔ آمین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ نے اول قرآن کو دیکھا۔ چنانچہ آمین دعا ہے جیسا امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ اس لیے دعا کے بارے میں قرآن کو دیکھا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملا۔ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَہ (اپنے رب سے تضرع کی ساتھ آہستہ دعا کرو) تو ہم نے اس مسئلہ میں شعبہؒ کی روایت کو ترجیح دی جس میں وارد ہے فقال اٰمین و خفض بھا صوتہ (آپ نے سورہ فاتحہ کے ختم ہونے پر آمین کہی اور آواز کو پست کیا یعنی آہستہ سے آمین کہی۔ یہ حدیث ترمذی میں ہے) نماز کے اندر رفع یدین کے بارے میں بھی ہم نے اول قرآن کو دیکھا تو حق تعالیٰ کا ارشاد ملا۔ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ اور اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ٥ پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ کے سامنے سکوت اور سکون کے ساتھ کھڑے ہو۔ دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ جو لوگ نماز میں خشوع کرنے والے ہیں وہ کامیاب ہیں اور خشوع کے معنی بھی سکون ہی کے ہیں۔ اس کے بعد احادیث کو دیکھا تو صحیح مسلمؒ میں روایت موجود ہے کہ صحابہ نماز میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھا کر السلام علی فلان السلام علی فلان فلان کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مالی اراکم رافعی ایدیکم کَاَنَّھَا اَذْنَابُ خَیْلٍ شَمْسٍ اُسْکُنُوْا فِی الصَّلٰوۃِ (یہ کیا حرکت ہے کہ تم اس طرح ہاتھ اٹھا تے ہوئے جیسے گھوڑے دم اٹھاتے ہیں۔ نماز میں سکون سے رہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام کے وقت بھی ہاتھ اٹھانا سکون کے خلاف ہے حالانکہ سلام کا وقت نماز

میں داخل بھی ہے اور خارج بھی ہے تو رکوع کے وقت ہاتھ اٹھانا کیسے مناسب ہوگا کہ رکوع تو بالکل داخل صلوٰۃ ہے۔ ہاں تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے کہ وہ داخل صلوٰۃ یعنی رکن نہیں بلکہ شرط صلوٰۃ ہے۔ اس لئے حنفیہ نے ان روایات کو ترجیح دی ہے جن میں رکوع کے وقت ترک رفع یدین آیا ہے۔ اسی پر اور مسائل کو قیاس کرو کہ حنفیہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں پھر احادیث میں سے جو نص قرآن سے موافق یا قریب ہوں ان کو ترجیح دیتے ہیں۔

شاگرد:۔ واقعی میں نے اب تک اس نکتہ پر غور نہیں کیا تھا مگر یہ شبہ اب بھی باقی ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

ظفر:۔ عزیز من! پہلے تم صحیح حدیث کی تعریف تو بیان کرو مگر دیکھو حدیث صحیح کی تعریف میں کسی کی تقلید نہ کرنا۔

شاگرد:۔ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پسینہ پسینہ ہو گیا پھر کہنے لگا کہ میں سمجھ گیا۔ واقعی بغیر تقلید کے کسی حدیث کو صحیح کہنا مشکل ہے۔ پھر بخاریؒ مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید تو جائز ہو اور امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام شافعی کی تقلید ناجائز ہو۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اب میں مسلک اہل حدیث کو چھوڑتا ہوں اور مسلک حنفی اختیار کرتا ہوں۔

ظفر:۔ تم بہت جلدی سمجھ گئے اس سے دل خوش ہوا مگر میں اس کی اچھی طرح وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ تقلید کا انکار کرتے اور تقلید کی مذمت کرتے ہیں وہ بھی کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن بغیر تقلید کے نہیں کہہ سکتے۔ رہا یہ عذر کہ حق تعالیٰ نے خبر صادق اور شہادت عادل کو قرار دیا ہے تو یہ تقلید نہیں بلکہ اتباع حجت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا محض حجت خبر نہیں بلکہ اس کا مدار محدث کے ظن و اجتہاد پر ہے۔ بعض دفعہ سند کے راوی سب ثقہ ہوتے ہیں مگر حدیث معلل ہوتی ہے اور حجت کی معرفت حاذقین ہی کو ہوتی ہے، ہر محدث کو نہیں ہوتی۔ ابن ابی حاتمؒ نے کتاب العلل میں عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی معرفت بھی الہام ہے۔ ابن نمیر نے کہا واقعی سچ ہے اگر محدث سے پوچھو کہ تم نے کیسے کہا (کہ یہ حدیث صحیح ہے یا معلل

ہے) تو اس کے پاس کچھ جواب نہ ہوگا۔ احمد بن صالحؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت بھی ایسی ہی ہے جیسے سونے اور پیتل کا پہچاننا۔ کیونکہ جوہر کو جوہری ہی پہچانتا ہے۔ پرکھنے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم نے اس کو کھرا اس کو کھوٹا کیسے کہا تو وہ کوئی دلیل نہیں بیان کر سکے گا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ ائمہ حدیث کا کسی حدیث کو صحیح یا معلل کہنا محض خبر نہیں بلکہ ان کا یہ قول ان کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے تو اس باب میں ان کی بات پر اعتماد کرنا عین تقلید ہے۔ علامہ ابن القیمؒ کا یہ فرمانا کہ یہ احکام میں تقلید نہیں، اس لئے صحیح نہیں کہ حدیث صحیح پر عمل کرنا شرعاً واجب اور ضعیف پر عمل کرنا غیر واجب اور موضوع پر عمل کرنا حرام ہے تو یہ تقلید احکام ہی میں ہے۔ غیر احکام میں تو نہیں۔ اسی لئے فقہاء نے بحث سنت کو اور اس کے قبول ورد کے قواعد کو اصول فقہ میں بھی بیان کیا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ کا اس کو اتباع کہنا تقلید نہ کہنا لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ عبار اتنا شتی وحسنک واحد. و کل الی ذاک الجمال یشیر،

عزیز من! قرآن کا صحیح پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ یقیناً واجب ہے اور غلط پڑھنا حرام ہے۔ اب تم بتاؤ کہ بغیر ائمہ قرأت کی تقلید کے تم قرآن صحیح پڑھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں! اور یہ بھی تقلید فی الاحکام ہی ہے۔ اسی طرح حدیث کو پہچاننا اور صحیح کو ضعیف سے الگ کرنا بھی واجب ہے اور اس میں تقلید ائمہ سے چارہ نہیں۔ پھر جماعت اہل حدیث کس منہ سے تقلید کا انکار کرتی ہے؟ پھر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین نے جو اصول حدیث کی صحت وضعف کے لئے مقرر کئے ہیں وہ آسمانی وحی سے مقرر نہیں کئے بلکہ اپنے ظن واجتہاد سے مقرر کئے ہیں ایسے ہی ہمارے فقہاء نے بھی صحت وضعف وحدیث کے لئے کچھ اصول مقرر کئے ہیں جو اصول فقہ کی بحث السنہ میں مذکور ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث محدثین کے اصول پر صحیح ہمارے اصول پر ضعیف ہو تو اس میں نزاع کرنا غلط ہے دلائل میں غور کرنا چاہیے کہ دلیل سے کس کے اصول قوی ہیں آخر میں اتنا اور بتلا دوں کہ حنفیہ سے زیادہ حدیث کا اتباع کوئی نہیں کرتا۔ حنفیہ تو قرون ثلثہ میں مرسل اور منقطع کو بھی حجت مانتے ہیں جس کو اہل حدیث رد کر دیتے ہیں اور مراسیل مقاطیع کا ذخیرہ احادیث

مرفوعہ سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہے تو یہ لوگ حدیث کے آدھے ذخیرے کو چھوڑتے ہیں۔ پھر مرفوعات میں سے بھی یہ لوگ صحیح یا حسن ہی کو لیتے ہیں۔ ضعیف کو رد کر دیتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قیاس سے مقدم ہے بلکہ قول صحابی وقول تابعی بھی قیاس سے مقدم ہے اب تم ہی بتلاؤ کہ عامل بالحدیث کون ہے اور تارک حدیث کون؟ رہا یہ کہ بعض مسائل میں حنفیہ حدیث صحیح کو چھوڑ دیتے ہیں اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ اس صورت میں جس حدیث پر حنفیہ نے عمل کیا ہے۔ وہ ان کے اصول پر صحیح تھی گو محدثین کے نزدیک ضعیف ہو۔ حنفیہ کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف سند پر نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ اور بھی شرائط ہیں جو اصول فقہ میں مذکور ہیں اور ہم نے مقدمہ اعلاء السنن میں بھی ان کو بیان کر دیا اور مقدمہ اعلاء السنن کے دوسرے حصہ میں تقلید واجتہاد پر مفصل کام کیا گیا ہے جو زیر طبع ہے۔

شاگرد:۔ الحمد للہ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں اہلحدیث کے مغالطہ سے نکل گیا ہوں۔ والحمد لله رب العلمين.

(از حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ)

منکرین حدیث خارجی ہیں

﴿منکرین حدیث خارجی ہیں﴾

حضرت مولانا موصوف رحمہ اللہ کا یہ مضمون کافی عرصہ سے دفتر الصدیق کو موصول ہو چکا تھا لیکن بعض وجوہ (جن کا ذکر سابقہ اشاعتوں میں ہو چکا ہے) کی بناء پر اس مضمون کے طبع ہونے میں تاخیر درتاخیر ہوتی گئی۔ ادارہ الصدیق حضرت مولانا سے اس تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہے نیز حضرت والا کا ایک اور مضمون ''تاریخ الخطیب کا پس منظر'' کے نام سے منکرین حدیث کے رد میں دفتر کو موصول ہو چکا ہے انشاء اللہ تعالیٰ الصدیق کے آئندہ شمارہ میں وہ بھی شائع کیا جائے گا۔ واللہ ھو المستعان. (مدیر)

خاتمۃ الحفاظ علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۳۵۸ جلد ا فتح الباری میں ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿ ویقال لمن یعتقد مذھب الخوارج حروری لان اول فرقة منھم خرجوا علیٰ علیّ رضی اللّٰہ عنہ بالبلدة المذکورة ای حروراء علی میلین من الکوفة فاشتھروا بالنسبة الیھا وھم فرق کثیرة لکن من اصولھم المتفق علیھا بینھم الاخذ بمادل علیہ القرآن وردّ ما زاد علیہ من الحدیث مطلقاً اھ ﴾

ترجمہ'' جولوگ مذہب خوارج کے معتقد ہیں ان کو حروری کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی پہلی جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں اسی شہر حروراء سے خروج کیا تھا جو کوفہ سے دو میل پر تھا اسی کی طرف ان کی نسبت مشہور ہوگئی ان کے بہت سے فرقے ہیں لیکن اس اصول پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ اسی بات کو مانتے ہیں کہ جو قرآن سے ثابت ہو وہی صحیح ہے اور حدیث سے جو کچھ اس کے

علاوہ معلوم ہو اس کو مطلقاً رد کر دیتے ہیں۔‘‘

ہندوستان اور پاکستان میں یہ فرقہ اہل قرآن کے نام سے مشہور ہے ان کا بھی یہی اصول ہے کہ صرف قرآن کو حجت کہتے ہیں۔ حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حجت نہیں مانتے اس فرقے کی ابتداء ہندوستان میں عبداللہ چکڑالوی سے ہوئی تھی۔ علمائے وقت نے اس کے دعویٰ کی قلعی اچھی طرح کھول دی تھی اور عام طور سے سب مسلمان اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ چنانچہ اس کی موت کے ساتھ ہی اس کا مذہب بھی مردہ ہوگیا تھا۔ مگر اب کچھ دنوں سے پھر اس مذہب نے سر ابھارا ہے جس کے ماہنامے اور ہفتہ وار رسالے شائع ہورہے ہیں۔ مسلمانوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ یہ جماعت خارجی ہے اور اسی خارجی فرقہ کی یادگار ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

﴿یخرج قوم فی آخر الزمان احداث الاسنان سفھاء الاحلام یقرؤن القرآن لایجاوز حنا جرھم یما قون من الدین مروق السھم من الرّمیة یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان لئن انا ادرکتھم لا قتلنھم قتل عاد رواہ الشیخان وغیرھما.﴾

آخر زمانے میں ایک قوم نکلے گی نوجوانوں کا جتھا ہوگا عقل کے کورے ہوں گے قرآن پڑھیں گے مگر گلے سے آگے (دل میں) نہ اترے گا۔ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار میں سے نکل جاتا ہے مسلمانوں کو قتل کریں گے بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے (چنانچہ خارجیوں نے ہمیشہ مسلمانوں ہی کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی کفار سے کبھی جہاد نہیں کیا) اگر میں نے ان کو پالیا تو اس طرح قتل کروں گا جیسا (خدا نے) قوم عاد کو تباہ کیا (یہ حدیث بخاری و مسلم اور جملہ کتب صحاح میں موجود ہے) تاریخ اسلام شاہد ہے کہ خارجیوں نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کیا پھر برابر خلفائے اسلام پر خروج کرتے رہے یہ لوگ حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت معاویہ سب کو کافر کہتے تھے اس لئے کوئی عثمانی یا علوی اور سید کبھی خارجی (منکر حدیث)

نہیں ہوسکتا اسی طرح صدیقی، فاروقی خانوادے بھی منکر حدیث (خارجی) نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ سب کے سب تمام صحابہ کا احترام کرتے ہیں اوران کی پوری عزت کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ فتنہ عجمی لوگوں کا لایا ہوا ہے۔عربی خاندان اس سے بالکل بے زار ہیں وہ برابر حدیث نبوی کا درجہ قرآن کے بعد مانتے آئے ہیں اور حدیث کو دینی حجت سمجھتے ہیں۔ یہ جماعت گوحضرت علی حضرت عثمان حضرت معاویہ کو کافر نہیں کہتی مگر انکار حدیث میں اسی خارجی فرقہ کی یادگار ہے کیونکہ حدیث نبوی کو حجت نہ سمجھنا فرقہ خوارج ہی کا اصول ہے ورنہ تمام مسلمان برابر قرآن کے بعد حدیث نبوی کو دوسرے درجہ میں دینی حجت مانتے آئے ہیں۔ خارجیوں کے سوا کسی نے یہ جرأت نہیں کی کہ حدیث شریف کے دینی حجت ہونے سے انکار کردے اور گو یہ جماعت ظاہر میں عبداللہ چکڑالوی کی جماعت سے اپنے کو الگ کرتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ ہم اہل قرآن کی طرح حدیثوں کو اٹھا کر نہیں پھینکتے مگر حقیقت میں دوسرے عنوان سے یہ لوگ اسی مذہب کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور جس حیثیت سے وہ حدیث کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ نہ ماننے سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن نے صرف دین کے اصول دیئے ہیں اور بجز چند احکام کے باقی امور کی جزئیات خود متعین نہیں کیں بلکہ اسے قرآنی نظام (یعنی اسلامی اسٹیٹ) پر چھوڑ دیا ہے۔ ان جزئیات کو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیا تھا۔ اب یہ چیز قرآنی نظام (اسلام اسٹیٹ) کے دیکھنے کی ہوتی ہے کہ کسی پہلے سے متعین شدہ جزئیات میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں الخ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام مورخہ ۵ فروری ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۰)

یہ بات اس شخص کے جواب میں کہی جا رہی ہے جو پوچھتا ہے کہ اگر تمام حدیثوں کو اٹھا کر پھینک دیں تو نماز کیسے پڑھیں؟ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ قرآن کی تشریح میں فرمایا ہے وہ بحیثیت رسول و نبی کے نہیں بلکہ بحیثیت ہیڈ آف دی اسٹیٹ کے فرمایا ہے اور جب کبھی طلوع اسلام کی تجویز کے مطابق قرآنی نظام (اسلامی اسٹیٹ) قائم ہوگا اس کے ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو حق حاصل ہوگا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین کردہ جزئیات

میں رد و بدل کر دے اور یہ اختیار صرف سیاسیات ہی میں نہیں بلکہ عبادات و معاملات میں بھی اسے رد و بدل کرنے کا پورا اختیار ہے خدانخواستہ اگر طلوعِ اسلام کا تجویز کردہ نظام قائم ہوگیا (جس میں سنت رسول اور حدیث نبوی کی یہ درگت بنائی جائے گی) تو مسلمانوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ اس جماعت کے نزدیک اس وقت کے ہیڈ آف اسٹیٹ کو نماز کی صورت بدلنے کا بھی حق حاصل ہوگا۔ روزہ اور حج و زکوٰۃ و نکاح و طلاق سب کی صورتیں بدل کر نئی نئی جزئیات متعین کرنے کا بھی پورا اختیار ہوگا یقیناً اس صورت حال کے متعلق ہر مسلمان کا فیصلہ یہی ہوگا کہ حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ درگت بنا کر اس جماعت کا یہ کہنا کہ ہم حدیث کو مانتے ہیں اس کے ماننے سے بدتر ہے قرآنی نظام اگر ایسی ہی موم کی ناک ہے جس کو ہر ہیڈ آف اسٹیٹ جب چاہے جس طرح چاہے بدل سکتا ہے تو ایسا نظام طلوعِ اسلام ہی کو مبارک ہو۔

مسلمانانِ عالم ایسے نظام کو قرآنی نظام ہرگز نہیں مان سکتے۔ چودہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ کے فرائض و ارکان میں کسی نظام کو بھی رد و بدل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح نکاح و طلاق، بیوع و میراث اور حدود شرعیہ میں کسی کو تبدیلی کا کوئی حق نہیں۔ نصوص قرآن کی جو تشریح تعیین، جزئیات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے اس کو نہ کوئی خلیفہ بدل سکتا ہے نہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ کیونکہ آپ کی یہ تشریح خدا کے حکم سے خدا کا رسول و نبی ہونے کی حیثیت سے ہے۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (سورہ نحل) اور ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس چیز کو بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ اس حیثیت میں کوئی خلیفہ یا ہیڈ آف دی اسٹیٹ آپ کا شریک نہیں آپ پر نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے تو آپ کی تشریح و تعیین کے بدلنے کا بھی کسی کو حق نہیں۔ خلیفہ یا اس کی جماعت اہل شوریٰ کو اگر ان میں اجتہاد کی اہلیت ہو صرف ایسے امور میں اجتہاد کا حق ہے جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی نص موجود نہ ہو اور اگر اہلیت اجتہاد مفقود ہو تو ان کو خود اجتہاد کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ آئمہ مجتہدین کا اتباع لازم ہوگا جن کے متعلق قرآن کا حکم ہے فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ اگر تم کو کسی بات کا علم نہ ہو تو جاننے والوں سے پوچھو۔ طلوع اسلام کی ناواقفیت ...... ملاحظہ ہو کہ وہ ایک طرف تو زہری جیسے حافظ حدیث امام و حجت پر اپنے صفحات میں جرح و تنقید کے لئے قلم تیز کرتا ہے اور دوسری طرف خطیب بغدادی جیسے مورخ کی تاریخ سے امام ابوحنیفہؒ کی طرف ایسے رکیک اور بے ہودہ اقوال منسوب کرتا ہے جن سے بظاہر امام ابوحنیفہؒ حدیث نبوی کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنے والے نظر آتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے لئے حدیث نبویؐ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی کی سند جواز حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ خطیب بغدادی کی ان ہفوات اور خرافات کا رد سب سے پہلے ملک معظم عیسیٰ بن ابی بکر ایوبی نے اپنی کتاب السہم المصیب فی کید الخطیب میں کیا ہے۔ جو خدیو مصر کے حکم سے تاریخ خطیب کے ساتھ ہی طبع کر دی گئی تھی۔ مگر طلوع اسلام کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ جو اس رد کو مطالعہ کر لیتا؟

یہ بادشاہ صلاح الدین ایوبی کے خاندان میں بہت بڑا عالم محدث و فقیہ حنفی تھا۔ نیز اسی زمانہ میں علامہ سبط بن الجوزی نے بھی اپنی کتاب الانتصار لامام ائمۃ الامصار میں تاریخ خطیب کی ان روایات و ہفوات کی اچھی طرح قلعی کھولی ہے۔ پھر ابوالموید خوارزمی نے جامع مسانید الامام کے مقدمہ میں اس کا پوری طرح رد کیا ہے اور حال ہی میں علامہ مصر شیخ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ علیہ نے (جن کا ابھی دو سال ہوئے انتقال ہو گیا ہے) اپنی کتاب تانیب الخطیب فی ماساقہ ترجمہ ابی حنیفہ من الاکاذیب میں ثابت کر دیا ہے کہ خطیب نے جن راویوں کو خود ہی کذاب اور وضاع قرار دیا ہے ان ہی کے واسطہ سے اس کتاب میں امام ابوحنیفہؒ کی شان میں غلط اور جھوٹ باتیں روایت کر کے اپنی تاریخ کو داغدار کر دیا ہے۔ عاقل کے لئے اتنا اشارہ کافی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ نمبروں میں طلوع اسلام اور اس کی جماعت کی غلط بیانیوں کا پردہ اچھی طرح چاک کیا جائے گا۔

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ

ضروری نوٹ:۔ قسط نمبر ۱۸ کے بعد مزید کوئی قسط شائع ہوئی یا نہیں؟ یہ بات بھی قابل تحقیق ہے۔ سنا ہے کہ اس کے بعد حضرتؒ کو لکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

منکرین حدیث کے رد میں

﴿خطیب بغدادی اور منکرین حدیث﴾

از مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

الصدیق کے مدح صحابہ نمبر میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں منکرین حدیث کی ہرزہ سرائیوں کا اجمالی جواب مذکور ہو چکا ہے۔ اب اجمالی جواب کے بعد کسی عاقل کے لئے تو تفصیلی جواب کی ضرورت باقی نہیں رہتی مگر عوام کی تسلی کے لئے میں طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۳ھ کے ایک مقالہ پر جس کا عنوان ''مقام حدیث امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نظر میں'' ہے۔ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ (مولف)

الف:۔ طلوع اسلام نے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظم نے تدوین فقہ میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی ہے۔ یہ محض افتراء ہے امام صاحب سے زیادہ حدیث کا اتباع کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک کتاب اللہ کے بعد حدیث حتی کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے ضعیف حدیث بھی حجت ہے جو چند طرق سے مروی ہو۔ قول صحابی بھی قیاس سے مقدم ہے۔ امام صاحب کا یہ قول عام و خاص ہر طبقہ کے علماء میں مشہور ہے کہ

کان ابو حنیفة یقول ما جاء نا عن اللّٰه و رسوله قبلناه علی الرأس و العین وما جاء نا عن الصحابة اخترنا احسنه ولم نخرج عن اقاویلهم وما جاء نا عن التابعین فهم رجال ونحن رجال وقال ایضاً من کان من الائمة التابعین افتی فی زمن الصحابة وزاحمهم فی الفتوی وسوّغ واله الاجتهاد فانا اقلده مثل شریح و مسروق و

علقمة من مقدمة البخاری و اعلاء السنن نقلا من کتب الاصول للحنفیه کالتوضیح وغیرہ. ٥

''ہمارے پاس جو کچھ اللہ کے پاس سے آیا ہے (قرآن) اور اس کے رسول کے پاس سے آیا ہے (حدیث) ہم اس کو سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کرتے ہیں اور جو کچھ صحابہ کی باتیں آئی ہیں ہم ان میں سے بہتر کو لے لیتے ہیں (اور سب ہی بہترین ہیں) اور ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتے اور جو باتیں تابعین سے آتی ہیں تو وہ بھی آدمی ہیں۔ ہم بھی آدمی ہیں۔ نیز یہ بھی فرماتے تھے کہ آئمہ تابعین میں سے جو حضرات صحابہ کے زمانہ میں فتوٰی دیتے تھے اور صحابہ کے فتاوٰی سے مزاحمت کرتے تھے اور صحابہ نے ان کو اجتہاد کا اہل قرار دیا تھا میں ان کی بھی تقلید کرتا ہوں جیسے قاضی شریح اور مسروق وعلقمہ ۱۲۔''

٥ قال ابن حزم جمیع الحنفیه مجتمعون علی ان مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عنده اولیٰ من الرأی فتامل هذا الاعتناء العظیم بالا حادیث و جلالتها و موقعها عندهٗ من الخیرات الحسان (ص ۸۷) وقال علی القاری فی المرقاة ان مذهبهم القوی تقدیم الحدیث الضعیف علی القیاس المجرد الذی یحتمل التزییف ٥ (ص ۳ ج ۱)

''ابن حزم کہتے ہیں کہ سب حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک رائے سے مقدم ہے۔ حدیث کے اس قدر اہتمام اور اس کی عظمت وجلالت کو دیکھو جو اس امام کے نزدیک تھی (خیرات حسان) علی قاری مرقاۃ میں

فرماتے ہیں۔ حنفیہ کا مذہب قوی یہ ہے کہ ضعیف حدیث اس تنہا قیاس پر مقدم ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے۔'' (مرقاۃ)

○ وقال ابن القيم في اعلام الموقعين واصحاب ابي حنيفة مجتمعتون على ان مذهب ابي حنيفة ان ضعيف الحديث عنده اولى من القياس والرأى وعلى ذلك بني مذهبه كما قدم حديث القهقة مع ضعفه على القياس والرأى وقدم حديث الوضوء بنبيذ التمر في السفر مع ضعفه على الرأى والقياس و منع قطع السارق بسرقة اقل من عشرة دراهم والحديث فيه ضعيف الى ان قال وليس المراد بالضعيف في اصطلاح السلف هو الضعيف في اصطلاح المتأخرين بل مايسميه المتاخرون حسنا (لغيره اذا تأيد بالشواهدو نحوها) قد سميه المقتدمون ضعيفا كما تقدم بيانه اھ ※ (ج ا ص ۲۷)

''ابن القیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں امام ابوحنیفہ کے اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس ورائے سے مقدم ہے۔ اسی قاعدہ پر ان کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ چنانچہ انہوں نے حدیث قہقہہ کو باوجود ضعف کے رائے اور قیاس پر مقدم کیا (امام صاحب کے نزدیک نماز میں قہقہہ سے نماز کے ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے) اسی طرح نبیذ تمر سے سفر میں وضو کو جائز کہتے ہیں یہاں بھی ضعیف حدیث کو رائے اور قیاس پر مقدم کیا۔ اسی طرح دس درہم سے کم قیمت کا مال چوری کرنے سے ہاتھ کاٹنے کو منع کرتے ہیں۔ یہاں بھی ضعیف حدیث کو رائے پر مقدم کیا مگر سلف کی اصطلاح میں ضعیف سے وہ

مراد نہیں جس کو متاخرین ضعیف کہتے ہیں بلکہ جس کو متاخرین حسن (لغیرہ) کہتے ہیں اس کو متقدمین ضعیف کہتے ہیں۔''

﴿وقال ایضاً ان لم یخالف الصحابی صحابی آخر فاما ان یشتھر قولہ فی الصحابة اولا یشتھر فان اشتھر فالذی علیہ جماھیر الطوائف من الفقھاء انہ اجماع وحجة و ان لم یشتھر قولہ اولم یعلم ھل اشتھر ام لا فاختلف الناس ھل یکون حجة ام لافا لذی علیہ جمھور الامة انہ حجة ھذا قول جمھور الحنفیة صرح بہ محمد ابن الحسن و ذکر عن ابی حنیفة نصاً وھو مذھب مالک و اصحابہ وھو منصوص الامام احمد فی غیر موضع عنہ و اختیار جمھورا صحابہ وھو منصوص الشافعی فی القدیم والجدید اھ﴾

''نیز اعلام الموقعین میں ہے اگر کسی صحابی (کے قول) کی مخالفت دوسرے صحابہ نے نہ کی ہو۔ تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ قول صحابہ میں مشہور ہو گیا تھا یا مشہور نہیں ہوا، اگر مشہور ہو گیا ہے تو فقہا کی سب جماعتوں کا مذہب ہے کہ ایسا قول حجت ہے اور اجماع ہے۔ اور اگر مشہور نہیں ہوا یا ہم کو خبر نہیں کہ مشہور ہوا یا نہیں اس میں اختلاف ہے کہ ایسا قول حجت ہے یا نہیں؟ سو جمہور امت کا قول یہ ہے کہ یہ بھی حجت ہے۔ جمہور حنفیہ کا یہی مذہب ہے۔ امام محمد نے اس کی تصریح کی ہے اور امام ابوحنیفہ سے واضح طور پر اس کو روایت کیا ہے یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔ اسی کی امام احمد نے مختلف مقامات میں اور امام شافعی نے قدیم و جدید کتابوں میں تصریح کی ہے۔'' (اھ ص ۲۱۴ ج ۲)

علامہ ذہبی نے امام ابوحنیفہ کو اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ جن کے اجتہاد و رائے کی طرف حدیث کی تصحیح وتضعیف میں رجوع کیا جاتا ہے۔ ابن خلدون مؤرخ لکھتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا فن حدیث میں بڑا مجتہد ہونا اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ امت کو ان کے مذہب پر اعتماد اور بھروسہ ہے۔ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں یحییٰ بن آدم کا قول نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اپنے شہر کی تمام حدیثیں جمع کرلی تھیں۔ ان میں اول سے آخر تک خوب نظر کی تھی۔ خطیب نے اسرائیل میں یونس سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ بڑے ہی اچھے تھے۔ ان احادیث کے بڑے حافظ تھے جن میں احکام کا ذکر ہے اور ایسی حدیثوں کو بہت تلاش کرتے اور ان کے فقہی احکام کو خوب جانتے تھے۔ یحییٰ بن معین (امام اہل نقد) کا قول ہے کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جسے وکیع پر ترجیح دوں اور وہ امام ابوحنیفہ کی رائے پرفتویٰ دیتے اور ان کی سب حدیثوں کے حافظ تھے ابوحنیفہؒ سے انہوں نے بہت حدیثیں سنیں تھیں۔ یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا کیا ابوحنیفہؒ سے حدیث سنی جائے؟ کیا وہ ثقہ ہیں میں نے کسی کو انہیں ضعیف کہتے نہیں سنا۔ یہ شعبہ ابن الحجاج ان کو لکھتے ہیں کہ میرے حکم سے حدیث کا درس دو اور شعبہ تو شعبہ ہی ہیں (جن کا لقب امیر المومنین فی الحدیث ہے یعنی حدیث کے بادشاہ) محمد بن سماعہ کا قول ہے کہ امام نے اپنی تصانیف میں (یعنی ان مسائل میں جو شاگردوں کو لکھوائے تھے) ستر ہزار سے اوپر حدیثیں بیان کی ہیں اور کتاب الاثار کو چالیس ہزار احادیث میں سے انتخاب کیا ہے۔ اھ

امام صاحب کے املا کردہ مسائل کا یہ مجموعہ تو اب ناپید ہوگیا مگر امام محمد کی ظاہر روایت اور نوادر اور امام ابو یوسف کی امالی و کتاب الخراج اور کتب ابن المبارک وغیرہ سے ان مسائل کا انتخاب کیا جائے جو حدیث و آثار کے موافق ہیں خواہ صراحۃً ہوں یا دلالۃً تو امید ہے کہ ستر ہزار کے اوپر ہی ہوں گے اور اتنی بڑی مقدار کا حدیث کے موافق ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امام صاحب نے ان احادیث کو روایت کیا ہو۔

عقود الجمان

یہ تو وہ احادیث ہیں جن کو امام صاحب نے فقیہانہ طرز پر اپنے جوابات میں بطور فتویٰ کے بیان فرمایا ہے اس کے بعد ان احادیث کا جائزہ لیا جائے جو آپ نے محدثانہ طریقہ پر روایت کی ہیں تو حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اکابر حفاظ حدیث میں بڑے درجہ کے لوگوں میں تھے۔ اگر ان کو حدیث کا اس قدر اہتمام نہ ہوتا تو اس کثرت سے مسائل فقہیہ کا استنباط ممکن نہ تھا۔

مسانید الانام

اس کے بعد انہوں نے بہت سی روایات بیان کیں جن سے امام ابو حنیفہ کے پاس احادیث کا بڑا ذخیرہ جمع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے امام صاحب کے سترہ مسانید کی سندات بڑی تفصیل سے بیان کیں جو ان مسانید کے جمع کرنے والوں تک پہنچتی ہیں۔ جن کے اسما گرامی یہ ہیں۔ حماد بن ابی حنیفہ۔ امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن، حسن بن زیاد بولوی، حافظ ابو محمد حارثی، حافظ ابن ابی العوام، حافظ طلحہ بن محمد (العدل)، حافظ ابن المظفر ، حافظ ابن عدی، حافظ ابو نعیم اصبہانی، عمر بن الحسن اشنانی، ابو بکر کلاعی، ابو بکر بن المقری، حافظ ابن خسرو، ابو علی البکری پھر فرماتے ہیں کہ ہم ان مسانید کو اجازۃً حافظ خیر الدین الری کے طریق سے محمد بن سراج عمر حانوتی سے روایت کرتے ہیں حافظ شمس بن لمولون نے بھی ان سترہ مسانید کی سندیں فہرست اوسط میں بیان کی ہیں۔ بلکہ خطیب بھی جب دمشق گئے اپنے ساتھ دارقطنی کا مسند ابی حنیفہ لے گئے تھے اور مسند ابی حنیفہ لابن شاہین بھی ہمراہ تھا اور ایک مسند ابی حنیفہ خود خطیب نے بھی لکھا ہے یہ ان سترہ مسانید کے علاوہ ہیں۔ جن کا ذکر عقود الجمان میں ہے۔

ابن عقدہ

اور علامہ بدر الدین عینی نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ حافظ ابن عقدہ

نے جو مسند ابی حنیفہ جمع کیا ہے وہ تنہا ایک ہزار احادیث سے زائد پر مشتمل ہے یہ بھی مسانید مذکورہ کے علاوہ ہے۔ حافظ سیوطی نے تعقبات اعلی الموضوعات) میں فرمایا ہے کہ ابن عقدہ حفاظ حدیث میں بڑے درجہ پر ہے لوگوں نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ متعصب کے سوا کسی نے اس کو ضعیف نہیں کہا۔ اھ

(امام محمدؒ وابو یوسف کے علاوہ) امام زفرؒ کی بھی ایک کتاب الآثار ہے جس میں وہ کثرت سے امام صاحب کی احادیث روایت کرتے ہیں اور حدیث میں امام زفرؒ کے دو نسخوں کا تذکرہ حاکم کی علوم الحدیث میں بھی موجود ہے (یہ کتاب الآثار کے علاوہ ہیں) ان مسانید وآثار کے سوا امام محمد کی موطا اور کتاب الحج اور امام ابو یوسف کی امالی اور کتاب الرد علی سیر الاوزاعی اور کتاب اختلاف ابن لیلی وابی حنیفہ۔ اور مسند وکیع بن الجراح اور کتب ابن المبارک اور کتب حسن بن زیاد اور مصنف ابن ابی شیبہ ومصنف عبدالرزاق اور مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان وثقات ابن حبان اور سنن کبری بیہقی اور کتب دارقطنی اور معاجم ثلثہ طبرانی اور جامع سفیان اور سنن کبری للنسائی وغیرہ کتب احادیث سے امام صاحب کی حدیثوں کو جمع کیا جائے تو بڑی ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس کے باوجود بھی جو بعض محدثین نے امام صاحب کو قلیل الحدیث کہا ہے (کہ ان کی حدیثیں کم ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عام محدثین کی طرح حدثنا واخبرنا کہہ کر ہر باب کی ہزاروں حدیثیں بیان کرتے تھے نہ ان کی طرح درس حدیث کا ایسا حلقہ جماتے جس میں ہر کس و ناکس جلاہا۔ تیلی۔ موچی۔ بزار۔ حلاق وحجام اور ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو کر حدیث سنا کریں بلکہ وہ صرف فقہ حاصل کرنے والے مخصوص علماء کے سامنے احادیث احکام وآثار احکام بیان کرتے اور ان سے مسائل کا استنباط کرتے اور استنباط کا طریقہ بتلاتے تھے۔ چنانچہ امام شافعی اور امام مالک سے بھی عام محدثین کی طرح زیادہ حدیثیں روایت نہیں کی گئیں۔

ب۔ طلوع اسلام میں دوسرا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ احادیث کو ناقابل تبدیل نہیں سمجھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر سختی سے رد کر دیا کرتے تھے۔ پھر سفیان بن عیینہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ کسی کو اللہ پر جرأت کرنے والا نہیں

دیکھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لئے مثالیں گھڑتے اور ان کو رد کر دیا کرتے تھے ان کو معلوم ہوا کہ میں یہ حدیث روایت کرتا ہوں البیعان بالخیار مالم یتفرقا ابوحنیفہ کہنے لگے ذرا بتلاؤ تو سہی اگر دونوں کسی ایک کشتی میں سفر کر رہے ہوں۔" الخ اس روایت سے یہ اخذ کرنا کہ امام صاحب احادیث کو نا قابل تبدیل نہیں جانتے تھے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کا مصداق ہے۔ اس کے کس نقطہ سے یہ مفہوم پیدا کیا گیا......؟ رہا سفیان بن عیینہ کی طرف یہ قول منسوب کرنا کہ امام صاحب حدیث کو رد کر دیتے تھے۔ سو یہ سفیان بن عیینہ وہی ہیں جو فرماتے ہیں۔

﴿اول من اقعدنی للحدیث و فی روایة اول من صیرنی مُحدّثا ابو حنیفة قدمت الکوفة فقال ابو حنیفة ان هذا اعلم الناس بحدیث عمرو بن دینار فاجتمعوا علی فحدثتهم﴾

(ترجمہ) "مجھے سب سے پہلے جس شخص نے درس حدیث کے لئے بٹھلایا۔ ایک روایت میں یہ کہ جس نے سب سے پہلے مجھے محدث بنایا وہ ابوحنیفہ ہیں کیونکہ میں جب کوفہ پہنچا تو ابوحنیفہ نے فرمایا یہ شخص عمرو بن دینار کی حدیثوں کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اس بات کے سنتے ہی لوگ میرے پاس جمع ہو گئے اور میں نے ان سے حدیث بیان کی۔" (خطیب)

جس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب فقط محدث ہی نہیں بلکہ محدث گر بھی تھے۔ جس کی تعریف کر دیتے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے سفیان بن عیینہ امام صاحب کے شاگرد ہیں مسانید ابی حنیفہ میں امام صاحب سے ان کی روایات موجود ہیں۔ بالخصوص مسند حارثی میں سب سے زیادہ ہیں (ابن ابی العوام ابن عبد البر ملاحظہ ہو تانیب الخطیب للکوثری ص ۱۵۵) اس لئے تاریخ بغداد کی یہ روایات ہرگز قابل اعتبار نہیں اس کی سند میں ابراہیم بن بشار رمادی دھرا ہوا ہے۔ جس کے متعلق ابن ابی حاتم نے امام احمد کا یہ قول

نقل کیا ہے کہ یہ شخص ہمارے ساتھ سفیان کے درس میں آتا تھا۔ پھر لوگوں کو وہ حدیثیں املا کراتا تھا جو سفیان سے سنی گئی تھیں۔ تو بعض دفعہ ایسی باتیں بھی املا کرا دیتا جو لوگوں نے نہیں سنی تھیں میں نے اس سے کہا تو خدا سے نہیں ڈرتا ایسی باتیں لکھواتا ہے جو لوگوں نے سفیان سے نہیں سنیں اور اس کی بہت سخت مذمت کی اھ۔ تو جو شخص حدیث رسول میں زیادتی کرنے سے بھی نہیں ڈرتا وہ ابوحنیفہ اور سفیان کی باتوں میں کیا خاک احتیاط کرے گا؟ ص ۸۲۔ پھر اس مسئلہ میں امام صاحب نے حدیث کو رد کب کیا ہے؟ ان کے نزدیک اس میں تفرق سے مراد تفرق بالا بدان نہیں بلکہ تفرق بالا قوال ہے شافعیہ نے تفرق بالا بدان مراد لیا ہے۔ حدیث کو سب مانتے ہیں تفسیر میں اختلاف ہے اہل علم اس امر سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر اس کا نام حدیث کو رد کرنا ہے تو امام ابوحنیفہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ تفرق بالقول مراد لیتے ہیں وہی اس حدیث کو رد کرتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس قرآن و حدیث سے بہت دلائل موجود ہیں جو ہماری تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ پھر اس حدیث کا جو مطلب امام صاحب نے سمجھا ہے امام سفیان ثوریؒ اور امام مالکؒ نے بھی وہی سمجھا ہے (ملاحظہ ہو ترمذی وغیرہ) امام ابوحنیفہ اس مسئلہ میں تنہا نہیں ہیں۔ فقہاء کوفہ و اہل مدینہ ان کے ساتھ ہیں۔ تو یہ الزام سب پر عائد کرنا چاہیے۔

اس عنوان کے تحت طلوع اسلام نے مفضل بن موسیٰ سنیانی (فضل لکھنا چاہیے) کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس نے ابوحنیفہ کو کہتے سنا ہے کہ میرے اصحاب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دو قلے پیشاب کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو کہ پانی اگر دو قلے ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا'' رد کرتے ہوئے ایسا فرمایا تھا''

امام ابوحنیفہ کا وقار و متانت اور نزاہت لسان اور تہذیب مشہور و معروف ہے ایسے گندے الفاظ ان کی زبان پر ہرگز نہیں آ سکتے۔ طلوع اسلام کو شرمانا چاہیے کہ وہ ایسی مہمل خرافات سے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ جن کو امام تو امام کسی معمولی درجہ کے عالم کے لئے بھی کوئی سننا گوارا نہیں کر سکتا۔

ابن دوما۔ ابار۔ ابن سلم۔ ابوعمار مروزی

اس حکایت کی سند میں ابن دوما، ابن سلم، ابار، ابوعمار مروزی رکھے ہوئے ہیں ابن دوما کے متعلق خود خطیب نے جرح کی ہے کہ وہ تزدیر کرتا ہے، اس نے خود ہی اپنے کو برباد کر دیا ہے کہ جن روایات کا سماع اسے حاصل نہیں ہوا ان کو بھی اپنی مسموعات میں داخل کر دیتا ہے۔ اھ۔ ایسے مزور کی روایت ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ تانیب ص ۴۶ ابن سلم احمد بن جعفر ختلی سخت متعصب عقل کا اندھا ہے ص ۲۲۔ احمد بن علی ابار ان راویوں میں سے ہے جن کو دعلج سوداگر وظیفے دیا کرتا تھا۔ تا کہ ایسی روایتیں جمع کریں جو اصول و فروع میں اس کے مخالفوں کو زخم پہنچائیں۔ تو ابار کا قلم بھاڑے کا ٹٹو ہے۔ ائمہ اہل حق کے متعلق بڑا منہ پھٹ۔ بد زبان ہے۔ تاریخ خطیب میں امام صاحب کے مثالب و معائب اکثر اس کے حوالے سے ہیں جن سے اس کا تعصب اور امام ابوحنیفہ سے عداوت صاف ظاہر ہے اور دشمن کی شہادت کسی کے نزدیک بھی معتبر نہیں۔ پھر ابار ہمیشہ امام کی شان میں اس قسم کی خرافات مجہول راویوں اور جھوٹوں ہی سے نقل کرتا ہے چنانچہ یہاں بھی اس کا شیخ ابوعمار مروزی کثیر الاغراب ہے۔ جو اکثر ایسی باتیں روایت کرتا ہے کہ جو کوئی بیان نہیں کرتا خطیب کی تاریخ میں امام صاحب کے مثالب اس قسم کے راویوں سے منقول ہیں تا کہ عند اللہ وعند الناس خطیب یا بعد کو اس کی تاریخ میں اضافہ کرنے والے اچھی طرح رسوا ہو جائیں اس روایت میں جو الفاظ امام صاحب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان کی زبان سے کبھی نہیں نکل سکتے یقیناً یہ ابن دوما یا ابن سلم یا ابار کی منگھڑت ہے۔

حدیث القلتین

وہی حدیث قلتین تو دوسری صدی ہجری سے پہلے فقہاء میں سے کسی نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا کیونکہ اس میں سخت اضطراب ہے۔ بجز چند تساہلین کے کسی نے اس کو صحیح نہیں مانا پھر صحیح کہنے والے بھی اس پر عمل کیسے کر سکتے ہیں؟ جبکہ قلتین کی مقدار کسی دلیل سے متعین نہیں کی جا سکتی؟ اس لئے علامہ ابن دقیق العید مالکی ثم الشافعی نے شرح

عمدۃ الاحکام میں اقرار کیا ہے کہ حنفیہ کی دلیل جو ماء راکد کے متعلق صحیح میں وارد ہے۔ بہت قوی ہے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس سے وضو یا غسل نہ کرو۔ حضورؐ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں نجاست گرنے کے بعد اس سے مطلقاً وضو اور غسل کو منع فرمایا ہے۔ دو قلہ کی قید نہیں اور یہ حدیث باتفاق محدثین صحیح ہے اسی کو امام نے اختیار کیا ہے۔

ج۔ طلوع اسلام میں تیسرا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے کہ "امام اعظم نے چار سو سے زیادہ احادیث کو رد کیا"۔ پھر یوسف بن اسباط کا قول نقل کیا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چار سو بلکہ چار سو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے پھر جب یوسف سے ان احادیث کو دریافت کیا گیا تو صرف چار حدیثیں بیان کیں۔ الخ

اگر ادارہ طلوع اسلام میں کوئی پڑھا لکھا سمجھدار ہوتا تو اسی سے اس روایت کے غلط ہونے کا اندازہ کر لیتا کہ چار سو کا دعویٰ کرنے والا چار ہی حدیثیں بیان کر رہا ہے اگر پوری نہیں تو آدھی ہی بیان کر دیتا۔ کیا اس کے نزدیک یہ چار ہی چار سو کے برابر ہیں؟ پھر جس نے باقاعدہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ امام صاحبؒ نے ان چار احادیث کو بھی رد نہیں کیا بلکہ ان کا مطلب وہ بیان کیا ہے جو اہل ظاہر محدثین نہیں سمجھے۔

حدیث البیعان بالخیار مالم یتفرقا

چنانچہ ان میں ایک تو وہی حدیث البیعان بالخیار مالم یتفرقا ہے کہ جب تک خرید و فروخت کرنے والے جدا نہ ہوں ان کو اختیار رہتا ہے ہم بتلا چکے ہیں کہ امام صاحبؒ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ تفرق سے تفرق بالقول مراد لیا ہے نہ کہ تفرق بالابدان' حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تک بائع اور مشتری کی باتیں ختم نہ ہوں یعنی ایجاب و قبول تمام نہ ہو اس وقت تک ہر ایک کو اپنی بات کے واپس لینے کا اختیار ہے۔ ایجاب و قبول ختم ہو جانے کے بعد یہ اختیار نہیں رہتا مگر جب کہ ان میں سے ایک نے

خیار کی شرط کرلی ہو جیسا اس حدیث کے دوسرے طرق میں الا ان یکون بیع خیار کی قید موجود ہے اور تفرق کا اطلاق تفرق بالقول پر بکثرت وارد ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلاَ تَفَرَّقُوْا. وَمَاتَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِمَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ط وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ﴾

اور چونکہ آیت قرآنیہ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ بتلا رہی ہے کہ رضا مندی کے ساتھ ایجاب وقبول کے بعد (کہ تجارت کا مفہوم لغت میں یہی ہے) بائع و مشتری میں سے ہر ایک کو بیع وثمن میں تصرف کرنے کا حق ہے اس حق کو مجلس سے علیحدگی پر موقوف کرنا نص پر زیادتی کرنا ہے جو خبر واحد سے امام صاحبؒ کے اصول پر درست نہیں اس لئے لفظ تفرق کو حدیث میں تفرق بالاقوال پر محمول کرنا چاہیے اور اگر تفرق بالابدان ہی مراد لیا جائے تو اس کو استحباب پر محمول کیا جائے گا جیسا راوی حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول 'کانت السنة ان المتبایعین بالخیار مالم یتفرقا (رواہ البخاری) اس پر دال ہے۔

حدیث للفارس سہمان وللرجل سہم

اسی طرح دوسری حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑے کے دو حصے اور پیادہ آدمی کا ایک حصہ ہے (ترجمہ طلوع اسلام نے غلط کیا ہے صرف آدمی لکھنا چاہیے) مگر ابو حنیفہ کہتے ہیں میں جانور کا حصہ مومن کے حصہ سے زیادہ نہیں کرسکتا۔'' (طلوع اسلام)

اس کو بھی امام صاحبؒ نے رد نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں راویوں نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے ان ہی الفاظ سے روایت کیا ہے للفرس سهمان وللرجل سهم وفی روایة والصاحبه سهم گھوڑے کے دو حصے اور آدمی کا ایک۔ دوسری روایت میں ہے گھوڑے کے مالک کا ایک حصہ ہے اور بعض نے ان لفظوں سے روایت کیا ہے للفارس سهمان وللراجل سهم گھوڑے سوار کے دو

حصے ہیں اور پیادہ کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ مجمع بن جاریہؓ سے سنن ابی داؤد میں ان ہی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے اور قاعدہ ہے کہ جب کسی حدیث کے الفاظ میں راوی اختلاف کریں تو دلیل سے ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے گی۔ امام صاحبؒ کے نزدیک مجمع بن جاریہؓ کی روایت کو ترجیح ہے کہ گھوڑے سوار کو مال غنیمت سے دو حصے دیے جائیں گے اور پیادہ کو ایک سوار کو تین حصے نہیں دیئے جائیں گے اور جس حدیث سے سوار کے تین حصے معلوم ہوتے ہیں اس میں یا تو راوی کو وہم ہوا ہے کہ فرس کو فرس اور رَجل کو رجُل پڑھ لیا یا اس کو تنفیل پر محمول کیا جائے گا کہ کسی وقت بطور انعام کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواروں کو بجائے دو حصے کے تین حصے دیدیے اور تنفیل قانون عام نہیں بلکہ امام کی رائے پر ہے۔ اگر کسی وقت مصلحت ہو ایسا بھی کرسکتا ہے۔

حدیث اشعار الهدی

رہی تیسری حدیث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے اصحاب نے برابر قربانی کے جانوروں پر نیزہ مار کر نشان لگایا ہے (یہاں بھی طلوع اسلام نے ترجمہ غلط کیا ہے ہدی کے جانوروں پر لکھنا چاہیے) مگر ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جاندار کی صورت کو بگاڑنا ہے۔'' (طلوع اسلام)

تو یہ تنہا امام صاحبؒ کا قول نہیں بلکہ ابراہیم نخعی کا قول ہے جو حماد کے واسطہ سے وہ روایت کرتے ہیں جیسا ترمذی نے اس پر اشارہ کیا ہے اور ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اشعار مطلقاً منع ہے بلکہ وہ اپنے زمانہ کے جاہلوں کے اشعار کو مثلہ کہتے تھے۔ جس میں مبالغہ کے ساتھ جانوروں کے کوہان پر نیزہ مارا جاتا تھا جس سے گہرا زخم ہو جاتا اور جانور کو بہت تکلیف ہوتی تھی اور جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ نے اشعار کیا ہے کہ صرف کوہان کو ذرا سا چیر دیا جاتا گوشت تک زخم نہ پہنچتا تھا۔ اس کو نہ ابراہیم نخعی نے مثلہ کہا نہ امام صاحبؒ نے۔ علامہ طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس کی تصریح کی ہے اور وہ مذہب حنفیہ کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

حدیث الاقراع بین النساء عند السفر

رہی چوتھی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تشریف لے جاتے تو اپنے ہمراہ لے جانے کے لئے ازواج مطہراتؓ میں قرعہ اندازی کیا کرتے تھے مگر ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قرعہ اندازی خالص قمار اور جوا ہے (طلوع اسلام) (لفظ خالص کس لفظ کا ترجمہ ہے مدیر طلوع اسلام کو بتلانا چاہیے)۔

یہاں بھی یہ دعویٰ غلط ہے کہ امام صاحبؒ نے حدیث کو رد کیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں قرعہ اندازی کرنا امام صاحبؒ کے نزدیک بھی مستحب ہے کتب حنفیہ میں اس کی تصریح ہے۔ متون و شروح سب اس پر متفق ہیں۔ امام صاحبؒ بس یہ فرماتے ہیں کہ جس صورت میں حدیث سے قرعہ اندازی ثابت ہے اسی پر اکتفا کرنا چاہیے اس سے آگے نہ بڑھنا چاہیے قرعہ اندازی سے کسی حق ثابت کو باطل نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جہاں کسی کا حق ثابت نہ ہو وہاں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کیلئے بطور تطییب قلب کے اس سے کام لے سکتے ہیں جیسا حدیث میں ہے کیونکہ سفر میں شوہر پر قسم واجب نہیں رہتی کہ ہر بی بی کی باری میں اس کے پاس رات گزارے کیونکہ سفر میں سب بیبیوں کا ساتھ لینا دشوار ہے جب بیویوں کا یہ حق ساقط ہو گیا تو اب کسی ایک کو ساتھ لے جانا جائز ہے اور قرعہ اندازی سے ایک کا انتخاب کرنا بہتر ہے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تاکہ کسی بیوی کو ترجیح بلا مرجح کا خیال پیدا نہ ہو لیکن قرعہ اندازی سے حق غیر ثابت کو ثابت کرنا یا حق ثابت کو باطل کرنا حدیث سے تجاوز کرنا ہے اس لئے امام صاحب ہر جگہ قرعہ اندازی کے قائل نہیں ہیں۔ کیا اسی کا نام حدیث کو رد کرنا ہے؟ اسی سے بقیہ تین سو چھیانوے حدیثوں کا اندازہ لگایا جائے کہ وہاں بھی راوی کی فہم کا قصور ہوا ہے ورنہ امام صاحب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی حدیث کو رد کریں؟ معاذ اللہ۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں امامؒ صاحب کے اقوال

امام صاحبؒ کا یہ قول مشہور ہے

﴿ کل شیٔ تکلم النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم سمعناہ اولم نسمعه فعلی الرأس والعین قدآمنا به ونشهدانه کما قال النبی صلی اللہ علیه وسلم وقال ایضاً لعن اللّٰہ من یخالف رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم به اکرمنا اللّٰہ به استنقذنا ﴾

(ملاحظہ ہو کتاب العالم والمتعلم لابی حنیفة وکتاب الانتقاء لابن عبدالبرؒ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی فرمایا ہے (بشرطیکہ آپؐ کا فرمانا ثابت ہو جائے) وہ ہمارے سرآنکھوں پر ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ جیسا آپؐ نے فرمایا ہے وہی (حق) ہے۔'' نیز فرماتے ہیں ''خدا لعنت کرے اس شخص پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (حدیث کی) مخالفت کرتا ہے۔ آپؐ ہی کے وسیلہ سے تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو عزت دی اور آپؐ ہی کے ذریعہ ہم کو (گمراہی سے) بچایا اور نجات دی۔''

نیز فرمایا کہ کسی شخص کی حدیث کو رد کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کے خلاف بات منسوب کرتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کرنا یا (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو جھٹلانا نہیں ہے بلکہ اس شخص کی بات کو رد کرنا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات کو منسوب کر رہا ہے۔

اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ امام صاحب پر یا کسی مجتہد پر ان تمام حدیثوں کا ماننا ضروری ہے۔ جو راویان حدیث ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں روایت کرتے ہیں جب تک راویوں کی عدالت و امانت کو اچھی طرح نہ جانچ لیا جاوے اور باہم تمام روایات میں موازنہ کر کے راجح و مرجوح میں تمیز نہ کر لی جائے۔ اگر یوں ہی ہر روایت کو مان لیا جائے تو دین ضائع ہو جائے اور بیوقوفوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جائے گا۔ جو لوگ حدیث کو دینی حجت سمجھتے ہیں ان کے یہاں حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے کے لئے اصول مقرر

ہیں جو حدیث ان اصول پر پوری اترے گی وہی حجت ہے ہر حدیث کو کسی نے حجت نہیں کہا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ بعض حدیثیں کمزور اور بے دین لوگ بھی روایت کرتے ہیں جو ضعیف یا موضوع کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔

اس تحقیق کے بعد ہم اس روایت کے رایوں کی بھی جانچ کرنا چاہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے چار سو حدیثیں رد کی ہیں اس کی سند میں ایک تو عمر بن فیاض ہے جس کو کسی نے ثقہ نہیں کہا دوسرا ابوطلبہ الوساوی ہے۔ اس میں بھی محدثین نے جرح کی ہے تو اس کے وساوس قابل التفات نہیں۔ تیسرا عبداللہ بن خبیق ہے جو قراءت کے سوا اور کسی روایت کے قابل نہیں، چوتھا ابوصالح فرار ہے۔ محدثین نے کہا ہے کہ بغیر کتاب کے وہ جو کچھ کہے قابل التفات نہیں۔ پانچواں یوسف بن اسباط ہے۔ یہ مغفل زاہد ہے جس نے اپنی کتابوں کو دفن کر دیا تھا۔ اور حافظہ خراب ہونے کی وجہ سے گڑبڑ روایتیں بیان کرنے لگا محدثین کا فیصلہ ہے کہ اس کی کوئی روایت حجت نہیں۔ (تانیب ص ۱۷۔ ۸۵) یہ تو اس روایت کی سند کا حال ہے اور تین کے بارہ میں ہم بتلا چکے ہیں کہ امام صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بات کو بھی رد نہیں کیا البتہ ان مغفلین کی باتوں کو رد کیا ہے جو اپنی طرف سے حدیث کا مطلب متعین کر کے مجتہد کی تشریح و تفسیر کو رد حدیث پر محمول کرتے ہیں۔

طلوع اسلام میں اسی عنوان کے تحت ابوسائب کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ میں نے وکیع کو کہتے سنا کہ ہم نے ابوحنیفہ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا ہے۔

سبحان اللہ یا تو امام صاحب کو چار سو حدیثوں کے رد کرنے کا الزام دیا جا رہا تھا۔ یا اب چار سو سے اتر کر دو سو کی تعداد رہ گئی۔ مگر چار سو کا دعویٰ کرنے والے نے چار حدیثوں کا تو پتہ دیا تھا۔ جس کی حقیقت ہم بتلا چکے کہ امام صاحب نے ان میں سے ایک کو بھی رد نہیں کیا۔ محض راوی کی غلط فہمی اور کوتاہ بینی تھی مگر دو سو کا دعویٰ کرنے والے نے ایک دو حدیث کا بھی پتہ نہیں دیا۔

کاش یہ لوگ بھی ابوبکر بن ابی شیبہ کی طرح ان حدیثوں کا پتہ دے دیتے کہ

اس غریب نے تو اپنی مصنف میں ایک خاص باب منعقد کر کے ایک سو پچیس حدیثیں بیان کر دی ہیں جن کی امام ابوحنیفہ نے ان کے خیال میں مخالفت کی تھی۔ اس کا جواب بھی علامہ محمد زاہد کوثری مصریؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ دیدیا ہے۔ ان سے پہلے عقود الجواہر المنیفۃ اور مقدمہ مسانید الامام میں اس کا جواب بھی دیا گیا ہے تو ہم ان دوسو یا چار سو حدیثوں کی بھی حقیقت واضح کر دیتے اور بتلا دیتے کہ ان میں سے بھی امام صاحب نے کسی حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ دوسری احادیث کی بنا پر ان کا مطلب وہ بیان کیا ہے جو ان محدثین نے نہیں سمجھا۔

وکم من عائب قولا صحیحا وآفتہ من الفھم السقیم

بہت سے آدمی سچی بات میں بھی عیب نکال دیا کرتے ہیں مگر یہ ان کی فہم سقیم کی آفت ہوتی ہے پھر غضب یہ ہے کہ امام وکیع کی طرف اس قول کو منسوب کیا گیا ہے کہ امام صاحب نے دوسو حدیثوں کو رد کر دیا۔ حالانکہ خطیب نے خود ہی اپنے شیخ حافظ الصمیر ی کے واسطہ سے بسند صحیح یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے وکیع سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا پھر ان کی تعریف وتوصیف کر کے کہا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان سے بہت حدیثیں سنی تھیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا کہ یحییٰ بن سعید قطان بھی امام ابوحنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے۔ دوری نے بھی یحییٰ بن معین سے اسی طرح روایت کی ہے اھ (ج ۱۳ صفحہ ۵۰۱) اب فرمائیے تاریخ خطیب کی کس روایت کو مانا جائے؟ اور یہ کچھ وکیع ہی کے ساتھ خاص نہیں غضب یہ ہے کہ اسی تاریخ میں امام ابو یوسف اور عبداللہ بن مبارک جیسے خاص شاگردوں سے بھی امام صاحب کی مذمت نقل کر دی گئی ہے۔ ان ظالموں کو جنہوں نے تاریخ خطیب میں یہ خرافات شامل کی ہیں اتنی بھی حیاء شرم نہ تھی کہ جھوٹ ایسا تو بولتے جس کے کچھ سر پاؤں ہوتا مگر وہ تو ایسا صریح جھوٹ بولتے ہیں جس کو ادنیٰ طالب علم بھی باور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح جھوٹوں کو رسوا کیا کرتا ہے۔"

اس کے بعد طلوع اسلام میں عبدالاعلیٰ بن حماد اور مسئول کے واسطہ سے حماد

بن سلمہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں آتی تھیں۔ مگر وہ اپنی رائے سے رد کر دیا کرتے تھے۔ الخ (طلوع اسلام)

علی بن احمد بزاز

مگر پہلی روایت کی سند میں علی بن احمد بزاز ہے جس کے متعلق خود خطیب کو اعتراف ہے کہ اس کا بیٹا اس کی اصل کتابوں میں اضافات کر دیا کرتا تھا۔ اور یہ ان کو بیان کرتا تھا ایسے شخص کی روایت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جا سکتا (تانیب ص ۲۱) اس کے بعد علی بن محمد موصلی ہے اس کے متعلق یعنی بن فیروز کے ترجمہ میں خطیب نے تصریح کی ہے کہ وہ ثقہ نہیں ہے۔

عبداللہ بن احمد

دوسری سند میں عبداللہ بن احمد صاحب کتاب السنۃ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ علم کے کس درجے پر ہے ایسا شخص امام ابو حنیفہ کے متعلق سچ نہیں بول سکتا خصوصاً جبکہ جرح و تعدیل کے بارہ میں اس کا جھوٹ ثابت بھی ہو چکا ہے۔ چنانچہ علی بن حمشاد حافظ ثقہ کا قول ہے کہ مجھ سے احمد بن عبداللہ اصبہانی نے بیان کیا کہ میں ایک دن عبداللہ بن احمد بن حنبل کے پاس گیا تو پوچھا تم کہاں تھے میں نے کہا کہ کریمی کی مجلس میں تھا کہا اس کے پاس نہ جایا کرو وہ تو کذاب ہے۔ پھر ایک دن میں کریمی کی مجلس پر گزرا تو عبداللہ بن احمد کو اس کی روایتیں لکھتا ہوا دیکھا میں نے کہا یہ کیا آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اس کی روایت مت لکھو یہ کذاب ہے کہا چپکے رہو۔ پھر جب فارغ ہو کر وہاں سے اٹھے میں نے پھر سوال کیا تو کہا میں نے تم سے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ مبادا کہیں آج کل نوجوان سند میں ہمارے برابر ہو جائیں۔ (خطیب ص ۴۳۹، ج ۳)

احمد بن عبداللہ اصبہانی

خطیب نے احمد بن عبداللہ اصبہانی کو مجہول کہہ کر اس روایت کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ اس کا تجاہل عارفانہ ہے تاریخ اصفہانی لابی نعیم میں اس کا ترجمہ موجود ہے وہ ابن حمشاد کے ثقات شیوخ میں سے ہے۔

علی بن حمشاد

اور ابن حمشاد جیسا حافظ ثقہ مجاہیل اور قابل اعتماد لوگوں سے روایت نہیں کرسکتا (تانیب ص ۱۵۱) پس عبداللہ بن احمد کو اگر حدیث کے بارہ میں سچا سمجھ لیا جائے تو محدثین کو اختیار ہے مگر جرح وتعدیل کے باب میں اس واقعہ کے بعد اس کو ہرگز ثقہ نہیں کہا جاسکتا۔

مؤمل بن اسمعیل

مؤمل بن اسماعیل بھی اس سند میں ہے۔ جس کے متعلق امام بخاریؒ نے منکر الحدیث کہا ہے اور یہ لفظ امام بخاری اسی شخص کے بارہ میں کہتے ہیں جس کے متعلق دوسرے محدثین کذاب کا صیغہ استعمال کرتے ہیں ابو زرعہ رازی فرماتے ہیں کہ وہ حدیث میں بہت خطا کرتا ہے۔ ایسا شخص جرح وتعدیل کے باب میں اصلا حجت نہیں اور جو حدیث میں بکثرت خطا کرتا ہو وہ حکایات میں بھی ہرگز قابل اعتبار نہیں۔

حماد بن سلمہ

پھر دونوں سندوں کا منتہی حماد بن سلمہ ہے اس کو اس بات کی کیا تمیز کہ حدیث کو لینا اور رد کرنا کس چیز کا نام ہے؟ یہ وہی حضرت ہیں جنہوں نے باب الصفات میں قیامت ڈھائی ہے ایک روایت میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو جوانمرد کی صورت میں دیکھا اس کو تو آئمہ مجتہدین کی شان میں زبان کھولنے کا حق نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ امام صاحب نے اس کی بیان کردہ بعض روایات کو اس لئے رد کر دیا ہو کہ ان کو اس پر اعتماد نہ تھا جیسا امام بخاری کو بھی اس پر اعتماد نہیں۔ اب یہ امام صاحب پر طعن کرنے لگا کہ وہ حدیث کو رائے سے رد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ راوی کے ناقابل اعتماد ہونے کی وجہ سے اس کی روایت کو رد کر رہے تھے۔ حماد سلمہ کا امام بخاری کے نزدیک ناقابل اعتماد ہونا مقدمہ فتح الباری اور مقدمہ اعلاء السنن میں مذکور ہے۔

طلوع اسلام کا اتہام

اس کے بعد طلوع اسلام نے چوتھا عنوان قائم کیا ہے ''انکار حدیث میں امام ابوحنیفہ کا تشدد'' اس عنوان کے تحت طلوع اسلام نے ان کلمات سے اپنے لئے انکار حدیث کا جواز نکالنا چاہا ہے جن کو راویوں نے کفر سمجھ کر روایت کیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ تو امام صاحب کو جہنمی کہتے ہیں۔ جن کو اس زمانہ میں جہنمی کہا جاتا تھا۔ مگر مدیر طلوع اسلام ان کلمات کو کفر نہیں سمجھتا بلکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کر کے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتا ہے حالانکہ ایک جاہل سے جاہل مسلمان بھی ان کلمات کے کفر ہونے میں شبہ نہیں کرسکتا نہ کسی مسلمان کی طرف ان کی نسبت گوارا کرسکتا ہے چہ جائیکہ امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف جن کی امانت وتقدس، تقویٰ وادب سنت پر ساری امت کا اجماع ہے اس کو لازم تھا کہ پہلے تاریخ خطیب بغدادی کا جائزہ لیتا پھر ان بے ہودہ کلمات کے راویوں کی تحقیق کرتا مگر افسوس ہے کہ انکار حدیث کے نشہ میں وہ ایسا مخبوط الحواس ہوگیا ہے کہ کلمات کفر سے بھی استدلال کرنے میں باک نہیں کرتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون نقل کفر کفر نہ باشد اب ذرا اس ہذیان کو دل تھام کر سنئے۔

''ابواسحاق فزاری کہتا ہے کہ میں ابوحنیفہ سے مسائل جہاد پوچھا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب دیا میں نے کہا اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو اس طرح ہے ابوحنیفہ نے کہا ہمیں اس سے معاف رکھو۔ ایک اور دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب دیا میں نے پھر کہا کہ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ایسا ایسا منقول ہے تو ابوحنیفہ نے کہا اسے لے جا کر خنزیر کی دم سے رگڑ دو۔'' الخ

ان لوگوں کو خدا کا خوف نہ آیا کہ ان کلمات سے آسمان گر پڑے گا زمین پھٹ جائے گی زلزلہ آ جائے گا۔ بھلا امام ابوحنیفہ جن کی متانت وتہذیب اور شائستگی کلام دنیا کو معلوم ہے کہ وہ بحث ومباحثہ میں بھی کبھی اپنے مقابل کو نازیبا الفاظ سے خطاب نہ کرتے

تھے وہ حدیث رسول کے بارہ میں ایسا کہیں۔ استغفر اللہ نعوذ باللہ۔

اب سنئے اس روایت کی سند میں عبدالسلام بن عبدالرحمٰن ہے جس کو قاضی یحییٰ بن اکثم نے عہدہ قضاء سے معزول کر دیا تھا۔ جب ظاہر یہ حشویہ کا بازار گرم ہوا اسے پھر منصب قضا پر لا بٹھایا اور اس کا شیخ اسمعیس بن عیسیٰ مجہول ہے۔

اسحاق فزاری

اور ابواسحاق فزاری نے خود اپنا ایک ایسا واقعہ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو امام صاحب سے عداوت ہوگئی تھی اس لئے دشمن کی روایت ان کے حق میں ہرگز قبول نہیں ہوسکتی۔ امام صاحب نے اس کے بھائی کو جب اس نے امام ابراہیم بن عبداللہ بن حسن کے متعلق دریافت کیا کہ وہ حق پر ہیں اور ان کی مدد واجب ہے یا نہیں؟ فتویٰ دے دیا تھا کہ وہ حق پر ہیں اور مدد کے مستحق ہیں۔ اس پر وہ ان کے ساتھ معرکہ میں شہید ہوگیا تو ابواسحاق فزاری نے امام صاحب سے کہا کہ تم نے فتویٰ دے کر میرے بھائی کو مروا دیا۔ فرمایا اگر تو بھی اپنے بھائی کے ساتھ مارا جاتا تو اس جگہ رہنے سے اچھا تھا۔ جہاں سے تو آیا ہے (یہ بصرہ میں رہتا تھا جو خارجیوں کا اور قدریہ کا اڈہ تھا) بس اس واقعہ نے اس کا توازن دماغ کھو دیا۔ اب وہ منہ پھٹ ہو کر ہر مجلس میں امام صاحب کو برا بھلا کہنے لگا۔ بھلا اس میں امام ابوحنیفہ کا کیا قصور تھا کہ ایک شخص فتویٰ پوچھتا ہے اور وہ جو حق سمجھتے ہیں اس کے موافق فتوے دے رہے ہیں۔

یہی ابواسحاق فزاری امام صاحب کی طرف (بقول خطیب) یہ بات منسوب کرتا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ اور ابلیس کا ایمان ایک ہے وہ بھی یا رب کہتے ہیں یہ بھی یا رب کہتا ہے۔ امام صاحب کے مثالب کی روایات میں اس شخص کا موجود ہونا ہی اس کے غلط در غلط ہونے کی کافی دلیل ہے کیونکہ اس کو واقعہ مذکور کی بناء پر امام صاحب سے خاص عداوت تھی۔

علاوہ ازیں یہ ابواسحٰق فزاری بجز مغازی اور سیر کے کسی علم میں بھی کوئی درجہ نہیں رکھتا مگر ابن سعد جو مغازی و سیر میں مسلم امام ہے ابواسحاق فزاری کو کثیر الغلط فی الحدیث

کہتا ہے کہ حدیث میں بہت غلطی کرتا ہے۔ یہی جرح ابن قتیبہ نے معارف میں کی ہے اور یہی محمد بن اسحاق الندیم نے فہرست میں کہا ہے اور تہذیب میں حافظ ابن حجر نے بھی انہ کثیر الخطاء فی حدیثہ فرمایا ہے کہ یہ شخص اپنی حدیثوں میں بہت خطا کرتا ہے پھر لسان میں ان کا محمد بن اسحاق الندیم پر اس وجہ سے طعن کرنا ہے کہ اس نے ابواسحاق فزاری پر جرح کی ہے بیکار سی بات ہے جبکہ اس نے وہی کہا ہے جو خود حافظ نے تہذیب میں فرمایا ہے (تانیب صفحہ ۴۰) اور یہ ابواسحاق صاحب اصطرلاب فلسفی نہیں ہے۔ جیسا حافظ کو وہم ہوا ہے اس کے باپ کا نام حبیب ہے اور صاحب اصطرلاب کے باپ کا نام محمد ہے۔ یہ ابواسحاق فزاری محدث قرن ثانی میں ہوا ہے اور فلسفی ابواسحاق فزاری قرن رابع کا آدمی ہے۔ دونوں کی کنیت اور نسبت کے اتحاد سے حافظ کو وہم ہوگیا ہے پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ ابواسحاق فزاری نے وہ حدیث بیان نہیں کی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ وہ رد کرنے کے قابل تھی یا نہیں اس کو بالکل یہ گول کر گیا۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ کہ یہ شخص صرف مغازی اور سیر کو جانتا ہے اور اکابر محدثین کا قول ہے کہ اس باب میں کثرت سے مراسیل اور منقطع موضوع اور ضعیف کمزور مجروح روایات ہوتی ہیں اس لئے امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ تین علوم کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ان میں سے ایک علم مغازی ہے اگر یہ فزاری اس حدیث کو بیان کر دیتا تو شاید خود ہی رسوا ہو جاتا اور دنیا جان لیتی کہ واقعی وہ حدیث قابل قبول نہ تھی۔ مگر پھر بھی جن الفاظ کو وہ امام صاحب کی طرف منسوب کر رہا ہے ہرگز امام کی زبان پر نہیں آسکتے تھے۔ وہ ضعیف یا موضوع حدیث کو رد کر سکتے ہیں مگر ایسے گندے الفاظ زبان پر نہیں لا سکتے۔

''پھر اسی ابن اسحاق فزاری کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ اس نے بادشاہ وقت کے خلاف خروج و بغاوت کے جائز ہونے پر ابوحنیفہؒ کے سامنے ایک حدیث بیان کی تو ابوحنیفہ کہنے لگے یہ حدیث خرافات ہے۔'' الخ

اس کی سند میں ابن دوما، ابن سلم اور ابار موجود ہیں۔ جن پر ہم پہلے کلام کر چکے ہیں کہ ان کی روایت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

حسن بن علی حلوانی

ان کے بعد حسن بن علی حلوانی ہے جس کو امام احمد اچھا نہیں سمجھتے تھے یہی چاروں اس روایت کی سند میں بھی موجود ہیں جو امام اوزاعی کی طرف نسبت کی جاتی ہے کہ جب امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے کہا خدا کا شکر ہے وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ طلوع اسلام نے اسی پرچہ کے صفحہ ۴۲ پر اس کو نقل کیا ہے حالانکہ خطیب نے بروایت ثقات سند صحیح کے ساتھ امام اوزاعی سے امام صاحب کی تعریف بیان کی ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳۸ جلد ۱۳۔ خدا اس طرح جھوٹوں کو رسوا کیا کرتا ہے۔

ابوصالح فراء

ان چار کے بعد پانچواں ابوصالح فراء ہے جس کے متعلق ابوداؤد کا قول گزر چکا ہے کہ اس کی باتوں اور حکایتوں کا اعتبار نہیں صرف کتاب کا اعتبار ہے۔ اس روایت کو رد کرنے کے لئے صرف ابن دوماہی کا سند میں ہونا کافی تھا چہ جائیکہ چار اور مجروح بھی اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ پھر جاننے والے جانتے ہیں کہ اہل شام کے یہاں ایسی بہت حدیثیں تھیں جن کو واضعین نے سلاطین بنی امیہ کی خاطر وضع کیا تھا تاکہ لوگ ان کے خلاف کچھ نہ بولیں تو ممکن ہے فزاری نے کوئی ایسی ہی حدیث بیان کی ہوگی۔ جس سے یزید کا واجب اطاعت خلیفہ ہونا اور امام حسین رضی اللہ عنہ کا باغی ہونا ثابت کیا ہوگا۔ امام صاحب نے اس کو خرافات کہہ دیا ہوگا۔ ورنہ ہم کو بتلایا جائے کہ وہ کون سی حدیث تھی کس سند سے روایت کی گئی تھی؟ اصل حدیث کو گول کر جانا اور صرف امام صاحب کے جواب کو نقل کر دینا یہ خود ہی فزاری کی خرافات ہے۔ حافظ ابن ابی العوام نے اپنی سند کے ساتھ اسمعیل بن داؤد سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن مبارک امام ابوحنیفہ سے روایت کیا کرتے تھے۔ مگر جب شہر عصیصہ میں جاتے تو امام صاحب سے کوئی روایت نہ بیان کرتے اور جب تک عبداللہ بن مبارک اس شہر میں رہے ابواسحاق فزاری بھی امام ابوحنیفہ کی شان میں خلاف ادب کچھ نہ کہتے اور اس سے سمجھ لیا جائے کہ اس شخص کی امام

صاحب سے عداوت کیسی مشہور ہوگئی تھی۔

اس کے بعد طلوع اسلام میں علی بن عاصم کا قول نقل کیا گیا ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی تو کہا میں اسے قبول نہیں کرتا۔ میں نے کہا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ابوحنیفہ نے پھر کہا ہاں ہاں میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ (طلوع اسلام)

مدیر طلوع اسلام اس مضمون کو لکھتے ہوئے نہ معلوم سورہا تھا یا افیون کھا رکھی تھی؟ کیا اسے اتنی خبر نہیں کہ صرف علی بن عاصم کے اتنا کہہ دینے سے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس کی بات حدیث رسول نہیں بن سکتی؟ پھر اس کی بات قبول نہ کرنے سے امام صاحب کا حدیث کو رد کرنا کیسے لازم آ گیا؟ کیا جو لوگ حدیث کو دینی حجت کہتے ہیں انہوں نے یہ بھی کہیں کہا ہے کہ علی بن عاصم جس بات کو رسول اللہ کا ارشاد کہہ دے وہ حدیث رسول بن جاتی ہے؟

علی بن عاصم

اس کی سند میں بھی ابن دوما موجود ہے اس کے بعد بھی جتنے راوی ہیں سب میں جرح کی گئی ہے۔ خود علی بن عاصم کا یہ حال ہے کہ وارقین (ناقلین، جلد ساز یا کتب فروش) جو کچھ اس کتاب میں بڑھا دیتے ہیں اس کو بھی روایت کرنے لگتا تھا۔ حالانکہ وہ باتیں اپنے استادوں سے اس کی سنی ہوئی نہ ہوتی تھیں نہ کتاب کا صحیح اصل سے مقابلہ کرتا تھا۔ ناقدین نے کتب ضعفاء میں اس شخص پر بہت کلام کیا ہے۔ پھر اس کا یہ منہ کہ جس بات کو ارشاد رسول کہہ دے وہ حدیث بن جاوے اور اپنی بات کے رد کرنے والے کو حدیث رسول کا رد کرنے والا قرار دے؟

اس کے بعد طلوع اسلام میں بشر بن المفضل کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ اس نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بائع اور مشتری جب تک جدا نہ ہوں انہیں اختیار رہتا ہے (ترجمہ میں فسخ بیع

کا لفظ حدیث میں اضافہ ہے) ابوحنیفہؒ نے کہا یہ تو رجز ہے (یعنی گیت) میں نے کہا (کہنے والا وہی بشر بن المفضل ہے کہ) قتادہ حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان لڑکی کا سر پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس یہودی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ ابوحنیفہ نے کہا یہ ہذیان ہے۔ (طلوع اسلام)

اس کی سند میں ابن بہتہ محمد بن عمر بن محمد بن بہتہ بزاز شیعی ہے جس پر خطیب نے خود جرح کی ہے اس کے بعد ابن عقدہ[۱]۔

کوفی کٹر شیعی ہے جس میں خطیب نے سخت جرح کی ہے تو اس کی روایت پر اعتماد کرنا اسے کب جائز ہے؟ اس کے بعد ابوبکر بن الاسود ہے جس کے متعلق ابن معین بری رائے رکھتے تھے۔ پس ہذیان بکنے والے وہی لوگ ہیں جو ایسی مہمل سند سے امام ابوحنیفہؒ کی طرف اس قسم کی بیہودہ بکواس کو منسوب کرتے ہیں۔

اور نفس مسئلہ کی تحقیق ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ امام صاحبؒ نے حدیث **المتباعیان بالخیار مالم یتفرقا** کو ہرگز رد نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کے قول کو رد کیا ہے جو تفرق سے جسمانی مفارقت مراد لیتے ہیں اور خیار سے خیار مجلس ثابت کرنا چاہتے ہیں امام صاحب کے نزدیک تفرق سے گفتگو کا ختم ہو جانا اور خیار سے خیار رجوع مراد ہے۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جب تک بائع اور مشتری ایجاب وقبول سے فارغ نہ ہو جائیں ہر ایک کو اپنے قول سے رجوع کا اختیار ہے۔ مثلاً خریدار نے کہا کہ میں اس مال کو سو روپیہ میں خریدتا ہوں تو جب تک بائع یہ نہ کہے کہ میں نے بیچ دیا۔ خریدار اپنی بات کو واپس لے سکتا ہے۔

تفرق کا استعمال تفرق بالا قوال پر قرآن و حدیث میں بکثرت وارد ہے۔
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَاِنْ

---

[۱] اگرچہ سیوطی اور بعض دیگر محدثین نے ابن عقدہ کو ثقہ مانا ہے مگر خطیب کے نزدیک وہ ثقہ نہیں بلکہ سخت مجروح ہے اس کی روایت پر اعتماد کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نص قرآنی اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ سے عاقدین کی باہمی رضامندی کے تحقق کے بعد ہر ایک کو مبیع اور ثمن میں تصرف کی اجازت معلوم ہو رہی ہے۔ اس پر خبر واحد سے خیار مجلس کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ پس یا تو تفرق کو تفرق بالاقوال پر محمول کیا جائے اور خیار سے خیار رجوع مراد لیا جائے یا اس کو محض استحباب پر محمول کیا جائے جیسا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث کے الفاظ سے ایسا ہی واضح ہوتا ہے (ملاحظہ ہو بخاری) پھر تفرق بالابدان سے عقد کا کامل ہو جانا شریعت میں معروف نہیں بلکہ اس کی تاثیر تو عقد کو فاسد کر دینا ہے جیسا بیع صرف میں مبیع یا ثمن پر پہلے اور بیع سلم میں راس المال پر قبضہ سے پہلے مفارقت ہو جائے تو بیع فاسد ہو جاتی ہے تو حدیث کو تفرق بالا بدان پر محمول کرنے سے اصول معروفہ کی بھی مخالفت لازم آتی ہے اور کتاب اللہ پر بھی خبر واحد سے زیادتی لازم آتی ہے اور تفرق بالاقوال پر محمول کرنانے سے نہ اصول کی مخالفت لازم آتی ہے نہ کتاب اللہ پر زیادت۔ اب اہل علم خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول قوی ہے یا دوسرے علماء کا؟ اس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس بڑے قوی دلائل موجود ہیں جس کو تفصیل کا شوق ہو تو عقود الجواہر المنفیہ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفہ السید مرتضی الزبیدی اور احکام القرآن للجصاص الرازی کا مطالعہ کرے۔ ان دونوں نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس مسئلہ پر کلام کیا ہے ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ امام مالکؒ بھی اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں اور جس بات پر امام اہل عراق اور امام اہل حجاز دونوں متفق ہو جائیں اس کو کمزور سمجھنا اپنی عقل و فہم کی کمزوری کا اعلان کرنا ہے۔

حدیث رضخ راس الیہودی بین حجرین

رہی دوسری حدیث تو اس کو بھی امام صاحب نے رد نہیں کیا بلکہ منسوخ مانا ہے کیونکہ بعد میں جنگ خیبر کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ کو حرام کر دیا تھا (مثلہ اس کو کہتے ہیں کہ کسی کو اس طرح قتل کیا جائے جس سے اس کی صورت بگڑ جائے

جیسے ہاتھ، پیر، کان، ناک کاٹنا یا آگ سے جلا دینا یا پتھر سے کچل دینا) تو جن احادیث میں مثلہ کے ساتھ قتل وارد ہوا ہے اس کو ممانعت سے پہلے زمانہ پر محمول کرنا لازم ہے۔ اس سے کسی عاقل کو انکار کی گنجائش نہیں۔ اسی لئے جب امام حسن بصریؒ کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالک صحابی نے حجاج بن یوسف کے سامنے عرینین والی حدیث بیان کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان لوگوں کو ہاتھ پیر کاٹ کر تپتی دھوپ میں ڈال دینا اور آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دینا مذکور ہے تو ان کو بہت رنج ہوا اور فرمایا کاش! حضرت انس یہ حدیث حجاج کے آگے بیان نہ کرتے (کیونکہ اس کو اس سے کیا بحث کہ یہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے اور ممانعت مثلہ سے پہلے حضورؐ نے ان لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تھا کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں کے ساتھ ایسی بے دردی کا معاملہ کیا تھا۔ حجاج جیسے ظالم کو تو یہ حدیث مخلوق پر ستم ڈھانے کے لئے بہانہ بن جائے گی) مگر حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر سو سال سے زیادہ ہوگئی تھی یہ حدیث انہوں نے اخیر عمر میں بیان کی ہے اس وقت وہ حجاج سے یہ کہنا بھول گئے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اب اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں اس حدیث کو نہیں لیا کیونکہ الصحابۃ کلھم عدول (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) کا یہ مطلب نہیں کہ عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو سہو ونسیان بھی پیش نہیں آسکتا۔ آخر وہ بھی بشر ہیں۔ زیادہ لمبی عمر کے آثار ان پر بھی طاری ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث بھی جس میں ایک یہودی کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچلنے کا ذکر ہے حضرت انسؓ نے اخیر عمر ہی میں بیان فرمائی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف مقتول لڑکی کے بیان پر آپؐ نے یہودی سے بدلہ لیا۔ گو ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہودی نے قتل کا اقرار کر لیا تھا اس کے بعد اس سے بدلہ لیا گیا۔ مگر اقرار والی حدیث میں قتادہ کا عنعنہ ہے اور اس کا عنعنہ محدثین کے نزدیک مقبول نہیں۔ یہ تو اس حدیث کی سند پر کلام تھا مگر پھر بھی امام ابوحنیفہؒ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ ممانعت مثلہ کی حدیث سے اس کو منسوخ مانا ہے اور حدیث ''لا قود الا بالسیف'' پر فتویٰ دیا ہے کہ قصاص تلوار ہی سے لیا جائے آگ یا پتھر وغیرہ

سے قصاص نہ لیا جائے گو قاتل نے کچھ ہی کیا ہو۔ اسی لئے حنفیہ نے اس حدیث کے اس جملہ پر عمل نہیں کیا جو قتادہ کی ایک روایت میں وارد ہے کہ حضورؐ نے ان لوگوں کو اونٹوں کے پیشاب پینے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ یہ حدیث حضرت انسؓ نے اخیر عمر میں بیان کی ہے جب کہ حافظہ کمزور ہو گیا تھا اور اگر اس کو صحیح مان لیا جاوے تو اس سے اونٹ کے پیشاب کی طہارت ثابت نہ ہوگی۔ بہت سے بہت یہ ثابت ہوگا کہ بیماری میں حرام چیز سے بھی دوا کر سکتے ہیں جب اور کوئی چیز نافع نہ ہو۔

اس کے بعد طلوع اسلام میں عبدالصمد ابن عبدالوارث عبری) اپنے باپ کے حوالہ سے نقل کرتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا **افطر الحاجم والمحجوم** (پچھنے لگوانے والے اور لگانے والے (دونوں کا) روزہ ٹوٹ جاتا ہے (ابوحنیفہؒ نے کہا یہ محض قافیہ بندی ہے۔ ایسے ہی ان کے سامنے ولاء کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا گیا تو ابوحنیفہ نے کہا یہ کسی شیطان کا قول ہے۔ (طلوع اسلام)

اس واقعہ کو خطیب نے دوسندوں سے روایت کیا ہے ایک میں تو ابن رزق، ابن سلم، ابار، ابومعمر قدری، دھرے ہوئے ہیں جن پر کلام گزر چکا ان کی روایت ہرگز معتبر نہیں۔ دوسری سند میں خطیب کے سوا اور کوئی مجروح نہیں۔ مگر عبدالوارث کا یہ لفظ کہ ابوحنیفہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا یا حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا گیا، سند کو منقطع کر رہا ہے۔ اس نے یہ نہیں بتلایا کہ ناقل کون تھا؟ نہ یہ کہتا ہے کہ یہ واقعہ اس کے سامنے کا ہے، نہ یہ کہتا ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کا یہ جواب خود سنا ہے۔ نہ حضرت عمر کے فیصلہ کو بیان کرتا ہے کہ وہ کیا تھا؟ ممکن ہے وہ کوئی ایسا ہی غلط فیصلہ ہو جس کو حضرت عمرؓ کی طرف کوئی وضاع، کذاب، دجال، شیطان ہی منسوب کر سکتا ہے؟ وضاعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑے جھوٹ بولے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان کے ہاتھ سے بچے رہتے۔ امام ابوحنیفہؒ صحابہ کی خصوصاً حضرت عمرؓ کی جس قدر تعظیم و احترام کرتے تھے۔ اگر ان سب روایات کو جمع کیا جائے ایک ضخیم دفتر ہو جائے۔ دنیا جانتی ہے

کہ امام صاحبؒ حدیث رسولؐ کے بعد اقوال صحابہ کو حجت مانتے ہیں اور ان کے اقوال سے باہر جانے کو ناجائز کہتے ہیں۔ حالانکہ بعض فقہا جن میں خطیب بغدادی اور ان جیسے بعض شافعیہ بھی ہیں صحابہ کے اقوال کو حجت نہیں جانتے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ ہی تو تھے جن سے خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب یہ پوچھا کہ آپ نے یہ علم کس سے لیا؟ تو فرمایا میں نے یہ علم حماد سے لیا ہے اس نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب سے لیا ہے۔ جیسا کہ ص ۳۳۴ میں خطیب نے صحیح سند کے ساتھ خود ہی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد کیا کسی عاقل کی عقل باور کر سکتی ہے کہ امام صاحبؒ حضرت عمرؓ کے کسی قول کو شیطان کا قول کہہ سکتے ہیں؟ ہاں کوئی غلط بات یا غلط فیصلہ کسی کمزور راوی نے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا ہو تو اس راوی کو شیطان کہہ دیا ہوگا۔ اس تاویل کی ضرورت بھی اس وقت ہے جب کہ اس لفظ کا ثبوت ہو جائے۔ ہنوز اسی میں کلام ہے کیونکہ دو سندوں میں سے ایک تو بالکل ساقط ہے دوسری میں عبدالوارث نے صیغہ انقطاع استعمال کیا ہے جس سے سند کا اتصال ختم ہوگیا۔ افسوس یہ ہے کہ انقطاع، جہالت وغیرہ علتیں جو سند کو ہر جگہ محدثین کے نزدیک معلول اور ناقابل قبول بنا دیتی ہیں امام ابوحنیفہؒ کی مذمت میں یہ علتیں اپنا کچھ اثر نہیں دکھاتیں۔ محدثین بے دھڑک ان مہملات کو روایت کرتے جاتے ہیں اور کچھ کلام نہیں کرتے حتیٰ کہ امام بخاری بھی تاریخ صغیر میں اسمٰعیل بن عرعرۃ مجہول الحال سے اور امام صاحب کی مذمت میں ایک حکایت نقل کر جاتے ہیں اور نہیں خیال کرتے کہ اول تو اسماعیل بن عرعرہ مجہول پھر اس امام صاحبؒ کے درمیان مسافت طویل جس کی وجہ سے خبر منقطع اور معلول وغیر مقبول ہے۔ مگر ابوحنیفہؒ کی مذمت میں ہر خبر قابل قبول ہے چاہے فاسق و فاجر ہی کی روایت ہو پھر عبدالوارث عبری فرقہ قدریہ میں سے ہے اور بصرہ کے قدریوں کو امام ابوحنیفہؒ سے خاص طور پر انحراف تھا، کیونکہ امام صاحب اپنے ابتدائی دور میں مناظرہ اور علم کلام کے ماہر تھے اور بار ہا بصرہ جا کر خارجیوں اور قدریوں سے مناظرہ کرتے اور ان کا ناطقہ بند کرتے تھے۔ اس لئے کسی خارجی یا قدری کا قول امام صاحبؒ کے متعلق قابل

قبول نہیں ہوسکتا۔ دشمن کی بات اس کے مخالف کے حق میں کوئی بھی نہیں مان سکتا۔

اس کے بعد طلوع اسلام میں یحییٰ بن آدم کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وضو آدھا ایمان ہے۔ ابوحنیفہؒ کہنے لگے پھر تو دو مرتبہ وضو کر ڈالو تاکہ تمہارا ایمان کامل ہو جائے۔ ایسا ہی قول لاادری کے متعلق ذکر کیا گیا ہے۔ (طلوع اسلام)

یہ سند منقطع ہے۔ یحییٰ بن آدم نے امام صاحبؒ کو نہیں پایا جو صیغہ وہ استعمال کر رہا ہے وہ صیغہ انقطاع ہے۔ ایسی مہمل سند سے کسی مسلم امام پر جرح کرنا خود اپنے کو مجروح کر دینا ہے۔

یہ تو سند پر کلام تھا، اب حقیقت کی طرف رجوع کیا جائے تو حدیث **افطر الحاجم والمحجوم** کو اکثر محدثین نے جن میں یحییٰ بن معین بھی ہیں ثابت نہیں مانا (ملاحظہ ہو نصب الرایہ) اور جن کے نزدیک ثابت بھی ہے وہ اس کو منسوخ کہتے ہیں کیونکہ دوسری صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے ہیں اور جو حضرات منسوخ نہیں کہتے وہ اس میں تاویل کرتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ حاجم اور محجوم اپنے کو خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ کیونکہ حاجم تو خون چوستا ہے اندیشہ ہے کہ اس کے حلق میں پہنچ جائے اور محجوم خون نکلوا کر کمزور ہو جاتا ہے اندیشہ ہے کہ ضعف بڑھ جانے سے روزہ پورا نہ کر سکے۔ اور لاادری نصف العلم حدیث نہیں ہے بعض صحابہ کا قول ہے اگر کسی کمزور راوی نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بنا دیا ہو تو اس کا رد ضرور کیا جائے۔ اسی طرح الطہور شطر الایمان بعض محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث ہے ممکن ہے امام صاحبؒ بھی اس کو صحیح نہ مانتے ہوں۔ مگر جو الفاظ تاریخ خطیب میں ان کی طرف منسوب کئے گئے وہ ہرگز امام صاحبؒ کی زبان سے نہیں نکل سکتے۔ امام ابوحنیفہؒ کا عام لوگوں کے ساتھ گفتگو میں شائستہ اور مہذب ہونا مشہور و معروف ہے ان کی متانت و وقار کا سب کو اقرار ہے وہ کسی حدیث پر ایسے ناشائستہ الفاظ سے ہرگز کلام نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد صفحہ ۳۵ پر مدیر طلوع اسلام نے یہ عنوان قائم کر کے کہ "یہ احکام گزر چکے اور ختم ہو چکے" یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک احادیث رسولؐ کے احکام دائمی نہ تھے بلکہ وقتی تھے ان میں تبدل وتغیر کیا جا سکتا ہے۔"

مگر روایت خطیب کے لفظ پر اس نے ساری عمارت قائم کی ہے وہ خود اس کی جہالت کا پردہ چاک کرتی ہے واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحبؒ نے شہد کا چھتہ چرانے والے کے ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دے دیا تو ابوعوانہ نے کہا یہ تو حدیث "**لاقطع فی ثمر ولا کثر**" کے خلاف ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا **ذاک حکم قد مضی فانتھی** اب تو یہ حکم نافذ ہو گیا اور فیصلہ ہو چکا۔ اس میں ذاک حکم سے حکم رسول مراد نہیں بلکہ خود امام کا اپنا فتویٰ مراد ہے کہ اب تو میں فتویٰ دے چکا اور فیصلہ ہو چکا جس کی دلیل دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں **قلت الرجل الذی افتیتہ فردہ قال دعہ فقد جرت بہ النعال الشھب** میں نے کہا جس شخص کو آپ نے حدیث کے خلاف فتویٰ دیا ہے اس کو واپس بتلایئے (اور صحیح فتویٰ سنا دیجئے تا کہ چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے) فرمایا جانے بھی دو اس کو تو تیز رو خچر کہیں سے کہیں لے گئے ہیں۔ یہ دوسری روایت بھی اسی واقعہ مذکورہ کے متعلق ہے جس کو خطیب نے تحویل سند کے ساتھ دوبارہ بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون نکالنا کہ امام صاحبؒ نے حدیث رسولؐ کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ احکام گزر چکے ختم ہو چکے۔ مدیر طلوع اسلام کی نری جہالت ہے۔

اب اس روایت کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو پہلی سند میں تو ابوعمرو بن السماک ہے جس پر ذہبی نے طعن کیا ہے کہ وہ بہت بیہودہ باتیں روایت کرتا ہے اس کے بعد رجاء بن السندی ہے جو بہت زبان دراز ہے۔ پھر بشر بن السری ہے جس کے متعلق حمیدی نے کہا ہے کہ یہ جہمی ہے اس سے روایتیں لکھنا جائز نہیں۔ دوسری سند میں دوما مزدر (صاحب تزویر) ہے اس سے پہلے قدم ہی میں یہ روایت ایسی گر گئی کہ اٹھنے کے قابل نہیں۔ اس کے بعد ابن سلم، ابار اور حلوانی بھی موجود ہیں جن میں پہلے کلام ہو چکا ہے۔ نیز ابوعاصم عبادانی بھی ہے جس کو منکر الحدیث کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ابوعوانہ ہے۔ گو علی بن عاصم

نے اس پر بھی سخت جرح کی ہے مگر یہ اس کی زیادتی ہے اتنا ضرور ہے کہ ان کی کتاب صحیح تھی اس کو دیکھ کر روایت کرتے تو ٹھیک بیان کرتے اور حفظ سے روایت کرتے تو غلطی کرتے تھے۔ اور اپنی عمر کے آخری چھ سالوں میں جو کچھ انہوں نے روایت کیا ہے اس کا اعتبار نہیں کیونکہ (حواس میں) اختلاط پیدا ہو گیا تھا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس حکایت میں ابوعوانہ کی خطا نہیں ہے بلکہ اس سے نیچے جو مجروح راوی دھرے ہوئے ہیں خطا ان کی ہے دوسری روایت میں کہا گیا ہے کہ امام صاحب نے حدیث **لا قطع فی ثمر ولا کثر** (پھل اور کھجور کے گودے کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا) کو سن کر یہ فرمایا کہ مجھے یہ حدیث نہیں پہنچی حالانکہ امام محمد نے کتاب الآثار امام ابوحنیفہ سے ہیثم بن الہیثم سے، شعبی سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ابوبکر بن المقری نے سند ابی حنیفہ میں ابوحنیفہ سے شعبی سے حضرت علیؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

﴿لایقطع السارق فی ثمر ولا کثر قال محمد وبه نأخذ والثمر ما کان فی رؤس النخل والشجر لم یحرزفی البیوت فلا قطع علی من سرقه و الکثرجمار النخل فلا قطع علی من سرقه وهو قول ابی حنیفةؒ﴾

''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے پھل کی چوری میں اور نہ کھجور کے گودے کی چوری میں۔ امام محمد نے کہا ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ ثمر وہ ہے جو کھجور پر یا کسی درخت کے اوپر (پھل) لگا ہوا ہو گھر میں لا کر حفاظت سے نہ رکھا گیا ہو اس کی چوری سے ہاتھ نہ کاٹا جائے گا اور کثر کھجور کے گودے کو کہتے ہیں اس کی چوری میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔''

تم نے دیکھا امام ابوحنیفہؒ کو یہ حدیث اس وقت پہنچ چکی تھی جب کہ ابوعوانہ بچے تھے اور واسط شہر میں اپنے آقا کی غلامی میں دن گزار رہے تھے ان کی ولادت ۱۲۲ھ میں ہوئی ہے اور جرجان کے قیدیوں میں شامل ہو کر واسط آئے تھے۔ یہ بات مشہور ہے۔ پھر

ایک مدت تک اپنے مولیٰ یزید بن عطاء کی غلامی میں رہے اس حالت میں امام صاحبؒ کی حیات میں ان کا کوفہ آنا اور ان کے حلقہ درس میں مدت تک رہنا جیسا کہ تاریخ خطیب میں ص ۴۰۱ پر مذکور ہے قیاس سے بعید ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کی مذمت میں ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ پس خطیب کی یہ روایت جس میں کہا گیا ہے کہ امام صاحبؒ نے اس حدیث کے خلاف فتویٰ دیا اور شہد کا چھتہ چرانے والے کا ہاتھ کٹوا دیا اور ابوعوانہ سے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث نہیں پہنچی سراسر غلط اور کھلا بہتان اور سفید جھوٹ ہے۔

اس کے بعد طلوع اسلام نے اپنے ''انکار حدیث'' پر پردہ ڈالنے کے لئے دو روایتیں امام احمدؒ سے بھی امام ابوحنیفہؒ کے انکار حدیث کی نقل کر دی ہیں۔ ایک کا حاصل یہ ہے کہ احمد بن حنبلؒ نے عقیقہ کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثیں صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بیان کر کے تعجب سے مسکراتے ہوئے فرمایا ''مگر ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔''

مگر ہم امام احمد ہی سے پوچھتے ہیں کیا جاہلیت میں عقیقہ نہیں تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ابوحنیفہ نے کیا خطا کی؟ اور اگر نفی میں ہے تو تاریخ عرب اور احادیث وآثار اس کی تردید کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت میں عقیقہ کو واجب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے وجوب ساقط کر دیا۔ اباحت کو باقی رکھا۔ امام محمد نے آثار میں امام ابوحنیفہؒ سے، حماد سے، ابراہیم نخعی سے۔ دوسری سند میں محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

﴿کانت العقیقة فی الجاهلیة فلما جاء الاسلام رفضت قال محمدوبه نأخذ وهو قول ابی حنیفة﴾

''عقیقہ جاہلیت میں تھا جب اسلام آیا تو چھوڑ دیا گیا۔ امام محمد کہتے ہیں ہمارا عمل بھی اسی پر ہے اور ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔''

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ عقیقہ جاہلیت کے وقت سے چلا آ رہا ہے اسلام میں بھی اس پر عمل کیا گیا ہے۔ امام صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ اسلام میں اس کا وجوب باقی نہیں رہا صرف اباحت واستحباب باقی ہے اور اسی رائے میں ان کے ساتھ

محمد ابن الحنفیہ بھی ہیں جو بہت بڑے فقیہ ابن الفقیہ ہیں کہ صحابہ سے بھی فتاویٰ میں مزاحمت کرتے تھے نیز ابراہیم نخعی بھی ان کے ساتھ ہیں جن کے بارے میں شعبی کا قول یہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم نہیں چھوڑا۔ کسی نے کہا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں؟ کہا حسن اور ابن سیرین بھی ان سے زیادہ عالم نہیں۔ بصرہ، کوفہ، حجاز میں ان سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔ ایک روایت میں شام کو بھی شامل کیا گیا ہے نیز امام محمد بن حسنؒ بھی ان کی موافقت کرتے ہیں جو اتنے بڑے فقیہ ہیں کہ فقہ ابی حنیفہ کے ساتھ علم ابی یوسف و علم اوزاعی و علم سفیان ثوری اور علم امام مالکؒ کے بھی جامع تھے۔ یہ حضرات فقہاء ان احادیث سے جو عقیقہ کے باب میں وارد ہیں وجوب نہیں سمجھے اگرچہ امام احمدؒ نے جماعت فقہا سے الگ ہو کر وجوب کا دعویٰ کیا ہے باقی عقیقہ کی اباحت یا استحباب کا انکار حنفیہ میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ اس مسئلہ میں علماء نے طویل بحث اور بہت لمبی گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

دوسری روایت محمد بن یوسف بیکندی کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے کہ امام احمد کے سامنے امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ نکاح سے پہلے بھی طلاق ہو سکتی ہے۔ امام احمد کہنے لگے مسکین ابوحنیفہ! گویا وہ عراق میں تھے ہی نہیں گویا انہیں علم سے کچھ مس تھا ہی نہیں۔ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تیس کے قریب کبار تابعین کے ارشادات واقوال موجود ہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں پڑ سکتی۔ الخ۔

اس کے بعد طلوع اسلام بڑے طنطنہ سے کہتا ہے کہ ”آپ نے دیکھا کہ حدیث کے متعلق فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام کا مسلک کیا ہے؟ لیکن نہ تو امام اعظم کو منکر حدیث کہا جاتا ہے اور نہ ہی حنفی مسلمانوں کو۔ حالانکہ جس تشدد سے انکار حدیث امام ابوحنیفہ کے ہاں پایا جاتا ہے کسی ”منکر حدیث“ کے ہاں کم ہی ایسا پایا جائے گا۔ کم از کم طلوع اسلام میں ایسا تشدد آپ کو کبھی نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود طلوع اسلام کو منکر حدیث قرار دے کر کافر ٹھہرایا جاتا ہے............ الخ۔“ جی ہاں طلوع اسلام کو اس لئے منکر حدیث قرار دے کر جماعت اہل سنت سے الگ کیا جاتا ہے کہ اسے

اپنے انکار حدیث کا اقرار بھی ہے اور اس کی تحریروں اور ادارہ کی تقریروں سے اس کا ثبوت بھی ہو چکا ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کو اس لئے منکر حدیث نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو اپنے منکر حدیث ہونے کا اقرار نہیں نہ ان سے اور ان کے اصحاب سے اس قسم کا کوئی قول پایہ ثبوت کو پہنچا اور جو کچھ تاریخ خطیب سے اس باب میں نقل کیا جا رہا ہے سراسر غلط اور سفید جھوٹ ہے جیسا اب تک ہم اچھی طرح دکھلاتے آئے ہیں اور آئندہ بھی بتلائیں گے۔ کیا طلوع اسلام کو تاریخ خطیب جس کی عبارتوں کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے کے سوا علماء حنفیہ کی اصولی کتابیں حسامی، اصول الشاشی، نور الانوار، توضیح تلویح، اصول بزدوی وغیرہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتیں جن میں کتاب اللہ کے بعد باب السنہ بھی قائم کیا ہوا ہے جس میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ قرآن کے بعد دوسری حجت شرعیہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پھر حدیث کے اقسام واحکام سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ الٹی منطق طلوع اسلام ہی نے سیکھی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک حدیث کو تاریخ کی کتاب سے معلوم کرنا چاہتا ہے جس کی حقیقت ہم اوپر بتلا چکے ہیں اور خود مذہب حنفی کی اصولی کتابوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ حالانکہ سیدھی بات یہ ہے جس سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر امام کا مسلک اس کے مذہب کی اصولی، فروعی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے دوسروں کی کتابوں سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

اب میں اس مہمل روایت کی حقیقت بھی آپ کو بتلا دوں جس پر طلوع اسلام نے خوشی کے شادیانے بجائے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق واقع ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ امت کا اجماع ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ** (سورۃ الاحزاب) اور حدیث میں ہے **لا طلاق قبل النکاح** یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے جس سے امام احمد بن حنبلؒ ناواقف نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ خود بھی عراقی ہیں اور علماء عراق سے ہی انہوں نے فقہ حاصل کی ہے۔ جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔ اسی تاریخ

خطیب میں احمد بن حنبلؒ کا یہ قول مذکور ہے کہ جب میں نے طلب علم کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ کے حلقہ درس میں پہنچا۔ یہ بھی اسی تاریخ میں ہے کہ امام احمدؒ سے کسی نے پوچھا یہ دقیق مسائل آپ نے کہاں سے سیکھے؟ فرمایا محمد بن حسنؒ کی کتابوں سے۔ اس کے بعد کسی کی عقل باور کرسکتی ہے کہ امام احمدؒ کی زبان پر امام ابوحنیفہؒ کے متعلق یہ بات آسکتی ہے۔ کہ "مسکین ابوحنیفہ گویا وہ عراق میں تھے ہی نہیں۔ گویا انہیں علم سے مس تھا ہی نہیں الخ۔ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو امام ابوحنیفہ تو مسکین ہی بنیں گے مگر امام احمد کو دنیا (خدانخواستہ) بے ادب، احسان فراموش قرار دے گی۔ اس لئے ہمارے نزدیک درایۃً یہ روایت صحیح نہیں۔ پھر اس کی سند میں محمود بن اسحٰق بن محمود القواس ہے جس کو کسی نے ثقہ نہیں کہا۔ اسی طرح اس کے شاگرد احمد بن محمد بن حسین رازی کو بھی ہماری تحقیق ثقہ نہیں قرار دیتی۔ پھر بیکندی نے صیغہ انقطاع استعمال کیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا گیا۔ یہ نہیں بتلایا کہ ناقل کون تھا؟ ثقہ تھا یا غیر ثقہ؟ اور جس وقت یہ قول بیان کیا گیا بیکندی اس مجلس میں حاضر تھا یا نہیں؟ اس نے ناقل کا قول اور امام احمدؒ کا جواب خود سنا ہے یا اور کسی سے سن کر بیان کر رہا ہے؟ ایسی حالت میں محدثین کے اصول پر بھی یہ روایت ساقط الاعتبار ہے۔

غرض اس پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اختلاف اس میں ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق کو معلق بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر نکاح یا ملک پر طلاق یا عتاق کو معلق کیا جائے تو تعلیق صحیح ہے مثلاً یوں کہے ان نکحت فلانۃ فھی طالق اگر میں فلانی عورت سے نکاح کروں تو اس کو طلاق۔ یہ طلاق معلق ہو جائیگی۔ اور اگر اس نے اس عورت سے کسی وقت نکاح کیا، طلاق پڑ جائے گی۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کو طلاق قبل النکاح نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ نکاح سے پہلے تو معلق رہتی ہے۔ واقع نہیں ہوتی نکاح کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس لئے یہ صورت آیت وحدیث کے تحت شامل نہیں۔ اس مسئلہ میں عثمان بتی، امام سفیان ثوری، امام مالک، ابراہیم نخعی، مجاہد، شعبی او خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز بھی امام صاحب کیساتھ ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب

رضی اللہ عنہ کا قول صراحۃً امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی تائید میں ہے۔ امام شافعیؒ نے سعید بن المسیب کے قول کو لیا ہے یہی امام احمد کا مسلک ہے۔ اس مسئلہ میں علماء نے بہت طویل کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص ص ۳۶۱ ج ۳ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے متعلق امام احمد وہ الفاظ استعمال کریں جو اس مہمل روایت میں مذکور ہیں حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ابوحنیفہ کی حجت واضح اور دلیل راجح ہے۔ اور ان کے ساتھ فقہاء سلف کی ایک بڑی جماعت ہے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا جن میں تنہا حضرت عمرؓ ہی ہزاروں پر بھاری ہیں اور اس بات میں مرفوع حدیثیں جو بیان کی جاتی ہیں اضطراب سے خالی نہیں اور جو صحیح ہیں ان میں وہ صورت داخل نہیں جو مابہ النزاع ہے جس میں اختلاف ہو رہا ہے، غالباً اب تو طلوع اسلام کی آنکھیں شرم سے جھک گئی ہوں گی کہ جس بات پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے الٹی موجب تعزیت ہوگئی اور یہ کہ عوام کی جہالت سے ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے بلکہ خود طلوع اسلام جہالت کے دریا میں غوطے لگا رہا اور اپنے جیسے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اس میں ڈبونے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک نہایت ہی بیہودہ عنوان قائم کیا ہے کہ ''اگر میں رسول اللہ کے عہد میں ہوتا تو آپ بھی میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے''۔ اور اس کو اسی تاریخ خطیب کے حوالہ سے امام صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس بیہودہ روایت کی حقیقت ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ ایسا گستاخی کا بول امام صاحب کی زبان سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے عثمان بتی کی نسبت ان کے ایک شاگرد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا لو ادرکنی البتی لاخذ بکثیر من اقوالی و ترک کثیرا من اقوالہ اگر (عثمان) بتی مجھے پالیتا تو میرے بہت سے اقوال کو لے لیتا اور اپنے بہت سے اقوال چھوڑ دیتا۔ مہمل اور مغفل راویوں نے تعصب یا جہالت سے بتی کو نبی بنا دیا اور صلی اللہ علیہ وسلم کا اضافہ کر کے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اس بیہودہ روایت پر عمارت قائم کرتے ہوئے طلوع اسلام کو ذرا بھی شرم نہ آئی وہ بڑی ڈھٹائی سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف اس قول کو منسوب کرتا ہے کہ ''خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعیین جزئیات (تدوین فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی اسے اختیار فرمایا کرتے تھے'' (یہ قول کس کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے؟ تاریخ خطیب میں تو یہ اضافہ نہیں ہے۔ طلوع اسلام کو جھوٹ بولتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا۔'' (یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ طلوع اسلام کو ترجمہ میں دیانت کا بھی پاس نہیں) ''اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرمالیتے'' اھ۔ بعد والے مضمون کی حقیقت تو ہم نے بتلا دی کہ یہ محض دروغ بے فروغ ہے۔ اس سے پہلے مضمون کا حوالہ طلوع اسلام دیدے گا تو اس کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے گی، مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ اس کا حوالہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تو سراسر ایجاد بندہ اور اس کی ہی اختراع گندہ ہے۔

اس کے بعد طلوع اسلام میں ابو صالح فراء کے حوالہ سے یوسف بن اسباط سے اسی بات کو روایت کیا گیا ہے کہ ''ابو حنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پاتے الخ۔ اس میں اتنا اضافہ اور بھی ہے کہ (امام ابو حنیفہ نے فرمایا) دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔''

اگر طلوع اسلام اس روایت کو صحیح اور اس قول کو امام ابو حنیفہ کا قول سمجھتا ہے تو پھر دین میں نہ قرآن کی ضرورت رہتی ہے نہ کسی مشورہ اور کمیٹی کی۔ بلکہ ہر شخص کو اچھی رائے پر عمل کرنا چاہیے جو اس کے نزدیک اچھی ہو۔ امام صاحب کے اس قول میں مشورہ اور کمیٹی اور کثرت رائے اور ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی صدارت وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں لہٰذا ان قیود کا اضافہ قابل قبول نہ ہوگا۔

مگر طلوع اسلام کو تو انکار حدیث کے جنون نے ایسا حواس باختہ کر دیا ہے کہ جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے وہ بھی ذرا ذرا سی بات کا سہارا لینا چاہتا ہے گو بعد میں اسے منہ ہی کی کھانی پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مہمل یا مغفل راویوں نے بتی کو بدل کر نبی بنا دیا اور صلی اللہ علیہ وسلم بڑھا کر بات کو کہیں سے کہیں پہنچا

دیا تھا اسی طرح ھل اریٰ الا الرأی الحسن کو ھل الدین الاالرأی الحسن بنا دیا۔ امام صاحب عثمان بتی فقیہ بصرہ کی نسبت فرما رہے ہیں کہ اگر وہ مجھے پالیتا تو میرے بہت سے اقوال کو لے لیتا (کیونکہ وہ بھی صاحب اجتہاد تھا قیاس ورائے کا قائل تھا) اور میں بھی اچھی رائے اور بہترین اجتہاد سے کام لیتا ہوں۔ اس صورت میں یہ جملہ پہلے جملہ کی دلیل ہوگا کہ عثمان بتی میرے اقوال کو اس لئے اختیار کر لیتا کہ میں اچھے طریقہ پر قیاس واجتہاد کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جن راویوں نے البتی کو النبی پڑھ دیا وہ ہل اری کو ہل الدین، پڑھ دیں تو کیا تعجب؟ اور چونکہ ہم امام طحاوی کے حوالہ سے بسند صحیح ثابت کر چکے ہیں کہ اس روایت میں راویوں نے تصحیف کر کے البتی کو النبی بنا دیا ہے۔ اس لئے دوسرے جملہ میں بھی ہمارے نزدیک تصحیف سے کام لیا گیا ہے۔ ورنہ طلوع اسلام جیسے ناواقفوں کے سوا کسی کی عقل باور نہیں کر سکتی کہ ایک عظیم الشان امام جس نے امت کے دلوں میں بہت بڑا مقام حاصل کر لیا ہے صدیوں سے امت اس کی پیروی کرتی چلی آ رہی ہے اعلانیہ یوں کہتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پالیتے تو میری بہت سی باتوں کی پیروی کر لیتے اور وہ دین جس کو قرآن میں تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ٥ کہا گیا ہے چند آدمیوں کی اچھی رائے کا مجموعہ ہے اور کچھ نہیں'' اور کوئی مسلمان بھی اس کی گردن نہیں ناپتا، نہ یہ امت دامن جھٹک کر اس سے الگ ہوتی ہے؟ اس کو پاگلوں ہی کی عقل ممکن سمجھ سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو خدانخواستہ اگر امام صاحب نے ایسی بیہودہ بات زبان سے نکالی ہوتی تو اسی وقت ان کی گردن اڑا دی جاتی اور ہر طرف سے لعنت و ملامت کے تیر برسنے لگتے۔ وہ زمانہ برطانیہ کی حکومت یا آج کی حکومتوں کا زمانہ نہ تھا اس وقت تو اس سے بھی کم تر بات پر گردن ناپ دی جاتی تھی۔ مگر طلوع اسلام نے اس جگہ پوری طرح عقل سے ہاتھ دھو لئے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ وہ کیسی بے تکی باتوں سے اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔ وہ اس بیہودہ مصحف (مبدل مہمل روایت سے خلق خدا کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ طلوع اسلام وہی کہتا ہے جو امام ابوحنیفہ نے کہا تھا کہ مرکز ملت نمائندگان امت کے مشورہ سے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو فیصلے کرے وہی شریعت اسلامی

کہلاتے ہیں اور یہ فیصلے زمانہ کے حالات کے ساتھ ساتھ قابل تغیر و تبدل ہوتے ہیں..... (سبحان اللہ یہ آج کل کی اسمبلیاں جن کے ممبر عموماً روٹی اور روپیہ یا دباؤ کے زور سے ایم این اے بنتے ہیں امت کے نمائندے ہوگئے اور آج کل کی مرکزی حکومتیں جن کو نہ دین کے اصول سے واسطہ نہ فروعات سے، مرکز ملت قرار پانے کے قابل ہوگئیں؟ اگر یہ سب واقعی امت کے نمائندے اور سچ مچ مرکز ملت بننے کے قابل ہوتے جب بھی ان کے فیصلے شریعت نہیں بن سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اس ناگفتہ بہ حالت میں) ہم واضح کر چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے ایسا کبھی نہیں کہا اور اگر وہ ایسی بے ہودہ باتیں زبان سے نکالتے ان کی گردن اڑا دی جاتی اور مدیر طلوع اسلام اس زمانہ میں ہوتا اور ایسی بات زبان یا قلم سے نکالتا تو اس کو اسی وقت روک دیا جاتا۔ یہ پاکستان ہی کی حکومت ہے جو دین مبین کے ساتھ ایسی کھلی گستاخی کرنے والوں کو نہیں روکتی بلکہ ان کو پھلنے پھولنے کا موقع دے رہی ہے۔ طلوع اسلام کو شرم نہیں آتی کہ تاریخ خطیب میں جو باتیں امام ابوحنیفہؒ کو بدنام کرنے کے لئے درج کی گئی تھیں جن کے راویوں کی قلعی کھول کر اس وقت سے آج تک ملت حنفیہ امام ابوحنیفہؒ کے دامن کو ان لغویات سے پاک ثابت کرتی آ رہی ہے طلوع اسلام اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے اپنے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے دامن کو بھی ان لغویات سے ملوث کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر وہ یاد رکھے کہ حق حق ہے اور باطل باطل ہے اس کی کوشش سے امام ابوحنیفہ کا دامن تو ان کفریات سے ملوث نہیں ہوسکتا مگر اس بیہودہ کوشش نے طلوع اسلام کی غلطیوں کو پوری طرح طشت ازبام کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ ان کفریات کو جنہیں مجروح، کمزور، جھوٹے یا متعصب راویوں نے امام صاحب کی طرف غلط طور سے منسوب کیا تھا عین ایمان سمجھتا ہے اور انہیں اپنے مسلک کی تائید میں خوشی کے شادیانے بجا کر پیش کر رہا ہے یہ صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد طلوع اسلام نے یہ عنوان قائم کر کے کہ ''جس چیز کا مدار نقل در نقل روایت پر ہو وہ دین نہیں بن سکتی۔'' دعویٰ کیا ہے کہ ''اگر کوئی شخص یوں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ کعبہ حق ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ آیا کعبہ وہی ہے جو مکہ میں ہے یا کوئی اور

ہے تو یہ شخص سچا مومن ہے۔ یا کوئی یوں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ، اللہ کے نبی ہیں، مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آیا یہ وہی ہیں جن کی قبر مدینہ میں ہے یا اور کوئی ہیں تو یہ شخص بھی سچا مومن ہے۔'' پھر اسی مضمون کو چند طرق سے بحوالہ تاریخ خطیب امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے (جس کی حقیقت عن قریب واضح ہو جائے گی) اس کے بعد لکھتا ہے کہ'' آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ اور دین کا فرق کس قدر نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔''

گویا اس کے نزدیک کعبہ کا مکہ میں ہونا بھی تاریخی واقعہ ہے اور دین میں داخل نہیں کیونکہ وہ تو نقل در نقل روایت سے معلوم ہوا ہے۔ گویا اس کے نزدیک آیت قرآنی اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥ بھی کوئی تاریخی روایت ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا، اس کو اپنی قیام گاہ بنانا بھی محض تاریخی روایت ہے قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں؟ یہ ہے منکرین حدیث کی قرآن دانی اور قرآن فہمی۔

اس کے بعد میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ قرآن کلام اللہ ہے مگر میں نہیں جانتا کہ یہ وہی ہے جو تیس سیپاروں میں تقسیم کیا گیا ہے یا وہ ہے جس کے بقول بعض شیعہ چالیس سیپارے تھے۔ اس کے بارے میں طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟

وہ ہمیں بتلائے کہ جس دلیل سے اس نے کعبہ کے مکہ میں ہونے کو اور قبر رسولؐ کے مدینہ میں ہونے کو تاریخی واقعہ قرار دیا ہے اسی دلیل سے اس قرآن کا جس کے تیس سیپارے کئے گئے ہیں کلام اللہ ہونا تاریخی واقعہ ٹھہرتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے نہ جاننے والے کو بھی سچا مومن اور پکا مسلمان کہنا چاہیے؟ ورنہ فرق بتلائے کہ تیس سیپارے والے قرآن کا کلام اللہ ہونا تاریخی واقعہ کیوں نہیں۔ اور کعبہ کا مکہ میں ہونا تاریخی واقعہ کیوں ہے؟ رہا یہ کہ آسمان کے نیچے یقینی چیز اللہ کی کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اس نے خود لیا ہے۔'' تو یہ بھی اسی تیس سیپارے والے قرآن کی ایک آیت کا مضمون ہے جس

کا کلام اللہ ہونا طلوع اسلام کے اصول پر محض ایک تاریخی واقعہ ہے اور تاریخ یقینی نہیں بلکہ ظنی چیز ہے تو اس کی اس مہمل منطق سے قرآن بھی یقینی نہیں ٹھہرتا بلکہ ظنی ہوا جاتا ہے۔ ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ طلوع اسلام اس گرفت سے کس طرح نکلنے کی کوشش کرتا ہے؟ اس کا معقول جواب تو ہرگز وہ نہیں دے سکتا اور نامعقول جواب سے کون کس کی زبان پکڑ سکتا ہے؟

حمیدی اور نعیم بن حماد

اب ان روایات کی حقیقت سنیے جو امام صاحب کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اس کی ایک سند میں بخاری کے راوی حمیدی ہیں اور امام بخاری کے راویوں میں حمیدی اور نعیم بن حماد کو امام صاحب سے للّٰہی بغض ہے۔ نعیم بن حماد کے متعلق تو ابو بشر دولابی نے تصریح کی ہے کہ ابوحنیفہ کے معائب میں ایسی روایتیں گھڑتا ہے جو سراسر جھوٹ اور بہتان ہوتی ہیں۔ مگر حمیدی بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ حنفیہ سے اس کو سخت تعصب ہے ان کی آبرو کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ خود اسی تاریخ خطیب کے ص ۴۰۷ میں حنبل بن اسحٰق ہی کے حوالہ سے یہ روایت موجود ہے کہ حمیدی امام ابوحنیفہ کی کنیت بدل کر ابو جیفہ کہا کرتا تھا۔ مسجد حرام میں اعلانیہ اپنے حلقہ درس میں صاف صاف ایسا کہتا اور کچھ پروا نہ کرتا۔ شریعت میں تنابز بالالقاب (کسی کو برا لقب دینا) حرام ہے۔ جو شخص اس جرم کا ارتکاب مسجد حرام میں بیٹھ کر کرتا ہو اس کے تعصب کا آپ خود ہی اندازہ کرلیں، یہ شخص کمال تعصب اور بدزبانی میں مشہور ہے بلکہ امام شافعیؒ کے شاگرد محمد بن عبدالحکم نے تو عام گفتگو میں اس کو جھوٹا بتلایا ہے۔ اگرچہ حدیث رسول میں ثقہ کہا جاتا ہے۔ اگر یہ شخص سفیان بن عیینہ کی احادیث کا حافظ اور راوی نہ ہوتا تو لوگ اس کی بدزبانی اور شدت تعصب کی وجہ سے اس کو منہ بھی نہ لگاتے نہ اس کی احادیث کو روایت کرتے۔ اور غالباً امام شافعیؒ نے ایک بار عبداللہ بن مبارک کے یہ اشعار پڑھ کر اسی پر اشارہ کیا ہے۔

الا یا جیفة تعلوک جیفه واعیا قارئ ما فی صحیفه

امثلک لا هدیت ولست تهدے — یعیب اخا العفاف ابا حنیفه
تعیب مشمرا سهر اللیالی — وصام نهاره للّٰه خیفه
وصان لسانه عن کل افک — وما زالت جوارحه عفیفه
وعض عن المحارم والمناهی — ومرضاة الالٰه له وظیفه
فمن کابی حنیفة فی نداه؟ — لاهل الفقر فی السنة الجحیفه

ترجمہ:-''ارے مردار جس پر دوسرا مردار سوار ہے اور پڑھنے والے کو جس کے نامۂ اعمال کا پڑھنا دشوار ہے۔ تجھے ہدایت نہ ہو اور تو ہدایت پر نہیں آسکتا کیا تیرا یہ منہ ہے کہ تو پاک دامن امام ابوحنیفہ پر عیب لگاتا ہے۔تو ایسے شخص پر عیب لگا رہا ہے جو راتوں کو کمر کس کر نماز پڑھتا اور اللہ کے خوف سے دن کو روزہ رکھتا تھا، جس نے اپنی زبان بیہودہ بات سے محفوظ کر لی تھی اور اس کے تو سارے ہی اعضا ہمیشہ پاک صاف رہتے تھے۔حرام مواقع سے نگاہ کو بچاتا تھا اور اللہ کی رضا حاصل کرنا ہی اس کا وظیفہ اور مشغلہ تھا پھر قحط سالی کے زمانے میں فقراء کے اوپر سخاوت کرنے میں بھی تو ابوحنیفہ جیسا کوئی نہ تھا۔''

شارح ملل ونحل نے تو ان اشعار کو خود امام شافعیؒ کا بتایا ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ امام نے بطور تمثل کے ان کو اس موقعہ پر پڑھ دیا ہے ورنہ یہ ان کا اپنا کلام نہیں بلکہ عبداللہ بن المبارک کا منظوم کلام ہے۔ بہر حال حمیدی کی فحش گوئی اور بدزبانی کے جواب میں امام شافعی کا ان اشعار کو پڑھ دینا اور ہمارا نقل کر دینا ہی کافی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر اس روایت میں حمیدی کا اضطراب بھی ملاحظہ ہو،کبھی حمزہ بن الحارث سے روایت کرتا ہے کبھی بلاواسطہ حارث سے روایت کرتا اور حارث بن عمیر کے متعلق ذہبی کا فیصلہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کا ضعف کھلا ہوا ہے کیونکہ ابن حبان نے کتاب الضعفاءُ میں کہا کہ یہ شخص ثقات سے موضوع اور گھڑی ہوئی باتیں روایت کرتا

ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ شخص امام جعفر صادق اور حمید (طویل) سے موضوع حدیثیں روایت کرتا ہے۔ پھر یہ بات کس کی عقل میں آسکتی ہے کہ امام ابوحنیفہ ایسی صریح کفر کی بات مسجد حرام میں زبان سے نکالیں اور اس کا نقل کرنے والا ایک کذاب کے سوا دوسرا کوئی نہ ہو؟ اور اس بدترین کلمہ کفریہ پر امام صاحب کو کچھ سزا بھی نہ دی گئی ہو؟ سفید جھوٹ اسی کو کہتے ہیں۔

امام صاحب کا فتویٰ تو کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ جس کو حافظ ابن ابی العوام نے اپنی سند سے حسن بن ابی مالک سے امام ابو یوسف سے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص غیر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا ارادہ کرے گا کافر ہو جائے گا۔ اگرچہ غلطی سے اس نے کعبہ ہی کی طرف نماز پڑھ لی ہو۔ پھر فرمایا کہ میں نے کسی کو اس کے خلاف کہتے نہیں سنا۔ دوسری سند میں بھی حمیدی متعصب منہ پھٹ اور حارث بن عمیر کذاب دونوں موجود ہیں اور تیسرا احمد بن محمد باغندی بھی دھرا ہوا ہے۔ جس کے متعلق محدثین نے طویل کلام کیا ہے۔ ابراہیم بن الاصبہانی نے اس کو جھوٹا بتلایا ہے اور تماشا یہ ہے کہ باپ بیٹے بھی باہم ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے تھے۔ اور اکثر ناقدین کی رائے میں دونوں ایک دوسرے کی تکذیب میں سچے ہیں۔ یہ ہیں وہ موضوع اور غلط روایات جن کو طلاع اسلام اپنے مسلک باطل کی تائید میں پیش کر کے جاہلوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔

باغندی کی روایت

باغندی کی روایت میں ایک سفید جھوٹ یہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ''عبداللہ بن زبیر (حمیدی) کے پاس امام احمد بن حنبلؒ کا خط آیا کہ مجھے امام ابوحنیفہؒ کا کوئی شنیع ترین (بدترین) قول لکھ کر بھیج دو۔ الخ''

دنیا کو معلوم ہے کہ حمیدی حجازی ہے وہ امام صاحب کے شاگردوں کے حلقہ میں نہ کبھی بیٹھا نہ ان کی فقہ کو پڑھا۔ اور امام احمد بن حنبلؒ عراقی ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان

کے اکثر اجلہ اصحاب بھی عراقی ہیں۔ امام احمد نے امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے علم فقہ و حدیث بھی حاصل کیا ہے تو یہ الٹی گنگا کیسے بہنے لگی کہ امام احمدُ حمیدی سے امام ابوحنیفہ کے اقوال دریافت کرنے لگے؟ اگر معاملہ برعکس ہوتا قیاس میں آ بھی سکتا تھا۔ مگر جھوٹوں کو اچھی طرح جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا، اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جن سے جلدی بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسی طرح اہل باطل کو رسوا کیا کرتا ہے۔

اس کے بعد تیسری سند بھی ایسی ہی ہے اس میں بھی حارث بن عمیر کذاب موجود ہے۔

چوتھی روایت میں سفیان ثوری کہتے ہیں ہم سے عباد بن کثیر نے بیان کیا کہ میں نے ابوحنیفہ سے پوچھا ایک آدمی کہتا ہے کہ میں کعبہ کو برحق مانتا ہوں کہ وہ اللہ کا گھر ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ مکہ میں[1] ہے یا خراساں میں الخ۔

اس کی سند میں عامر بن اسمٰعیل ابو معاذ بغدادی مجہول ہے۔ پھر امام سفیان ثوری نے عباد بن کثیر کو جھوٹا بتلایا ہے اور اس سے روایت کرنے کو منع کیا ہے تو یہ کیسے عقل میں آ سکتا ہے کہ وہ خود اس سے روایت کریں؟ اسی سے اس حکایت کا من گھڑت، جھوٹ اور موضوع ہونا واضح ہے۔ ایسی جھوٹی روایات پر طلوع اسلام کا اپنے مسلک کی عمارت قائم کرنا خود اس کے مسلک کے غلط اور جھوٹا ہونے کی دلیل ہے۔

---

[1] خطیب بغدادی علامہ ابن حزم کی رائے کا بہت اتباع کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب الفصل ج ۳ ص ۲۴۹ میں لکھا ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں مگر یہ نہیں جانتا کہ آپ زندہ ہیں یا نہیں اور آپ عربی ہیں یا فارسی، حجاز میں تھے یا خراسان میں؟ تو اگر یہ شخص جاہل ہے سیر و اخبار کا کچھ علم نہیں رکھتا۔ اس کو تعلیم دینا واجب ہے۔ کافر نہیں کہا جائے گا۔ اور اگر صاحب علم ہے حقیقت سے باخبر ہے پھر عناداً ایسی بات کہتا ہے تو کافر مرتد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے مفتی اور بہت سے نیک آدمی نہیں جانتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کو کتنی مدت ہوئی، نہ یہ جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تھے کس شہر میں تھے، ان کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ایک ہستی جن کا نام نامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دین کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا تھا تو اگر بالفرض امام صاحب نے یہ باتیں کہی بھی ہوں تو ان کو نو مسلم جاہل پر محمول کرنے سے کیا بات مانع ہے؟

تاریخ میں دروغ بیانی

اس کے بعد بڑی جسارت کیساتھ تاریخ میں دروغ بیانی سے کام لے کر دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر ''صحیح حدیث کا واجب التعمیل اور ناقابل تبدیل ہونا امام شافعی کا مذہب ہے وہی اس مسلک کے سب سے پہلے اور بڑے داعی ہیں۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ امت میں دو گروہ سامنے آتے ہیں ایک وہ جو صحابہ اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کا پابند تھا۔ یعنی جو احادیث کو غیر متبدل نہیں مانتا تھا۔ اور دوسرا گروہ جو امام شافعی کے مسلک کا پابند تھا اور حدیث کو ہمیشہ کے لئے واجب الاتباع خیال کرتا تھا۔ اول گروہ کو اصحاب الرائے کے نام سے مشہور کیا گیا اور دوسرا گروہ اصحاب الحدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ (طلوع اسلام)

اس دروغ بے فروغ کا صریح جھوٹ ہونا اسی سے واضح ہے کہ امام ابوحنیفہ کے اجلہ اصحاب امام محمد بن الحسن الشیبانی اور امام ابو یوسف اور عبداللہ بن المبارک وغیرہم کی کتابیں احادیث نبویہ کے ساتھ احتجاج سے بھری پڑی ہیں۔ امام محمدؒ کی کتاب الحج اور موطا آج بھی دنیا میں موجود ہیں جس میں مذہب مالک کے بہت سے مسائل کو احادیث کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف نے کتاب ''اختلاف ابی حنیفۃ وابن ابی لیلی'' میں ابن ابی لیلیٰ کے مذہب کو حدیث ہی سے رد کیا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس سے قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ امام شافعی کے یہاں مرسل حجت نہیں۔ پھر امام ابوحنیفہؒ انواع قیاس میں سے صرف دو قسموں یعنی قیاس موثر اور قیاس طرد کو لیتے ہیں اور بعض روایات میں قیاس طرد کو بھی نہیں لیتے صرف قیاس مؤثر کو استعمال کرتے ہیں اور قیاس اشبہ اور قیاس مناسبت کو تو اصلاً استعمال نہیں کرتے۔ مگر امام شافعیؒ چاروں قسموں سے کام لیتے ہیں۔ پھر امام شافعی کو قائلین حجیت حدیث کا امام کیسے مانا جاسکتا ہے جب کہ وہ صرف حدیث صحیح کو حجت کہتے ہیں مرسل کو حجت نہیں مانتے، حالانکہ ہزارہا احادیث مراسیل ہیں جن کو وہ مرسل کہہ کر رد کر دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ

ان کو رد نہیں کرتے بلکہ قیاس پر مقدم کرتے ہیں۔ پھر امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدیث رسولؐ کے بعد قول صحابی بھی حجت ہے بلکہ اس تابعی کا قول بھی حجت ہے جو صحابہ کے زمانہ میں فتویٰ دیتا رہا ہو۔ وہ قول صحابی اور تابعی کبیر کے مقابلہ میں قیاس سے ہرگز کام نہیں لیتے اور اصحاب امام شافعی کے نزدیک نہ قول صحابی حجت ہے نہ قول تابعی بلکہ قیاس کو اس پر مقدم کرتے ہیں۔ پھر تماشا ہے کہ امام شافعی اور ان کے اصحاب تو اہل الرائے نہ ہوں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اہل الرائے ہو جائیں۔

کیا طلوع اسلام کو معلوم نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو اور نماز دونوں ٹوٹ جاتے ہیں کیونکہ اس باب میں چند مرسل حدیثیں وارد ہیں جن کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا گیا۔ اور امام شافعی اور جمہور فقہا قہقہہ سے صرف نماز کو فاسد کہتے ہیں، وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں کیونکہ وہ قیاس کو حدیث مرسل پر مقدم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ سفر میں وضو بالنبیذ کے قائل تھے کہ اگر مسافر کے پاس پانی نہ ہو اور چھوہارے پانی میں بھگو کر نبیذ بنایا ہوا اس کے پاس موجود ہو تو اس سے وضو کرنا ضروری بتلاتے تھے کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک حدیث اس باب میں موجود ہے۔ جس سے قیاس کو ترک کر دیا گیا مگر امام شافعیؒ وغیرہ نبیذ سے وضو کو جائز نہیں کہتے بلکہ اس حالت میں تیمّم کا حکم دیتے ہیں اور عبداللہ بن مسعود کی حدیث کو مرسل اور منقطع کہہ کر رد کرتے اور قیاس کو اس پر مقدم کرتے ہیں۔ تو کیا طلوع اسلام کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ یا ان کے اصحاب نے امام شافعی اور اہل حدیث سے مرعوب ہو کر یہ مسائل اپنے مذہب میں داخل کیے تھے؟ اس کے علاوہ صدہا مسائل حنفیہ کے مذہب میں ایسے موجود ہیں جن میں حنفیہ نے حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا ہے اور امام شافعیؒ نے قیاس پر عمل کیا ہے حدیث پر عمل نہیں کیا کیونکہ وہ ان کے نزدیک ضعیف تھی۔ تو اسی کا نام مرعوبیت ہے؟ ابن حزم و ابن تیمیہ و ابن القیم وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مذہب میں حدیث ضعیف قیاس سے مقدم ہے اور اس پر حنفیہ کا اجماع نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں جو حدیث کو مطلقاً حجت سمجھتے ہیں خواہ صحیح ہو یا مرسل ہو یا

ضعیف ہو۔ بشرطیکہ زیادہ ضعیف نہ ہو۔

پھر یہ بھی غلط ہے کہ حنفیہ کو اصحاب الرائے کا لقب امام شافعیؒ کے مقابلہ میں دیا گیا۔ بلکہ یہ لقب امام شافعیؒ کی ولادت سے بھی پہلے ان فقہاء کو دیدیا گیا تھا۔ جو صرف روایت حدیث پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ احادیث سے احکام مستنبط کرتے تھے چنانچہ اہل علم کو بخوبی معلوم ہے کہ امام مالکؒ کے استاد ربیعۃ بن عبدالرحمٰن کا لقب ربیعۃ الرائے تھا جن کو امام شافعیؒ نے دیکھا بھی نہیں۔

اسی طرح امام مالکؒ کے اصحاب میں جو لوگ فقیہ تھے ان کو بھی اہل الرائے کہا جاتا اور ان کے مقابلہ میں جو اصحاب صرف روایت کرنے والے تھے ان کو اہل الحدیث کہا جاتا تھا۔ علامہ حافظ ابن عبدالبر اندلسی اپنی کتاب الانتقاء فی فضائل الثلٰثۃ الفقہاء" میں لکھتے ہیں کہ امام مالک سے امام ابوحنیفہ کے متعلق اقوال شنیعہ روایت کرنے والے ان کے وہ اصحاب ہیں جو اہل حدیث کہلاتے ہیں اور جو اہل الرائے فقہاء ہیں[1] وہ امام مالک سے اس قسم کی باتیں اصلاً روایت نہیں کرتے قال ابن عبدالبر فی الانتقاء (ص ۱۵۰) روی ذلک کلہ عن مالک اھل الحدیث و اما اصحاب مالک من اھل الرای فلا یروون من ذلک شیئا عن مالک. اھ ابوالولید باجی نے "المنتقی شرح المؤطا" میں تصریح کی ہے کہ امام مالک سے فقہاء کی شان میں کوئی کلام یا جرح ثابت نہیں۔ انہوں نے صرف راویان حدیث میں ضبط وغیرہ کی جہت سے کلام کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ امام مالک عبداللہ بن مبارک کی بہت تعظیم کرتے تھے جو امام ابو حنیفہ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ اھ تانیب ص ۱۱۷۔

طلوع اسلام کی دیانت

اس کے بعد طلوع اسلام نے امام شافعیؒ کی کتاب الام سے انکار حدیث کے

---

[1] یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل الرائی فقہاء کو کہا جاتا ہے جو حدیث و قرآن سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ اہل الرائے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ حدیث پر قیاس یا رائے کو مقدم کرتے ہیں جیسا طلوع اسلام نے سمجھا ہے۔

متعلق متکلمین اور اصحاب الرائے کے دلائل بیان کئے ہیں۔ مگر دیانت ملاحظہ ہو کہ امام شافعی کا جواب نقل نہیں کیا کیونکہ جواب نقل کرنے سے اس کی ساری بنی بنائی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنے جواب میں قرآن اور سنت مشہورہ اور سلف امت کے اجماع و تعامل سے خبر واحد صحیح کا حجت شرعیہ ہونا اچھی طرح ثابت کر دیا ہے جس کے بعد یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ حدیث صحیح کا واجب التعمیل اور نا قابل تبدیل ہونا صرف امام شافعیؒ کا مسلک ہے وہی اس کے سب سے پہلے اور بڑے داعی ہیں۔ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ان سے زیادہ حجیت حدیث کے قائل ہیں۔

طلوع اسلام اور عقیدہ خلق قرآن

اس کے بعد فتنہ مسئلہ خلق قرآن کا ذکر کرتے ہوئے طلوع اسلام نے دعویٰ کیا ہے کہ ''عقیدہ خلق قرآن کے مؤید وہی لوگ تھے جو دین میں قرآن و اجتہاد کے پابند تھے (حدیث کے پابند نہ تھے) پھر ایک قدم آگے بڑھا کر یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی ان ہی کے ہم نوا تھے بلکہ بعض شہادات سے تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے انہوں ہی نے یہ کہا کہ قرآن مخلوق ہے اھ لا الہ الا اللہ

اس عبارت میں طلوع اسلام نے اقرار کرلیا ہے کہ وہ خود بھی ''عقیدہ خلق قرآن'' کا حامی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو بھی (معاذ اللہ) اس کا حامی سمجھتا ہے۔ اسی لئے تو میرا خیال ہے کہ ''منکرین حدیث'' خارجیوں کے ہم نوا ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا خلق قرآن کا قائل ہونا تو یہ ایسا سفید جھوٹ ہے جسے کوئی عاقل بھی ایک سیکنڈ کے لئے تسلیم نہیں کرسکتا۔ امام ابوحنیفہؒ کا خط عثمان بتی عالم بصرہ کے نام اور ان کا رسالہ ''الفقہ الاکبر'' کتب خانہ خدیویہ مصر میں قلمی بھی موجود ہے اور طبع بھی ہو چکا ہے جس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں ان میں عقیدہ خلق قرآن کی صراحۃ تردید موجود ہے۔ تاریخ الخطیب البغدادی کا جائزہ ہم پہلے لے چکے اور بتلا چکے ہیں کہ اس میں خطیب کی وفات کے بعد بہت زیادات والحاقات ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کی ان

روایات پر جن میں امام صاحب کا قرآن کو مخلوق کہنا مذکور ہے کسی درجہ میں بھی اعتبار کرنا ہرگز جائز نہیں۔ خصوصاً جب کہ ہر روایت کی سند میں ضعفاء و مجروحین و مجہولین دھرے ہوئے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے دشمنوں کو اتنی ہی بات پر صبر نہ آیا کہ ان کی طرف خلق قرآن کا مسئلہ منسوب کر دیں بلکہ انہیں اس قول کا موجد اور اول قائلین بنا دیا اور اس جھوٹ کو امام ابو یوسف کے واسطہ سے وضع کیا جو امام ابو حنیفہؒ کے اخص الخاص شاگرد ہیں ان سے روایت کرنے والا امام حسن بن ابی مالک کو ٹھہرایا جو امام ابو یوسفؒ کے اخص الخاص تلامذہ میں سے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کا غایت درجہ ادب واحترام کرنے والے ہیں۔

خزاز و رزاز

اب سنیئے اس من گھڑت افسانہ کی سند میں محمد بن عباس الخزاز ہے جس پر خود خطیب نے (ج ۳ ص ۱۲۲) میں جرح کی ہے کہ وہ ابو الحسن بن الرزاز کی کتاب سے روایتیں بیان کیا کرتا تھا حالانکہ اس میں اس کا سماع نہ تھا اور رزاز کے بیٹے نے اپنے باپ کی کتاب میں بہت اضافات کئے تھے جو بالکل تازہ تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی کتاب سے روایت کرنے والے پر کسی درجہ میں بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس کے بعد اسحٰق بن عبدالرحمٰن راوی مجہول ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ امام ابو یوسف کے ترجمہ میں خود ان کو جہمی کہا گیا ہے اگر وہ جہمی تھے تو مسئلہ خلق قرآن کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ کی مذمت کیسے کر سکتے تھے؟ اور اگر اس مسئلہ کی وجہ سے وہ امام صاحبؒ کی مذمت کرتے تھے تو ان کا جہمی ہونا غلط ہے۔ مگر دروغ گورا حافظہ نباشد۔ جھوٹوں کی علامت ہی یہ ہے کہ ان کے اقوال میں تضاد ہوتا ہے۔ انہیں یاد نہیں رہتا کہ ہم نے پہلے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔

مورخین مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے قرآن کو مخلوق کہا وہ جعد بن درہم ہے اس کے بعد جہم بن صفوان اس کا قائل ہوا۔ پھر بشر بن غیاث مریسی۔ ملاحظہ ہو کتاب شرح السنۃ لالکائی اور کتاب الرد علی الجہمیۃ لابن ابی حاتم وغیرہما۔

تاریخ خطیب میں دو سندوں سے امام ابو یوسف کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ میں تو خلق قرآن کا قائل نہیں ہوں، مگر ابو حنیفہ اس کے قائل تھے۔

مگر پہلی سند میں ابو القاسم بغوی ہے جس کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے کہ میں نے علماء اور مشائخ بغداد کو اس کے ضعف پر متفق پایا ہے۔ اور دوسری سند میں عمر بن الحسن الاشنانی القاضی ہے جس کو دارقطنی نے ضعیف کہا ہے اور حاکم نے جھوٹا بتلایا۔ اس کے بعد اصمعی ہے جس کو ابوزید انصاری نے جھوٹا کہا اور علی بن حمزہ بصری نے اپنی کتاب ''التنبیہات علی الاغلاط فی الروایات'' میں اس کی بہت سی غلطیاں روایات میں بیان کی ہیں جن سے ابوزید انصاری کے قول کی تائید ہوتی ہے اور خود خطیب نے اس کے نوادر میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ بھی کم نہیں ہے۔ ابو قلابہ جرمی نے اصمعی کے جنازہ کے ساتھ جو اشعار پڑھے ہیں ان میں بتلایا گیا ہے کہ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت اور طیبین وطیبات سے بغض تھا۔ اس کے بعد سعید بن سلم باہلی سے جو ہارون رشید کے زمانہ میں ارمینیہ کا عامل تھا جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں پر بہت آفتیں نازل ہوئی تھیں۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس سے اس باب میں روایت کی جائے نہ ایسے مسائل میں اس کا قول قابل قبول ہے۔

حافظ لالکائی نے شرح السنۃ میں ابوالحسن علی بن محمد رازی سے ابوبکر محمد بن مہرویہ رازی سے محمد بن سعید بن سابق سے روایت کیا ہے کہ میں نے امام ابو یوسف سے پوچھا آپ خلق قرآن کے قائل ہیں؟ کہا نہیں نہ میں قائل ہوں نہ امام ابو حنیفہ یہ جواب انہوں نے اس طرح دیا جیسا کہ میرے سوال پر ان کو انکار او رتعجب تھا۔ حافظ ابن ابی العوام اور حافظ صمیری وغیرہما نے صحیح اسانید کے ساتھ امام ابو یوسف اور حسن بن ابی مالک اور احمد بن القاسم البرقی سے متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے امام ابو حنیفہ کا خلق قرآن کے قول سے بری ہونا۔ بخوبی واضح ہے اب جو لوگ اپنے من گھڑت طریقوں سے اس کے خلاف روایتیں لاتے ہیں وہ خود ہی سر کے بل گر پڑتے ہیں۔ اتمام حجت کے لئے حافظ ابن ابی العوام کی ایک روایت یہاں پیش کی جاتی ہے وہ کہتے ہیں ہم سے

محمد بن احمد بن حماد نے بیان کیا ان سے محمد بن شجاع (ثلجی) نے، وہ کہتے ہیں میں نے حسن بن ابی مالک سے سنا انہوں نے امام ابو یوسف سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ ایک شخص جمعہ کے دن مسجد کوفہ میں آیا، اور (علماء کے) سب حلقوں میں گھومتا پھرتا۔ ان سے قرآن کے متعلق سوال کرتا تھا (کہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟) امام ابو حنیفہؒ اس وقت مکہ میں تھے۔ (کوفہ میں نہ تھے) لوگ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے لگے اور گڑ بڑ میں پڑ گئے۔ بخدا یہ شخص میرے گمان میں نرا شیطان تھا جو انسان کا روپ بھر کر آیا تھا۔ وہ ہمارے حلقہ میں بھی پہنچا اور ہم سے بھی یہی سوال کیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے دوسرے کو جواب دینے سے روک دیا۔ ہم نے اس سے کہہ دیا کہ ہمارے شیخ اس وقت یہاں نہیں ہیں اور ہم ان سے پہلے اس مسئلہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتے وہی اس کا جواب دیں گے۔ یہ سن کر وہ شخص چلا گیا۔ ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جب امام صاحب تشریف لائے ہم نے قادسیہ میں ان کا استقبال کیا اور سلام عرض کیا۔ انہوں نے گھر والوں اور بستی والوں کی خیریت دریافت کی ہم نے ان کا حال بتلایا۔ پھر ہم نے موقعہ دیکھ کر عرض کیا کہ اے امام ابو حنیفہ! ایک سوال ہمارے پاس آیا تھا اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ سوال ابھی ہمارے دل میں ہی تھا کہ ہم نے امام صاحب کا چہرہ بدلا دیکھا وہ سمجھ گئے کہ یہ تو فتنہ برپا کرنے والا کوئی سوال ہے اور ہم نے اس کے متعلق کچھ گفتگو کی ہے۔ فرمایا کیا سوال تھا؟ ہم نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ امام صاحب نے کچھ دیر سکوت کر کے پوچھا پھر تم نے اس کا کیا جواب دیا؟ ہم نے کہا اس کے متعلق ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں اندیشہ ہوا ایسا نہ ہو ہمارے منہ سے کوئی ایسا جواب نکل جائے جو آپ کو ناپسند ہو۔ یہ سن کر امام کا چہرہ چمک گیا اور الجھن دور ہو گئی فرمایا جزاکم اللہ خیرا، جزاکم اللہ خیرا۔ میری وصیت یاد رکھو اس مسئلہ میں ایک لفظ بھی نہ کہنا اور نہ کسی سے اس کے متعلق گفتگو کرنا۔ بس اتنا ہی کہو کہ قرآن اللہ عز و جل کا کلام ہے۔ اس سے آگے ایک حرف نہ بڑھانا۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسئلہ طول پکڑے گا یہاں تک کہ مسلمانوں کو ایسے فتنہ میں مبتلا کر دے گا کہ نہ اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو سکیں گے نہ بیٹھ ہی سکیں گے اللہ ہمیں اور تمہیں شیطان مردود (کے فتنہ)

سے بچائے۔''

مسئلہ خلق قرآن میں یہ ہے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک، اور یہ ہے امام ابو یوسفؒ کا اور ان کے ساتھیوں کا ادب، معاذ اللہ وہ اپنے استاد کی شان میں ایسے بے ادب گستاخ نہ تھے۔ جیسا تاریخ خطیب کے جھوٹے راویوں نے بیان کیا ہے۔ غضب یہ کہ ان ظالموں نے امام صاحبؒ کے استاد حماد بن ابی سلیمان کی طرف بھی یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ کے پاس پیغام بھیجا (بعض روایات میں امام سفیان ثوری کو پیغام بر بنایا گیا ہے) کہ میں تمہاری باتوں سے بیزار ہوں مگر یہ کہ توبہ کرلو (سفیان ثوری کو جس روایت میں پیغام بر بنایا ہے اس میں خلق قرآن کا قول مراد ہے) مگر ان بہتان باندھنے والوں کو اتنی خبر نہیں کہ مورخین مذاہب کا اتفاق ہے کہ خلق قرآن کا قول سب سے پہلے جعد بن درہم نے ۱۲۰ھ کے چند سال بعد شروع کیا تھا اور حماد بن ابی سلیمان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہو چکی تھی۔ جعد کے بعد اس قول کو جہم بن صفوان نے پھیلایا جو ۱۲۸ھ میں گرفتار ہوا اور اسی سال قتل ہوا۔ اس کے بعد بشر بن غیاث نے اس قول کو لیا۔ تو یہ کیسے عقل میں آ سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے استاد کی زندگی میں ۱۲۰ھ سے پہلے یہ بات زبان سے نکالی ہو حالانکہ یہ بات سب سے پہلے جعد بن درہم کی زبان سے ۱۲۰ھ کے چند سال بعد نکلی ہے۔ پھر دنیا جانتی ہے کہ امام ابوحنیفہ اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان کی حیات میں برابر ان کی خدمت میں رہے سب شاگردوں سے زیادہ وہی ان کے پاس رہتے اور ان کے گھر کا کام کاج بھی کرتے تھے۔ حماد بن ابی سلیمان کی وفات کے بعد امام ابوحنیفہ ہی سب شاگردوں کے اتفاق سے ان کے جانشین بنائے گئے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ سفیان ثوری کے واسطہ سے حماد بن ابی سلیمان کا پیغام امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچے حالانکہ سفیان سے زیادہ امام صاحب ان کی خدمت میں حاضر باش تھے۔ یہ تو وہ شواہد ہیں جو اس روایت کے متن کو غلط اور موضوع قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔

پھر سند کا حال یہ ہے کہ اس میں عمر بن محمد بن عیسیٰ السند ابی الجوہری دھرا ہوا ہے جو تنہا اس حدیث موضوع کا راوی ہے القرآن کلامی ومنی خرج قرآن میرا کلام

ہے اور مجھ سے ہی نکلا ہے۔ ملاحظہ ہو میزان (للذہبی) اس کے بعد اسمٰعیل بن ابی الحکم مجہول ہے اور یہ وہ اسمٰعیل بن ابی الحکیم نہیں جس کی وفات ۱۳۰ھ میں ہوئی ہے کیونکہ اس کو ہارون بن اسحٰق ہمدانی متوفی ۲۵۸ھ نہیں پا سکتا اور خطیب کی سند میں وہی اسماعیل سے روایت کر رہا ہے۔ یہ دوسرا اسمٰعیل ہے جس کے باپ کی کنیت ابو الحکم ہے ابو الحکیم نہیں اور وہ مجہول ہے۔ اور سفیان ثوری کو جس روایت میں پیغام بر بنایا گیا ہے اس کی سند میں محمد بن یونس کدیمی ہے جس پر میزان میں بہت جرح کی گئی ہے اس کے بعد ضرار بن صرد ہے جس کی کنیت ابونعیم اور لقب طحان ہے یحیٰی بن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ پھر بخاری کی کتاب خلق الافعال میں اس روایت کے اندر ابو حنیفہ کی جگہ ابو فلاں ہے۔ تاریخ خطیب کے راویوں نے ابوفلاں کو ابوحنیفہ بنا دیا۔ ایسا ہی ان لوگوں نے ابومسہر کی روایت میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ سلمہ بن عمرو قاضی نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا لا رحم اللّٰہ ابا فلان فانہ اول من زعم ان القرآن مخلوق خدا رحم نہ کرے ابوفلاں پر وہ پہلا شخص ہے جس نے قرآن کو مخلوق کہا۔ تاریخ ابن عساکر میں اسی طرح ہے۔ مگر تاریخ خطیب بغدادی کے ص ۳۷۸ و ۳۸۵ میں ابوفلاں کی جگہ ابوحنیفہ لکھ دیا گیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ تم نے کس دلیل سے ابوفلاں کو ابوحنیفہ بنا دیا؟ حالانکہ تمام روایتیں اس پر متفق ہیں کہ یہ قول سب سے پہلے جعد بن درہم نے کہا ہے مگر ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ بدل دینا اور خبر متواتر کے خلاف جعد بن درہم کے عوض کسی دوسرے کو اول قائل بنا دینا اہل تعصب کے مذہب میں روا ہے قال الحافظ اللالکائی فی شرح السنة ولا خلاف بین الامة ان اول من قال القرآن مخلوق الجعد بن درهم فی سنة نیف و عشرین و مائة اھ حافظ لالکائی نے شرح السنہ میں کہا ہے کہ امت اسلامیہ کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اول جس شخص نے قرآن کو مخلوق کہا ہے وہ جعد بن درہم ہے جس نے ۱۲۰ھ کے چند سال بعد سب سے پہلے یہ بات کہی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ خطیب بغدادی جیسا بہترین مصنف ایسا حیا باختہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ خود ہی ص ۳۷۶، ص ۳۸۲ میں امام ابو یوسف کے واسطہ سے امام ابوحنیفہؒ کا یہ

قول روایت کرتا ہے کہ خراساں میں دو جماعتیں انسانوں میں سب سے بدتر ہیں جہمیہ اور شبہہ۔ اور دوسری سند سے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن حمانی کے واسطہ سے روایت کرتا ہے کہ اس نے امام ابوحنیفہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جہم بن صفوان کافر ہے۔ پھر مثالب ابی حنیفہ میں ابن دوما اور احمد بن علی ابار جیسے کا ذبین کے واسطہ سے امام صاحب کی طرف مسئلہ، خلق قرآن کی نسبت کرتے ہوئے نہیں شرماتا اس لئے میں پھر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس تاریخ میں خطیب کی وفات کے بعد ضرور کچھ الحاقات ہوئے ہیں جیسا حافظ ابوالفضل مقدسی شافعی نے فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبداللہ بن احمد نے کتاب السنۃ میں ابن الشکاب اور ہیثم بن خارجہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں ہم نے ابو یوسف قاضی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خراسان میں دو جماعتیں ہیں۔ روئے زمین پر ان سے بدتر کوئی جماعت نہیں ایک جہمیہ دوسری مقاتلیہ۔ ان روایتوں سے صاف واضح ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ دونوں کا دامن تجہم اور تشبیہ سے بالکل پاک ہے۔ حافظ ابن ابی العوام نے اپنی سند سے نضر بن محمد سے امام ابوحنیفہ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ جہم اور مقاتل دونوں فاسق ہیں ایک نے تشبیہ میں غلو کیا اور دوسرے نے نفی (صفات) میں اھ۔ یعنی مقاتل نے خدا کو مخلوق جیسا کہہ دیا اور جہم نے خدا کو صفات سے معطل کر دیا۔ امام ابوحنیفہ سے جہم اور مقاتل کے عقیدہ کے رد میں اور بہت سی نصوص اور تصریحات موجود ہیں۔ پھر ان کی طرف جہمیہ کے خیالات کو منسوب کرنا صریح بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟

مگر طلوع اسلام کی جسارت ملاحظہ ہو کہ وہ عقیدہ خلق قرآن کا مؤید اس گروہ کو بتلاتا ہے جو دین میں قرآن اور اجتہاد کے پابند تھے اور امام ابوحنیفہ کو بھی (معاذ اللہ) ان کا ہم نوا قرار دیتا ہے اگر دین میں قرآن اور اجتہاد کا پابند ہونا اسی کا نام ہے تو ایسی پابندی طلوع اسلام ہی کو مبارک ہو۔ امت مسلمہ نے تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ نفرت کی ہے اور کرتی رہے گی۔

اس کے بعد محدثین پر چوٹ کرتے ہوئے (طلوع اسلام) لکھتا ہے کہ انہوں

نے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو خلق قرآن کے قائل تھے لوگوں میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو غیر مخلوق مانتے تھے ظاہر ہے کہ یہ حدیثیں قطعاً وضعی تھیں۔ الخ

مگر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ان حدیثوں کا وضعی ہونا بھی تم کو محدثین ہی نے بتلایا ہے۔ اس سے کسے انکار ہے کہ محدثین کی جماعت میں کچھ منکرین حدیث، خارجی اور شیعہ بھی گھس پڑے تھے۔ مگر اہل بصیرت محدثین ناقدین نے ان وضاعین کذابین کا پول اچھی طرح کھول دیا اور ان کی موضوع حدیثوں کو صحیح حدیثوں سے اس طرح الگ کر دیا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔

آگے چل کر لکھا ہے کہ ''سلطنت کے مصالح کچھ اس قسم کے تھے کہ اس نے پہلے گروہ کی مخالفت (کی جو دین میں قرآن و اجتہاد کے پابند اور خلق قرآن کے قائل تھے) اور دوسرے گروہ کی ہم نوائی کی'' (جو دین میں حدیث کے پابند اور خلق قرآن کے منکر تھے)۔

مگر اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ سلطنت کے مصالح کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ علماء تابعین کے اجماع کی بناء پر تھا کہ سب نے بالاتفاق جعد بن درہم اور جہم بن صفوان کے اس قول کو کہ قرآن مخلوق ہے کفر قرار دیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن ابی حاتم کتاب الرد علی الجہمیۃ میں سعید بن رحمت سے جو ابوالحسن فزاری کا شاگرد ہے روایت کرتے ہیں۔

ف، عقیدہ خلق قرآن کی تحقیق

جب علماء کو جہم بن صفوان کا یہ قول پہنچا کہ قرآن مخلوق ہے سب نے اس کو سنگین کلمہ شمار کیا اور اس پر اجماع کیا کہ اس نے کلمہ کفر کہا ہے اھ اور ظاہر ہے کہ علماء تابعین کا اس کے کفر پر اجماع اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس نے قرآن کو مطلقاً ہر جہت سے مخلوق کہا ہو، اور اگر وہ یہ کہتا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت کلام قائم بذات اللہ ہونے کی جہت سے قدیم غیر مخلوق ہے اور ہمارے ساتھ قائم ہونے اور ہماری تلاوت اور

صوت وغیرہ کے ساتھ ملتبس ہو جانے کی جہت سے حادث ہے تو نہ اسے کافر کہا جاتا نہ قتل کی سزا دی جاتی۔ کیونکہ قدیم کا حادث میں حلول کرنا محال ہے یہی امام صاحب نے فرمایا ما قام باللہ غیر مخلوق وما قام بالخلق مخلوق جس کی حقیقت کو اہل ظاہر حشویہ نہیں سمجھے اور امام صاحب کو بدنام کرنے لگے کہ یہ بھی وہی کہتے ہیں جو جہم بن صفوان کہتا ہے حاشا وکلا۔ امام بخاریؒ کو بھی ان لوگوں نے لفظی بالقرآن مخلوق حادث کہنے پر معتزلی بدعتی کہا اور بخارا سے نکال دیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ تو جہم کو اسی طرح کافر یا فاسق کہتے تھے جیسا تمام علماء تابعین نے کہا تھا۔ کیونکہ وہ صفات الٰہیہ کی نفی کر کے خدا کو معطل قرار دیتا تھا اور اس کو طلوع اسلام قرآن اور اجتہاد کی پابندی بتلاتا اور جعد بن درہم اور جہم جیسے گمراہوں کی ہم نوائی کا دم بھرتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد طلوع اسلام لکھتا ہے" چنانچہ خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے جعد کو عید الاضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا۔"

خالد قسری کا جعد کو ذبح کرنا غلط ہے

امام زہری جیسے حافظ حدیث پر تنقید کرنے والوں کو ذرا یہ بھی دیکھ لینا چاہیے تھا کہ اس افسانہ کا راوی کون ہے؟ اس کو صرف قاسم بن محمد بن حمید معمری روایت کرتا ہے جس کو ابن معین نے کذاب، خبیث کہا ہے۔ ملاحظہ ہو میزان ذہبی۔ پھر ابن کثیر وغیرہ تمام مورخین نے جعد بن درہم کے قتل کو ۱۲۴ھ میں بیان کیا ہے اور خالد بن عبداللہ قسری اس سے چار سال پہلے ولایت عراق سے معزول ہو چکا تھا۔ ۱۲۰ھ میں خالد کی جگہ یوسف بن عمر ثقفی ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں والیٔ عراق بنایا گیا تو جعد بن درہم کا قتل یوسف ثقفی کی ولایت میں ہو سکتا ہے۔ نہ کہ خالد قسری کی ولایت میں۔ پس یہ سارا افسانہ پادر ہوا ہو گیا کہ خالد قسری نے جعد کو عید الاضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا تھا؟ یقیناً علماء تابعین ایک شعار اسلام کے ساتھ، ایسے مذاق کو ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ ضرور خالد کی اس حرکت پر گرفت کرتے کیونکہ کسی واجب القتل کو قتل کر دینا اور بات ہے اور

قربانی کے طور پر ذبح کرنا اور بات ہے اگر خالد نے ایسا کیا ہوتا تو تاریخ اسلام میں اس کی سیرت پر کلنک کا ٹیکہ اور بہت بڑا دھبہ لگ جاتا۔ مگر طلوع اسلام کی ساری عقل و دانش صحیح حدیثوں کو قرآن و عقل کے خلاف قرار دینے ہی میں صرف ہوتی ہے۔ تاریخی واقعات میں اس کی عقل کو خدا معلوم کیا ہو جاتا ہے کہ وہاں ممکن اور ناممکن میں اصلاً تمیز نہیں کی جاتی۔

اس کے بعد لکھتا ہے ''اس طرح قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ امام ابوحنیفہ جیسے صاف گو اور جری شخص کو بھی دو تین مرتبہ اس خیال سے توبہ کرنا پڑی۔'' (طلوع اسلام)

ہم بتلا چکے ہیں کہ امام صاحب خلق قرآن کے قائل نہ تھے تو یہ بھی غلط ہے کہ ان کو اس خیال سے دو تین بار توبہ کرنا پڑی۔ اور اس بات میں جتنی روایتیں تاریخ خطیب میں مذکور ہیں وہ سند کے لحاظ سے روایۃً بھی لچر ہیں اور عقل کی رو سے درایۃً بھی غلط ہے۔ چنانچہ توبہ کرانے والوں میں ایک تو خالد بن عبداللہ قسری کا نام لیا جاتا ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ وہ ۱۲۰ھ میں ولایت عراق سے معزول ہو چکا تھا اس کے زمانہ ولایت میں مسئلہ خلق قرآن کا لفظ بھی کسی کی زبان پر نہ آیا تھا۔ کیونکہ سب سے پہلے جعد بن درہم نے ۱۲۰ھ کے چند سال بعد یہ لفظ زبان سے نکالا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خالد بن عبداللہ امام ابوحنیفہؒ سے توبہ کرائے؟ پھر جس روایت میں اس جھوٹ کا ذکر ہے اس کی سند میں عبداللہ بن جعفر بن درستویہ موجود ہے جس پر برقانی اور لالکائی نے سخت جرح کی ہے اور اس کو جو کوئی چند دراہم دیدیتا اس کے موافق روایتیں بیان کر دیتا تھا۔ اس کے بعد سلیمان بن فلیح ہے جس کو ابوزرعہ نے مجہول کہا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کہ فلیح کے دو بیٹے تھے محمد اور یحییٰ ان کے علاوہ اس کا کوئی بیٹا میرے علم میں نہیں ہے۔ دوسرا نام یوسف بن عثمان امیر کوفہ کا لیا جاتا ہے۔ تاریخ خطیب ص ۳۸۱ وص ۳۹۰ میں اسی طرح ہے۔ مگر اس عہد کے والیان کوفہ میں یوسف بن عثمان نام کا کوئی والی نہ تھا۔ ممکن ہے کہ یوسف بن عمر کو یوسف بن عثمان کر دیا گیا ہو۔ اس کی سند میں ابن زاطیا ہے جس کو خود خطیب نے غیر محمود کہا ہے کہ یہ اچھا آدمی نہیں اس کے بعد ابومعمر قطیعی ہے جس کے متعلق ابن معین نے کہا ہے خدا اس پر رحم نہ کرے اس نے رقہ میں پانچ ہزار حدیثیں بیان کیں۔ جن میں سے تین ہزار میں

خطا کی۔ پھر یہ خود ان لوگوں میں ہے جنہوں نے قرآن کو مخلوق کہا تھا جب دربار سے باہر آیا تو کہا ہم نے کفر کیا پھر نکل آئے۔ ایسے شخص کی روایت کو محدثین قبول نہیں کرتے۔ اس کے بعد حجاج اعور ہے جس کی روایتوں میں سخت اختلاط ہے۔ تیسرا نام شریک قاضی کا لیا جاتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ ان کو عہدہ قضا امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے پانچ سال بعد ملا ہے۔ یہ کس طرح امام صاحب کو توبہ کرا سکتے ہیں؟

محمد بن جبویہ ہمدانی نحاس

پھر اس کی ایک سند میں محمد بن جبویہ ہمدانی نحاس ہے جو متہم بالکذب ہے ملاحظہ ہو تلخیص متدرک للذہبی۔ دوسری سند میں ابن درستویہ ہے جس کے پاس نحو کے سوا کچھ نہیں۔ حافظ لالکائی اور برقانی کی جرح کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ اس شخص کو کچھ دراہم دیدیے جاتے تو ایسی روایتیں بیان کر دیتا جو اس نے سنی بھی نہیں تھیں۔ تیسری سند میں صواف نے عبداللہ بن احمد سے اجازۃً روایت کی ہے جو ناقدین کے نزدیک منقطع کے حکم میں ہے اور عبداللہ بن احمد کا تعصب اور انحراف اس کی کتاب السنۃ ہی سے واضح ہے۔ اس کے بعد ابومعمر ہے۔ اگر وہ عبداللہ بن عمرو منقری ہے تو وہ قدری ہے اور قدریہ کی روایت امام ابوحنیفہؒ کے خلاف قابل قبول نہیں کیونکہ وہ ان کے دشمن ہیں۔ اور اگر ہروی ہے تو اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے وہ بھی مجروح ہے۔ غرض تاریخ خطیب میں جتنی روایتیں اس قسم کی ہیں جن میں امام ابوحنیفہ سے توبہ کرانے کا ذکر ہے ان میں ابن رزق، ابن زاطیا، عثمان بن احمد جیسے راوی موجود ہیں جن پر طعن کیا گیا ہے کہ وہ بیہودہ روایتیں کرنے والے ہیں۔ بعض میں ابن سلم، ابارہ، نعیم بن حماد وغیرہ ہیں جو امام ابوحنیفہ کے عیوب میں افسانے گھڑنے سے متہم ہیں۔ علامہ حافظ ابن عبدالبر نے انتقاء میں عبداللہ بن داؤد خریبی کے حوالہ سے اس بات کو غلط اور جھوٹ کہا ہے کہ امام صاحبؒ سے توبہ کرائی گئی۔

حافظ ابن ابی العوام کی روایت

ہاں اس باب میں حافظ ابن ابی العوام کی ایک روایت ہم نقل کر دینا چاہتے

ہیں جس سے اس افسانہ کی پوری حقیقت واضح ہو جائیگی ۔ اس کی سند ضعیف نہیں ۔ وہ حسن بن حماد سجارہ سے روایت کرتے ہیں وہ ابو قطن عمرو بن الہیثم بصری سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے کوفہ کا ارادہ کیا تو شعبہ سے پوچھا کوفہ میں آپ کن لوگوں سے خط و کتابت کیا کرتے ہیں؟ فرمایا ابو حنیفہ اور سفیان ثوری سے ۔ میں نے کہا میرے متعلق ان دونوں کو خط لکھ دیجئے ۔ انہوں نے خط لکھ دیا، تو میں کوفہ پہنچا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے؟ لوگوں نے کہا ابو حنیفہ بڑے ہیں ۔ میں ان کے پاس گیا اور شعبہ کا خط ان کو دیا ۔ انہوں نے دریافت کیا میرے بھائی ابو بسطام کیسے ہیں (یہ شعبہ کی کنیت ہے)؟ میں نے کہا خیریت سے ہیں ۔ جب خط پڑھ چکے تو فرمایا جو کچھ میرے پاس ہے وہ آپ کے لئے حاضر ہے اور دوسروں سے کچھ کام ہو تو مجھ سے کہیے میں آپ کی مدد کروں گا ۔ اس کے بعد میں سفیان ثوری کے پاس گیا اور ان کے نام خط ان کو دیا ۔ انہوں نے بھی وہی کہا جو ابو حنیفہ نے مجھ سے کہا تھا ۔ اس کے بعد میں نے ثوری سے پوچھا کہ ایک بات آپ سے روایت کی جاتی ہے کہ آپ فرماتے ہیں ابو حنیفہ سے دو مرتبہ کفر سے توبہ کرائی گئی ہے کیا آپ کی مراد وہ کفر ہے جو ایمان کی ضد ہے؟ فرمایا جب سے میں نے یہ بات زبان سے نکالی ہے ۔ یہ سوال تم سے پہلے کسی نے مجھ سے نہیں کیا ۔ اس کے بعد سر جھکا لیا اور فرمایا نہیں یہ بات نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ واصل شاری (منکر حدیث خارجی) کوفہ آیا تھا ۔ اس کے پاس ایک جماعت پہنچی اور کہنے لگی یہاں ایک شخص ہے جو اہل معاصی کو کافر نہیں کہتا ۔ اشارہ امام ابو حنیفہ کی طرف تھا ۔ اس نے امام صاحب کو بلا بھیجا اور کہا اے شیخ! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم اہل معاصی کو کافر نہیں کہتے؟ ابو حنیفہ نے کہا ہاں میرا مذہب یہ ہے (کہ گناہ کرنے سے مسلمان کافر نہیں ہوتا جب تک شرک و کفر کا ارتکاب نہ کرے) کہنے لگا یہ تو (ہمارے نزدیک) کافر ہے (خوارج ہر گناہ سے مسلمان کو کافر کہہ دیتے ہیں) اگر تم نے اس سے توبہ کر لی تو ہم قبول کر لیں گے ۔ ورنہ مار ڈالیں گے ۔ ابو حنیفہ نے پوچھا میں کس بات سے توبہ کروں؟ کہا اسی کفر سے ۔ فرمایا ہاں میں کفر سے توبہ کرتا ہوں ۔ یہ کہہ کر ابو حنیفہ (اس کے دربار سے) باہر آ گئے ۔ پھر خلیفہ منصور کا لشکر

آ گیا اور اس نے واصل (خارجی) کو کوفہ سے نکال باہر کیا۔ کچھ مدت کے بعد منصور اس کی طرف سے یکسو اور خالی الذہن ہو گیا تو واصل پھر کوفہ پر قابض ہو گیا۔ وہی جماعت اس کے پاس پھر گئی اور کہا جس شخص نے تیرے سامنے توبہ کی تھی وہ پھر اپنے پہلے مذہب پر لوٹ گیا ہے۔ اس نے پھر ابوحنیفہ کو بلا بھیجا اور کہا اے شیخ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پھر وہی کہنے لگے جو پہلے کہتے تھے۔ فرمایا وہ کیا؟ کہا تم اہل معاصی کو کافر نہیں کہتے۔ فرمایا میرا تو یہی مذہب ہے۔ کہا ہمارے نزدیک یہ کفر ہے اگر اس سے توبہ کرو تو ہم قبول کریں گے ورنہ مار ڈالیں گے۔ ان شاریوں کا طریقہ یہ تھا کہ تین بار توبہ کرانے سے پہلے کسی کو قتل نہیں کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا تو میں کس چیز سے توبہ کروں؟ کہا کفر سے۔ ابوحنیفہ نے کہا تو میں بے شک کفر سے توبہ کرتا ہوں۔ بس یہ تھا وہ کفر جس سے امام ابوحنیفہ سے توبہ کرائی گئی تھی۔ اھ۔

ابن ابی العوام حافظ حدیث شاگرد نسائی ہیں

ابوالقاسم بن ابی العوام حافظ حدیث نسائی کے شاگرد ہیں اور سجارہ اور ابوقطن بھی ثقات میں سے ہیں۔ اس روایت نے فیصلہ کر دیا کہ امام ابوحنیفہؒ سے توبہ کرانے والا نہ خالد قسری تھا نہ یوسف بن عمر ثقفی، نہ شریک بن عبداللہ قاضی۔ بلکہ منکرین حدیث کا بھائی بند واصل شاری منکر حدیث خارجی تھا۔ اور اس توبہ کا تعلق مسئلہ خلق قرآن سے نہ تھا بلکہ صرف اس بات سے تھا کہ امام ابوحنیفہؒ گناہ گار مسلمان کو کافر نہ کہتے تھے۔ خدا ان لوگوں کو سمجھے جو اس امام عالی مقام کی شہرت کو کاذبین مارقین کے افترا اور جھوٹ سے داغ لگانا چاہتے ہیں۔

طلوع اسلام کی تاریخ دانی

طلوع اسلام کی تاریخ دانی ملاحظہ ہو کہ صرف جعد بن درہم اور جہم بن صفوان کے قتل سے اس کے نزدیک قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد بنی اُمیہ میں مسئلہ خلق قرآن کی وجہ سے ان دو شخصوں کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ کیا اسی کو قتل و

غارت کا بازار گرم ہونا کہا جاتا ہے؟ البتہ جس فتنہ کو عہد بنوامیہ میں دبا دیا گیا تھا، خلفاء عباسیہ نے اس کو پھر زندہ کر دیا۔ مامون الرشید عباسی اور اس کا وزیر احمد بن ابی داؤد خلق قرآن کے قائل ہو گئے اور علماء کو بھی اس عقیدہ کے قبول کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ اسی لئے مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بنوامیہ کے عہد خلافت میں اسلام اپنی اصلی سادگی پر قائم تھا۔ تمدن عرب بھی محفوظ تھا، عربی زبان بھی دنیائے اسلام میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھی۔ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں اسلام کے اندر فلسفہ یونان گھس گیا اور اس کی سادہ تعلیم نے فلسفہ کا رنگ اختیار کر لیا، عربیت کی جگہ عجمیت غالب ہو گئی اور زبان عربی کی وہ سرعت اشاعت بھی باقی نہ رہی جو عہد بنوامیہ میں تھی۔

ہم نے اس مقالہ کے شروع میں فتنہ خلق قرآن کا ذکر کر کے بتلا دیا ہے کہ اسی فتنہ سے ائمہ اربعہ کے بعض مقلدین میں افتراق تو پیدا ہو گیا کیونکہ اس فتنہ میں علماء و محدثین کا بعض امتحان لینے والے قاضی اپنے آپ کو حنفی ظاہر کرتے تھے۔ جب متوکل کے زمانہ میں یہ فتنہ فرو ہوا تو محدثین نے غلطی سے حنفیہ سے اپنی کتابوں میں انتقام لینا شروع کیا۔ طلوع اسلام کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ محدثین نے ''احتساب کو اپنے ہاتھ میں لے کر متکلمین اور اصحاب الرائے کا تعاقب شروع کیا اور جوش انتقام میں وہ مظالم روا رکھے گئے کہ چاند اور سورج کی آنکھ بھی شرما جائے۔ چن چن کر متکلمین اور اصحاب الرای کے سر برآوردہ حضرات کو قتل کیا گیا۔''

ہم تو سمجھتے تھے کہ تاریخ کو بدل ڈالنا انگریز ہی کا کمال تھا مگر معلوم ہوا کہ انگریز اپنے کچھ شاگرد بھی یہاں چھوڑ گیا ہے۔ جو دنیا کی آنکھوں میں خاک ڈال کر تاریخ کو مسخ کیا کریں گے۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ بے شک فتنہ خلق قرآن کا ردعمل بعض ظاہرین محدثین کی طرف سے ہوا۔ مگر یہ ردعمل تقریر و تحریر سے آگے ہرگز نہیں بڑھا ہم بتلا چکے ہیں کہ اس فتنہ کے فرو ہونے کے بعد بھی عہدہ قضا بدستور حنفیہ کے ہاتھ میں رہا۔ شافعیہ عراق و خراسان کو حنفیہ کے ہاتھوں سے عہدہ قضا چھیننے کا داعیہ ۳۹۴ھ میں پیدا ہوا۔ پھر بھی وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے ہمیں بتلایا جائے کہ فتنہ خلق قرآن فرو ہو جانے کے بعد محدثین

کے ہاتھ میں محکمہ احتساب کب اور کس خلیفہ کے وقت میں آیا؟ اور انہوں نے متکلمین اور اصحاب الرائے کے کن کن سربرآوردہ حضرات کو قتل کیا؟ جب عہدہ قضا برابر حنفیہ کے ہاتھ میں تھا تو کسی محتسب کی مجال تھی کہ وہ بغیر قاضی کے حکم کے کسی کو بھی قتل کر سکے؟ طلوع اسلام نے یہ سارا افسانہ محض اس لئے گھڑا ہے کہ تا کہ اس پر ایک نئی عمارت قائم کی جا سکے جس کا جلی عنوان یہ ہے ''اصحاب الرائے شافعی بن گئے۔'' اس عقلمند سے کوئی پوچھے کیا امام ابو یوسف القاضی اور امام محمد بن الحسن الشیبانی بھی محدثین کے اس ردعمل سے مرعوب ہو گئے تھے؟ کیا یہ دونوں بھی امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو اعلانیہ پیش کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے؟ کیا یہ بھی شکست خوردگی کی بنا پر اپنی حنفیت کی بقا کے لئے شافعیت کے اصول میں پناہ لیتے تھے؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو تاریخ اسلام کا ادنی طالب علم بھی اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کے زمانہ میں عہدہ قضا حنفیہ ہی کے پاس تھا اور ان کا زمانہ متوکل کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اور اگر جواب نفی میں ہے تو بتلایا جائے کہ امام محمد کی کتاب الحجج اور کتاب الآثار اور کتاب المؤطا اور امام ابو یوسف کی کتاب الآثار اور کتاب الخراج وغیرہ سے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک کیا معلوم ہو رہا ہے؟ کیا ان کتابوں میں مخالفین پر حدیثوں سے حجت قائم نہیں کی گئی؟ کیا ان حضرات نے احادیث سے اپنے مسلک پر احتجاج نہیں کیا؟ حیرت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک راویان مذہب کے طرز عمل سے تو معلوم نہیں کیا جاتا۔ ایک مصری عالم کی تاریخ فقہ اسلامی سے معلوم کیا جا رہا ہے جو خود بھی، مذہب حنفی سے اس قدر واقف نہیں جتنا اکابر علماء ہند واقف ہیں۔

طلوع اسلام کی غلط بیانی

اس کے بعد طلوع اسلام کہتا ہے کہ:

''خلق قرآن کا مسئلہ تو ختم ہو گیا مگر اس کے زیر سایہ حدیث کے اقرار وانکار نے اپنی مستقل حیثیت پیدا کر لی'' (طلوع اسلام)

یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اس کے اصحاب ابتدا سے حدیث رسول کو شرعی حجت مانتے آ رہے تھے۔ فتنہ خلق قرآن سے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ اس فتنہ سے پہلے حنفیہ اور بعض محدثین میں باہم کش مکش نہ تھی، اس فتنہ سے کشمکش پیدا ہوگئی۔ کیونکہ مسئلہ خلق قرآن میں محدثین کا امتحان لینے والے وہی قاضی تھے جو اپنے کو فروع میں حنفی کہتے تھے۔ اب محدثین میں سے اہل تعصب اور غالی فرقہ نے حنفیہ سے اس طرح انتقام لینا شروع کیا کہ جن آئمہ سے صحیح اسانید کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی مدح و ثنا منقول چلی آ رہی تھی۔ ان کی ہی زبان سے امام صاحبؒ کی مذمت نقل کرنی شروع کر دی اور خطیب بغدادی کی وفات کے بعد اس کی تاریخ میں ان خرافات کو ملحق کر دیا گیا جیسا ہم شروع میں بتلا چکے ہیں۔

طلوع اسلام نے ان ہی خرافات کو اس جگہ نقل کر کے مخلوق خدا کو یہ دھوکہ دینا چاہا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ تو پہلے ہی سے صرف قرآن واجتہاد کے پابند تھے حدیث کو حجت نہ مانتے تھے۔ مگر فتنہ خلق قرآن کے وقت تک کسی کو انہیں انکار حدیث کے ساتھ مطعون کرنے کی جرأت نہ تھی جب یہ فتنہ فرو ہوا اور متوکل نے محدثین کا اکرام کیا تو اب ان کو یہ جرأت ہوگئی۔ (طلوع اسلام)

اس مغالطہ سے وہ صرف جاہلوں کو بہکا سکتا ہے تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والوں کو نہیں بہکا سکتا وہ خوب جانتے ہیں کہ اس فتنہ کے دب جانے کے بعد بھی حنفیہ کا اقتدار کم نہیں ہوا تھا وہ برابر عہدہ قضا پر تعینات رہے اور جب کسی نے امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی شان میں بے سروپا باتیں تصنیف کیں تو انہوں نے برابر ان کا دندان شکن جواب دیا پھر اس فتنہ کے فرو ہونے پر سارے محدثین تو حنیفہ کے خلاف نہیں ہو گئے تھے۔ چند اہل طمع اور غالی اہل حدیث نے امام صاحب اور ان کے اصحاب کے خلاف زبان کھولی تھی۔ ان سے وہ اس قدر مرعوب کیسے ہو جاتے کہ اصول حنفیت کو چھوڑ کر شافعیہ کے اصول میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے؟ اسی زمانہ میں ابو داؤد صاحب سنن موجود تھے جو امام احمد بن حنبلؒ کے شاگرد ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تعریف میں رطب اللسان

ہیں۔ ابو داؤد کے شاگردوں میں احمد بن علی جصاص رازی اسی زمانہ میں موجود تھے جو اپنی کتاب احکام القرآن میں مخالفین حنفیہ کے اقوال کا دلائل قرآن و حدیث سے جواب دیتے اور اصول حنفیہ کی قوت ثابت کرتے ہیں۔ امام نسائی کے شاگرد علامہ[1] طحاوی اسی زمانہ میں اپنی کتاب معانی الآثار و مشکل الآثار میں بڑی شد و مد سے مسائل حنفیہ کو احادیث سے مضبوط کرتے اور اختلاف الفقہاء میں مذہب حنفی کی ترجیح ثابت کرتے ہیں اور حافظ ابو القاسم بن ابی العوام شاگرد نسائی امام صاحب کے مناقب میں کتاب تصنیف کرتے ہیں۔ یہ سب اسی زمانہ میں تھے جب کہ محدثین نے فتنۂ خلق قرآن کا ردعمل شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں حافظ حدیث ابو بشر دولابی اور عبدالباقی بن قانع اور مستغفری جیسے حفاظ محدثین حنفیہ میں موجود تھے اسی زمانہ میں امام ابو حفص کبیر، ابو حفص صغیر اور ابو منصور ماتریدی بھی تھے جن کے تفقہ اور تبحر علمی کا دنیا لوہا مانتی تھی، شافعیہ بھی ان کی عظمت و جلالت کے معترف تھے۔ پس کون جاہل اس بات پر کان دھر سکتا ہے کہ اس زمانہ میں حنفیہ محدثین سے ایسے مرعوب ہو گئے تھے کہ حنفیت کو چھوڑ کر اصول شافعی کے ماننے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے بعد طلوع اسلام نے ''امام ابو حنیفہ پر محدثین کا طعن و تشنیع'' کا عنوان قائم کر کے بحوالہ تاریخ الخطیب امام مالک اور عبدالرحمٰن بن مہدی اور اوزاعی اور سفیان ثوری وغیرہم سے امام ابو حنیفہ کی شان میں بیہودہ کلمات نقل کر دیے ہیں مگر ان میں سے کوئی سند بھی مجروحین یا کذابین سے خالی نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی شان میں امام مالکؒ سے جرح ثابت نہیں

امام مالکؒ کا قول عبداللہ بن درستویہ روایت کر رہا ہے جس پر ہم جرح کر چکے ہیں کہ جس نے اسے کچھ دراہم دے دیئے وہ اس کے موافق روایتیں بغیر سماع کے بیان

[1] علامہ طحاوی پہلے شافعی تھے پھر مذہب حنفی کی طرف منتقل ہو گئے کیا اسی کا نام مرعوبیت ہے؟ طلوع اسلام کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ وہ اس زمانہ میں حنفیہ کو شافعیہ کے دامن میں پناہ لینے والا بتلا رہا ہے لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ اس وقت بھی شافعیہ مذہب حنفی کی طرف آ رہے تھے۔ واعتبروا یا اولی الابصار۔

کر دیتا اس کے بعد اسحٰق بن ابراہیم حنینی، ہے جس کو ابن الجوزی نے ضعفاء میں شمار کیا اور ذہبی نے صاحب اوابد کہا (کہ بے تکی باتیں ہانکتا ہے) بخاری نے فیہ نظر کہا اور یہ لفظ بخاری کے نزدیک سخت جرح ہے۔ ابو احمد حاکم نے کہا یہ اندھا ہو گیا تھا اس کی حدیث میں اضطراب ہے۔ پھر علامہ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں اس روایت کو ابن جریر کی کتاب تہذیب الآثار کے حوالہ سے حسن بن صباح بزار ہی کے واسطہ سے حنینی سے جن الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان میں امام ابوحنیفہ کا کچھ ذکر نہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ان مالکا قال قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد تم هذ الامر واستكمل فانما ينبغي ان تتبع آثار رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا تتبع الرأى الخ امام مالکؒ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ یہ دین کامل ہو چکا تھا تو اب تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا اتباع کرنا چاہیے اپنی رائے یا کسی کی رائے کا اتباع نہ کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کا نام اس میں ابن درستویہ دراہمی نے بڑھا دیا ہے۔

امام مالکؒ بڑے درجہ کے اہل الرائے ہیں

اور ظاہر ہے کہ امام مالک جس رائے سے منع کر رہے ہیں اس سے مراد وہ رائے ہے جو قرآن و حدیث سے مستنبط نہ ہو محض عقل کا اتباع ہو۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ امام مالکؒ قیاس اور رائے شرعی میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف میں امام مالک کو اور ان کے اصحاب کو اہل الرائے میں شمار کیا ہے۔ مالکیہ میں جو حضرات اہل فقہ ہیں ان کو اہل الرائے کہا جاتا ہے۔ امام مالکؒ کی موطا جو یحیٰی لیثی کی روایت سے مشہور ہے اس سے امام مالک کا صاحب رائے ہونا بخوبی ظاہر ہے۔ انہوں نے ستر کے قریب ایسی حدیثوں کو جو موطا میں اصح الاسانید کے ساتھ روایت کی گئی ہیں ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ خبر واحد سے مقدم ہے۔ ابن القاسم نے سوالات اسد بن الفرات کے جوابات جو امام مالکؒ کے مذہب پر دیے ہیں جن کو

مدونہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بہانگ دہل بتلا رہے ہیں کہ امام مالک اہل الرائے میں سے ہیں اور اسی مدونہ پر مذہب مالک کی بنیاد قائم ہے۔ اسی طرح ابوالعباس محمد بن اسحاق سراج ثقفی نے امام مالک کے مسائل ستر ہزار کے قریب جمع کئے ہیں (طبقات الحافظ للذہبی ص ۲۶۹ ج ۲) ان سے بھی صاف واضح ہے کہ امام مالک اہل الرائے میں سے ہیں۔ اگر امام مالکؒ کے استاد ربیعۃ[1] الرائے نہ ہوتے تو امام مالک کا شمار فقہاء میں نہ ہوتا۔ مذہب مالکی کے فقہاء اندلسیین بڑے درجہ کے صاحب الرائے تھے۔ مگر یہ وہی رائے ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو چلایا تھا کہ غیر منصوص جزئیات کو منصوص پر قیاس کر کے نظیر کو نظیر کی طرف راجع کیا جائے۔ چنانچہ فقہاء صحابہؓ اس اجتہاد اور رائے سے کام لیتے تھے۔ یعنی جزئیات غیر منصوصہ کو منصوص پر قیاس کرتے تھے، یہی طریقہ فقہاء تابعین کا تھا۔ خود خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''الفقیہ والمتفقہ'' میں اس رائے کو بہت سی سندوں سے ثابت کیا ہے تو کیا خطیب کو وہ روایتیں یاد نہیں رہیں؟ یہ صحیح ہے کہ دین کامل ہو چکا مگر شریعت میں غیر منصوص جزئیات کے لئے جو قیامت تک پیش آتے رہیں گے، کسی ایسی مقتدر ہستی کے لئے کہ جس میں شرائط اجتہاد موجود ہوں قیاس و اجتہاد کی اجازت ہونا بھی دین کے کمال ہی کا ایک حصہ ہے۔ رائے مطلقاً تو مذموم نہیں، رائے مذموم وہ ہے جو ہوائے نفس کے تابع ہو جس کی کوئی اصل کتاب و سنت میں موجود نہ ہو۔ تو ایسی رائے سے حضرات فقہاء امت اور امام ابوحنیفہ کو کیا واسطہ؟ ہم نے قاضی عیاض کی مدارک کے حوالہ سے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق امام مالکؒ کا یہ قول پہلے بیان کیا ہے کہ جب لیث بن سعد مصری نے کہا میں دیکھتا ہوں آپ

---

[1] فاضل عمر فروخ شامی نے اپنی کتاب عبقریۃ العرب میں ربیعۃ الرائے کو امام ابوحنیفہ کا استاد لکھ دیا اور یہ کہ امام ابوحنیفہ نے اُن سے علم فقہ حاصل کیا ہے یہ غلط ہے۔ وہ امام مالک کے استاد ہیں ان ہی سے امام مالک نے علم رائے حاصل کیا ہے امام ابوحنیفہ کے استاد امام شعبی اور حماد بن ابی سلیمان ہیں ان سے ہی امام صاحب نے علم فقہ حاصل کیا ہے ربیعۃ الرائے سے حاصل نہیں کیا بلکہ ابن الندیم نے فہرست میں ربیعۃ الرائے کو امام ابوحنیفہ کا شاگرد بتلایا ہے۔

عراقی بنتے جارہے ہیں۔ فرمایا ہاں میں ابوحنیفہ کی وجہ سے عراقی بن رہا ہوں کیونکہ واقعی وہ فقیہ ہیں۔ نیز طحاوی کے حوالہ سے عبدالعزیز درباوردی کا یہ قول بھی گزر چکا ہے کہ امام مالک کے پاس امام ابوحنیفہ کے ساٹھ ہزار مسائل تھے۔ اس کو مسعود بن شیبہ نے بھی کتاب ''التعلیم'' میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابوالعباس بن ابی العوام نے فضائل ابوحنیفہ میں ذکر کیا ہے کہ امام مالک امام ابوحنیفہ کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے (یہ کتاب کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے) اور جب کبھی امام ابوحنیفہ مدینہ منورہ تشریف لاتے امام مالک کے ساتھ رات بھر مسجد نبوی میں ان کا علمی مذاکرہ رہتا تھا۔ (ذکرہ الخوارزمی)

تو کیا کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ امام مالک کی زبان سے امام ابوحنیفہ کی شان میں وہ بیہودہ الفاظ نکل سکتے ہیں جو تاریخ خطیب سے طلوع اسلام نے نقل کئے ہیں؟ ایک سند کا حال تو اوپر گزر چکا۔ دوسری سند میں علاوہ ابن رزق، ابن سلم اور ابار جیسے مجروحین کے حبیب بن رزیق کاتب مالک موجود ہے جس کے متعلق ابو داؤد کہتے ہیں ''من اکذب الناس۔ سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا تھا''۔ ابن عدی نے کہا اس کی سب حدیثیں موضوع ہیں۔ ابن حبان نے کہا یہ ثقات کے نام سے موضوع روایتیں بیان کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو میزان الاعتدال)

اس کے بعد طلوع اسلام میں امام اوزاعی اور سفیان ثوری سے امام ابوحنیفہ کی مذمت میں بیہودہ اقوال نقل کئے گئے ہیں۔

امام اوزاعی

مگر پہلی سند میں علی بن احمد رزازی ہے جس پر بار بار جرح کی جاچکی ہے کہ اس کا بیٹا اس کی کتابوں میں اضافات کیا کرتا تھا (خطیب) اس کی روایات پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ پھر علی بن محمد بن سعید موصلی ہے جس کو ابونعیم نے کذاب کہا ہے ابن الضرات نے مخلط غیر محمود کہا ہے کہ روایت میں گڑبڑ کرتا ہے۔ اچھا آدمی نہیں، منتہائے سند ابواسحق فزاری ہے جو امام ابوحنیفہ کی عداوت میں مشہور ہے صرف اسلئے کہ اس کا بھائی

امام صاحب کے فتویٰ سے آئمہ جور کے خلاف جہاد میں شریک ہوگیا اور مارا گیا تھا، دوسری سند میں ابن رزق، ابن سلم، ابارہ، وغیرہ مجروحین ہیں جن پر ہم بار بار کلام کر چکے ہیں۔ تیسری سند میں محمد بن جعفر انباری ہے، جس پر خود خطیب نے جرح کی ہے اور جعفر بن محمد بن شاکر نوے سال کی عمر کو پہنچ کر مختل ہوگیا تھا اور سلیمان بن حسان صلبی کے بارے میں ابو حاتم نے ابن ابی غالب کا قول نقل کیا ہے کہ میں اسے نہیں پہچانتا اور نہ اہل بغداد کو اس سے روایت کرتے دیکھا۔ امام اوزاعی کی شان اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی شان میں ایسی بیہودہ بات کہیں، پھر ان راویوں نے اسلام کے ان دستوں میں سے کسی ایک دستہ کا تو نام بیان کیا ہوتا جن کو ابوحنیفہ نے توڑا ہے۔ تاریخ خطیب ہی میں صفحہ ۳۳۸ پر بسند صحیح امام اوزاعی سے امام ابوحنیفہ کی مدح وثنا مذکور ہے امام صاحب سے حج کے موقعہ پر امام اوزاعی کا ملاقات کرنا اور نماز کے اندر رکوع کے وقت رفع یدین کے مسئلہ پر مناظرہ کرنا مشہور ہے جس میں ابوحنیفہؒ نے ان کو لاجواب کر دیا تھا۔ ان کے منہ سے اس قسم کی باتیں ہرگز نہیں نکل سکتی تھیں جو مجروحین کے واسطہ سے نقل کی جاتی ہیں؟

سفیان ثوریؒ

اسی طرح امام سفیان ثوریؒ کی طرف جو بیہودہ کلمات منسوب کئے گئے ہیں اس کی سند میں نعیم بن حماد کے سوا اور کوئی بھی نہ ہوتا تو اس روایت کے رد کرنے کو تنہا وہی کافی ہے ثقات متکلمین نے اس کو مجسمہ میں شمار کیا ہے پھر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے مثالب میں وضاع ہے گھڑ کر روایتیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ابوالفتح ازدی، ابوبشر دولابی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، دوسری سند میں ثعلبہ بن سہیل قاضی ضعیف ہے۔ اور سلیمان بن عبداللہ ابوالولید رقی کے بارہ میں یحییٰ بن معین نے کہا ہے۔ لَيسَ بشئٍ "کچھ نہیں کسی درجہ معتبر نہیں"۔ دنیا جانتی ہے کہ سفیان ثوری مسائل خلافیہ میں سب سے زیادہ ابوحنیفہؒ کی رائے کا اتباع کرتے ہیں، ترمذی پڑھنے پڑھانے والے اس کو خوب جانتے ہیں۔ تاریخ خطیب کے صفحہ ۳۴۱ پر خود امام سفیان ثوری سے امام ابوحنیفہ کی شان

میں غایت درجہ تعظیم و تکریم کے کلمات منقول ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے کتاب الانتقاء کے صفحہ ۱۲۷ میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی نظر میں امام ابوحنیفہؒ کا درجہ کس قدر بلند تھا خدا ان لوگوں کی زبانیں کاٹ دے جو سفیان ثوری پر افترا کرتے اور ان کی طرف ایسی بیہودہ باتیں گھڑ گھڑ کر منسوب کرتے ہیں۔

طلوع اسلام کی بیان کردہ ایک اور غلط روایت

اس کے بعد طلوع اسلام نے عمر بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہیے اسے کوفہ جا کر ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہیے اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہیے۔ عمار بن رزیق کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کی مخالفت کرو تم حق کو پالو گے، ابن عمار کہتے ہیں کہ جب تمہیں کسی بات میں شک ہو تو دیکھ لو ابوحنیفہؒ نے کیا کہا ہے بس اس کی مخالفت کرو کہ حق وہی ہوگا۔ الخ

یہ باتیں کسی عالم کی زبان سے ہرگز نہیں نکل سکتیں کوئی جاہل ہی ایسی بات کہہ سکتا ہے کیونکہ اعتقادیات و اصول میں امام ابوحنیفہؒ کا قول عین حق ہے جس سے اہل حق کو انحراف کی اصلاً گنجائش نہیں جس کو شک ہو وہ عقیدہ الطحاوی کا مطالعہ کرے جس میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے عقائد بیان کئے گئے ہیں کیا اس میں کچھ بھی خلل پایا جاتا ہے؟ سلطان ابن سعود نے باوجودیکہ وہ حنبلی المذہب مشہور تھے عقیدۃ الطحاوی کو اپنے مدارس کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ اور فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کو اس باب میں بہترین پایا ہے مسائل فروع تو دنیا جانتی ہے کہ امام سفیان ثوری اور فقہاء کوفہ اکثر مسائل میں امام صاحب کے موافق ہیں اسی طرح امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل قریباً تین چوتھائی مسائل میں ان کا نزاع نہیں ہے تو جو شخص مسائل عقائد میں یا ان تین چوتھائی مسائل میں امام صاحب کے خلاف کرے گا جن میں تمام فقہا ان کے ساتھ ہیں وہ یقیناً حق صریح کی مخالفت کرے گا اور جو ان تھوڑے مسئلوں میں امام صاحب کی مخالفت کرے جن میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے اور امام صاحب کو خطا کار کہے وہ یقیناً مسائل اجتہادیہ کے حکم سے

اپنی جہالت کا ثبوت دے رہا ہے۔ اہل حق کا اتفاق ہے کہ مجتہد ہر حالت میں ثواب کا مستحق ہے۔ اس کو گنہگار یا خطا کار کہنا گمراہوں کا شیوہ ہے اہل حق کا طریقہ نہیں۔

سند کا حال

اب اس کی سند کا حال بھی ملاحظہ ہو اول تو اس میں وہی اصحاب ثلثہ ابن رزق، ابن سلم ابار دھرے ہوئے ہیں جن پر بار بار جرح کی جاچکی ہے ان کے بعد مؤمل بن اسماعیل ہے جو بخاری کے نزدیک متروک الحدیث ہیں۔ اس کے بعد عمر بن قیس ہے اگر یہ ناصری کوفی ہے تو مؤمل بن اسماعیل مکی نے اس کو نہیں پایا، اور اگر عمر بن قیس مکی ہے تو وہ منکر الحدیث اور ساقط ہے، جب اکثر ناقدین حدیث نے کہا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے امام مالک سے کہا تھا اے مالک تم ہلاکت میں ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں بیٹھ کر بیت اللہ کے حاجیوں سے کہتے ہو کہ صرف حج کا احرام باندھو، تنہا حج کا احرام باندھو (تمتع یا قران نہ کرو) خدا تم کو سب سے الگ کر دے، امام مالک کے شاگردوں نے اس کو دھمکانا چاہا تو امام نے فرمایا اس سے بات نہ کرو یہ تو شراب پیتا ہے۔ (تہذیب التہذیب)

عمار بن رزیق کا قول نقل کرتے ہوئے اہل علم کو شرمانا چاہیے مگر ادارہ طلوع اسلام میں علم کہاں؟ سلیمانی نے اس شخص کے متعلق کہا ہے کہ وہ رافضی تھا، دوسری سند میں ابن درستویہ ہے جس پر ہم جرح کر چکے ہیں وہ یعقوب سے ابن نمیر سے روایت کرتا ہے کہ ہم سے بعض دوستوں نے بیان کیا جو مجہول ہے اور وہ عمار بن رزیق سے روایت کرتا ہے جس کا رافضی ہونا معلوم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد والی سند میں ابن عمار موصلی تاجر ہے جس کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے کہ میں نے ابویعلی موصلی کو بہت برے الفاظ سے اس کو یاد کرتے دیکھا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس نے میرے ماموں کے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ابویعلی موصلی اس کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اس کا قول دوسروں کے اقوال سے زیادہ وزنی ہے کیونکہ وہ اپنے شہر کے آدمیوں کو خوب پہچانتا ہے۔ یہ تو سند کا حال تھا اور متن کے بارہ میں ہم پہلے کہہ چکے

ہیں کہ ایسی باتیں کسی عالم یا دیندار کی زبان سے نہیں نکل سکتیں کوئی جاہل یا بے دین ہی ایسی باتیں کہہ سکتا ہے۔

طلوع اسلام کی اور ناواقفیت

طلوع اسلام نے اس کے بعد ابوعبید کا قول نقل کیا ہے کہ میں اسود بن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا وہاں کسی مسئلہ کا ذکر آ گیا میرے منہ سے نکل گیا کہ اس بارہ میں ابوحنیفہ ایسا ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا (ڈانٹنا کس لفظ کا ترجمہ ہے؟) تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ الخ

طلوع اسلام کو اتنی بھی خبر نہیں کہ امام ابوعبید سے اسود بن سالم کو کیا نسبت؟ ابوعبید علم فقہ وحدیث ولغت میں امام مسلم ہے اور اسود بن سالم کو علم میں کچھ بھی دخل نہیں نہ فقہ سے کچھ مناسبت وہ تو محض زاہد خشک ...... عبادت گزار ہے، اس کو مسائل فقہ سے کیا واسطہ؟ اس کا حال تو خطیب کی اسی روایت ہی سے معلوم ہوسکتا ہے جو صفحہ ۳۶ ج ۷ میں مذکور ہے کہ ایک دن اسود بن سالم کو صبح سے دوپہر تک منہ دھوتے ہوئے دیکھا گیا۔ کسی نے کہا کیا بات ہے؟ کہا آج میں نے ایک بدعتی کا منہ دیکھ لیا تھا، اس وقت سے اب تک منہ دھو رہا ہوں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ پاک نہیں ہوا۔ اور ابوعبید (قاسم بن سلام) کا جو درجہ علم میں ہے اس سے دنیا واقف ہے ابوعبید کا امام ابوحنیفہؒ کے قول کو بطور حجت کے پیش کرنا، امام ابوحنیفہؒ کی جس عظمت شان کو ظاہر کر رہا ہے اہل علم اس کو سمجھ سکتے ہیں، اسود بن سالم کا اس پر انکار کرنا متنبّی کے اس شعر کا مصداق ہے۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص   فھی الشھادۃ لی بانی کامل

ترجمہ:۔ ''اگر میری مذمت کسی ناقص کی طرف سے تیرے پاس پہنچے تو یہی میرے کامل ہونے کی دلیل ہے۔''

طلوع اسلام کی جانب سے نیا افسانہ

اس کے بعد طلوع اسلام نے سفیان سے ہشام بن عروہ سے ان کے باپ

سے یہ حدیث نقل کی (اس کو حدیث کہنا غلط ہے بلکہ عروہ کا قول کہنا چاہیے) کہ بنی اسرائیل کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ ان میں لونڈی بچوں کا غلبہ ہوگیا جنہوں نے دین میں رائے کو دخل دیا۔ خود بھی گمراہ ہوئے، اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔ اس کے بعد سفیان نے کہا کہ اسلام میں بھی لوگوں کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ اسے ابوحنیفہ نے کوفہ میں عثمان بتی نے بصرہ میں اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے مدینہ میں بدل ڈالا۔ ہم نے غور کیا تو ان سب کو ہم نے لونڈی بچے ہی پایا۔ الخ

مگر اس افسانہ کے گھڑنے والے نے خود سفیان بن عیینہ کا نام چھوڑ دیا کیونکہ وہ بھی تو لونڈی بچے ہیں۔ بنو ہلال کے موالی میں سے ہیں۔

تعجب ہے کہ خطیب بغدادی کے نزدیک صحابہ کے اقوال بھی حجت نہیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال تو کس شمار میں؟ وہ ہشام کا یا ان کے باپ عروہ کا قول حجت کے طور پر کیسے نقل کرسکتا ہے؟ پھر اس روایت کا غلط ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ سفیان بن عیینہ خود بھی باندی بچے ہیں۔ عربی النسل نہیں۔ یہ روایت اگر صحیح سند سے عروہ تک پہنچ بھی جاتی تو اس کا درجہ اسرائیلی روایات سے زیادہ نہیں ہوسکتا تھا جن کی کوئی سند نہیں ہوتی۔

جاہلیت کی باتیں

یہ محض جاہلیت کی باتیں ہیں جن کو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد غلط قرار دیتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ط اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجتہ الوداع بھی ان کی مدد کرتا ہے جو حقیقت میں امت کے لئے وصیت ہے اس خطبہ کو حاکم نے کتاب المعرفتہ صفحہ ۱۹۵ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے تکبر کو اور باپ دادا کے فخر کو مٹا دیا ہے سب آدمی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور وہ مٹی سے بنے ہیں بس کوئی مومن متقی ہے کوئی فاجر بدبخت ہے۔ لوگوں کو ان آدمیوں پر فخر کرنے سے باز آنا چاہیے جو جہنم کے کوئلے ہیں یا وہ اللہ تعالیٰ کے

نزدیک گوہ کے کیڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے۔

تو جو شخص ایسی جاہلیت کی باتوں پر توجہ کرتا ہے وہ اپنے ہی کو ذلیل کرتا ہے۔ ابولہب کو اس کے خاندانی نسب نے کچھ نفع نہ دیا اور سلمان فارسیؓ کو ان کے عجمی ہونے سے کچھ ضرر نہیں ہوا۔ پھر امام صاحب کو لونڈی بچہ کہنے والا یقیناً جھوٹ بولتا ہے۔ اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفہ فرماتے ہیں کہ واللہ ہمارے اوپر غلامی کا دھبہ کسی وقت بھی نہیں لگا۔ نیز ابوعبدالرحمٰن مقری کا قول مشکل الآثار طحاوی میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو جو مولی کہا جاتا ہے وہ صرف ولاء موالاۃ کی وجہ سے ہے نہ ولاء اسلام یا ولاء عتق کی بناء پر امام صاحب کے دادا نعمان بن قیس بن مرزبان یوم نہروان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علم بردار تھے اور اسماعیل بن حماد کو محمد بن عبداللہ انصاری نے صحابہ کے بعد تمام قضاۃ بصرہ سے افضل کہا ہے۔

روایت کی کیفیت

اب اس روایت کی سند کا حال بھی ملاحظہ ہو۔ اس میں ایک تو یعقوب بن سفیان ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ اس کے بعد محمد بن عوف مجہول ہے۔ یہ حافظ ابوجعفر طائی حمصی نہیں ہے کیونکہ وہ بہت متاخر ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہے۔ وہ اسماعیل بن عیاش سے روایت نہیں کرسکتا، جیسا اس سند میں ہے۔ یہ محمد بن عوف کوئی اور ہے جس کا حال مجہول ہے۔ دوسری سند میں حمیدی موجود ہے جو امام ابوحنیفہؒ سے سخت تعصب رکھتا ہے اس لئے اس کی کوئی بات امام صاحب کے بارے میں قابل قبول نہیں، یہی حال ابونعیم کا ہے۔

سفیان بن عیینہ

سفیان بن عیینہ کی کمال احتیاط فتویٰ کے باب میں معلوم ہے کہ وہ اس طرح ائمہ مجتہدین کی شان میں زبان درازی ہرگز نہیں کرسکتے نہ وہ جاہلیت کے گڑے مردے اکھاڑ سکتے ہیں۔ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدم مبارک کے نیچے دفن کر

دیا تھا نہ وہ ایسے جاہل ہیں کہ اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ صحابہ کے بعد بلاد اسلام میں حدیث وفقہ کے عالم زیادہ تر موالی ہی تھے۔ امام حسن بصری محمد بن سیرین، مجاہد، عطاء، مکحول، اوزاعی یزید بن ابی حبیب، لیث بن سعد، طاؤس وغیرہ بے شمار علماء محدثین وفقہا موالی تھے حتیٰ کہ زہری کے نزدیک امام مالک بھی موالی میں سے تھے کیونکہ بخاری کی کتاب الصوم کے شروع میں ایک سند کے اندر زہری کا یہ قول موجود ہے، حدثنی ابن ابی انس مولی الیتم مجھ سے ابن ابی انس نے حدیث بیان کی جو بنوتیم کے مولی تھے اور یہ ابن ابی انس امام مالک کے چچا ہیں، اور بعض علماء کے نزدیک امام شافعیؒ بھی موالی میں سے ہیں۔ جرجانی نے کہا ہے کہ امام مالک کے اصحاب کو امام شافعی کا قریشی ہونا مسلم نہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ شافع (جو امام شافعی کے جد اعلیٰ ہیں) ابولہب کے غلام تھے۔ اس نے حضرت عمر سے درخواست کی تھی کہ اسے موالی قریش میں شمار کر لیا جائے۔ انہوں نے انکار کر دیا تو حضرت عثمان سے یہی درخواست کی انہوں نے منظور کرلیا، اسی لئے بعض علماء نے اس شافع کو حضرت عثمان کے موالی میں شمار کیا ہے۔

ایک واقعہ

غرض رنگ یا خون سے عزت بڑھنا علماء کی شان نہیں، حاکم نے معرفت علوم الحدیث میں اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن عبدالملک بن مروان کے پاس گیا تو پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا مکہ سے، کہا وہاں کس کو مکہ والوں کا امام پایا؟ میں نے کہا عطاء بن ابی رباح کو کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے؟ میں نے کہا موالی میں سے ہے، کہا وہ ان کا امام کیسے بن گیا؟ میں نے کہا دیانت اور روایت کی وجہ سے (یعنی خود دیندار ہے اور صحابہ کی حدیثوں اور روایتوں کا راوی ہے) عبدالملک نے کہا بے شک اہل دیانت و روایت اس لائق ہیں کہ لوگوں کے امام بن جائیں، کہا اہل یمن کا امام کون ہے؟ میں نے کہا طاؤس بن کیسان، کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے؟ میں نے کہا موالی میں سے، کہا وہ کیسے امام بن گیا؟ میں نے کہا

جس طرح عطاء امام بن گئے، کہا اہل مصر کا امام کون ہے؟ میں نے کہا یزید بن ابی حبیب، کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے؟ میں نے کہا موالی میں سے، کہا اہل شام کا امام کون ہے؟ میں نے کہا مکحول، کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے؟ میں نے کہا موالی میں سے (مکحول سندی ہیں اس لئے بعض نے ان کو ہندی بھی کہہ دیا ہے) کہا اہل جزیرہ کا امام کون ہے۔ میں نے کہا کہ میمون بن مہران، کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے، میں نے کہا موالی میں سے، کہا اہل خراسان کا امام کون ہے؟ میں نے کہا ضحاک بن مزاحم، کہا وہ عربی ہے یا موالی میں سے۔ میں نے کہا موالی میں سے، کہا اہل بصرہ کا امام کون ہے؟ میں نے کہا حسن بن ابی الحسن (امام حسن بصری) کہا وہ عربی ہیں یا موالی میں سے؟ میں نے کہا موالی میں سے، کہا تیرا ناس ہو اور کوفہ والوں کا امام کون ہے؟ میں نے کہا ابراہیم نخعی کہا وہ عربی ہیں یا موالی میں سے؟ میں نے کہا وہ عربی ہیں۔ عبدالملک نے کہا اے زہری اب تو نے میری پریشانی کو کچھ کم کر دیا، واللہ یہ موالی اہل عرب کے سردار بن جائیں گے، ممبروں پر ان کا خطبہ پڑھا جائے گا اور عرب ان کے ماتحت ہوں گے، میں نے کہا امیر المومنین یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون اور اس کا دین ہے جو اس کو محفوظ رکھے گا سردار بن جائے گا جو اس کو ضائع کرے گا پست ہو جائے گا۔

دوسرا واقعہ

ابو محمد رامہرمزی نے کتاب المحدث الفاصل میں اپنی سند کے ساتھ عبدالملک بن قریب سے بھی اسی کے مثل دوسرا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک بن مروان مسجد حرام میں آیا تو علم و وعظ کے بہت سے حلقے جا بجا دیکھے جس سے وہ خوش ہوا پھر ایک حلقہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کس کا حلقہ ہے؟ کہا گیا عطاء کا، پھر دوسرے حلقہ پر اشارہ کیا کہ یہ کس کا حلقہ ہے؟ کہا گیا سعید بن جبیر کا، پھر تیسرے حلقہ کو دریافت کیا کہ یہ کس کا حلقہ ہے؟ کہا گیا میمون بن مہران کا، پھر چوتھے حلقے کو پوچھا کہ یہ کس کا ہے؟ کہا گیا مکحول کا، پھر پانچویں کو پوچھا یہ کس کا ہے؟ کہا گیا مجاہد کا۔ اور یہ سب

کے سب فارسی النسل تھے۔ عبدالملک اپنے محل کی طرف واپس آیا اور قبائل قریش کو جمع کیا پھر خطبہ دیا۔ اور کہا اے جماعت قریش! تم کو معلوم ہے کہ ہم کس حال میں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور اس دین کی وجہ سے ہم پر احسان فرمایا۔ مگر تم نے اس دین کو حقیر سمجھا اور اس کی تعلیم سے غفلت اختیار کر لی) یہاں تک کہ اہل فارس تم پر غالب آ گئے، (وہ علم دین میں تم سے سبقت لے گئے) اس پر حاضرین پر عالم سکوت طاری ہو گیا کسی سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو (امام زین العابدین) علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے دے دے، عبدالملک نے کہا میں نے اس فارسی قوم جیسا کسی کو نہیں دیکھا۔ زمانہ دراز تک ان لوگوں نے بادشاہت کی اور ہمارے محتاج نہ ہوئے اب ہم ان پر بادشاہت کر رہے ہیں تو ایک ساعت کے لئے بھی ہم ان سے مستغنی نہیں ہیں (کیونکہ علم کا ہر مسلمان محتاج ہے جس میں زیادہ حصہ ان کا ہے۔

تیسرا واقعہ

رامہرمزی نے اپنی سند کے ساتھ حمید طویل سے روایت کیا ہے کہ ایک دیہاتی بصرہ آیا اور خالد بن مہران سے ملا ان سے پوچھا کہ اس شہر کا سردار اور امام کون ہے؟ کہا حسن بصری۔ کہا وہ عربی ہے کہا غلام زادہ؟ کہ غلام زادہ۔ کہا کس کے مولی ہیں؟ کہا قبیلہ انصار کے۔ کہا یہ ان کا سردار کیسے ہو گیا؟ کہا وہ دین میں اس کے محتاج ہیں اور وہ ان کی دنیا سے مستغنی ہے۔ بدوی نے کہا بیشک سردار بننے کے لئے یہ بات کافی ہے۔''

چوتھا واقعہ

ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں لکھا ہے کہ امیر عیسی بن موسی عباسی نے قاضی محمد بن ابی لیلی سے پوچھا بصرہ کا فقیہ کون ہے؟ کہا حسن بصری کہا ان کے بعد کون ہے؟ کہا محمد بن سیرین، کہا یہ دونوں کون ہیں؟ کہا غلام زادے، کہا فقیہ مکہ کون ہے؟ کہا عطاء بن ابی رباح، مجاہد، سعید بن جبیر اور سلیمان بن یسار، کہا یہ کون ہیں؟ کہا یہ بھی غلام زادے

ہیں۔ کہا مدینہ کے فقہا کون ہیں'؟ کہا زید بن اسلم، محمد بن منکدر، نافع، او ابن ابی نجیح۔ کہا یہ کون ہیں کہا یہ بھی موالی ہیں (غلام زادے) اس پر عیسیٰ بن موسیٰ کا رنگ بدل گیا۔ کہا اچھا اہل قبا کا بڑا فقیہ کون ہے؟ کہا ربیعہ الرائی اور ابن ابی الزناد، کہا یہ کن میں سے ہیں؟ کہا یہ بھی موالی ہیں تو عیسی کا چہرہ سیاہ ہونے لگا کہا یمن کا فقیہ کون ہے؟ کہا طاؤس اور ان کا بیٹا اور ابن منبہ، کہا یہ کون ہیں؟ کہا یہ بھی موالی ہیں۔ تو عیسی کی رگیں پھولنے لگیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کہا خراسان کا فقیہ کون ہے؟ کہا عطاء بن عبداللہ خراسانی کہا یہ عطا کون ہے؟ کہا یہ بھی موالی میں سے ہے تو اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سیاہ ہو گیا۔ کہا اچھا فقیہ شام کون ہے؟ کہا مکحول کہا یہ مکحول کون ہے؟ کہا یہ بھی غلام ہے کہا اچھا بتلاؤ کوفہ کا فقیہ کون ہے؟ ابن ابی لیلی کہتے ہیں میرے جی میں آیا کہ حکم بن عتبہ اور حماد بن ابی سلیمان کا نام لوں (کہ یہ دونوں بھی موالی میں سے ہیں) مگر میں نے سوچا کہ اس کا اثر برا ہوگا تو میں نے کہا کوفہ کے فقیہ ابراہیم نخعی اور شعبی ہیں۔ کہا یہ کون ہیں؟ میں نے کہا یہ دونوں عربی النسل ہیں تو اس نے اللہ اکبر کہا اور غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

موالی کا علم

محدث ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ عبادلہ کی وفات کے بعد تمام بلاد اسلام میں علم فقہ موالی کی طرف منتقل ہو گیا۔ بجز مدینہ کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قریشی کو علم فقہ سے سرفراز اور ممتاز کیا۔ اور وہ سعید بن المسیب ہیں۔ نیز مدینہ کے فقہاء سبعہ بھی بجز سلیمان بن یسار کے سب عربی ہیں اور ابن المنکدر کو موالی میں شمار کرنا صحیح نہیں وہ عربی ہیں۔ اس طرح بعض روایات ہیں ابراہیم نخعی کو موالی میں شمار کیا گیا ہے یہ بھی غلط ہے اور بدور سبعہ ائمہ قرأت بھی سب موالی ہیں بجز ابن عامر اور ابن العلاء کے کہ یہ دونوں عربی ہیں شاطبی نے اس کی تصریح کی ہے۔ غرض فقہ و حدیث و تفسیر و لغت و قرأت وغیرہ تمام علوم میں موالی نے جس قدر کام کیا ہے اگر ہم ان سب کے نام اور کارنامے شمار کرنے لگیں تو اس کے لئے

ایک دفتر ضخیم بھی کافی نہ ہوگا۔ جتنے نام بیان کر دیئے گئے ہیں انہی سے اس روایت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

تاریخ خطیب میں اس کی اور بھی روایتیں مذکور ہیں جن کی سندوں میں ابن رزق، ابوعمرو بن السماک اور حمیدی موجود ہیں جن پر بار بار جرح گزر چکی ہے اور بعض سندوں کے راوی مجہول ہیں جن کے تذکرہ سے کلام کو طویل کرنا بے سود ہے حق واضح ہو چکا اور باطل سرنگوں ہو گیا ہے۔ جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

ادارہ طلوع اسلام کے نامہ نگاروں کا یہودی پروپیگنڈے سے متاثر ہونا اور اس پر ایک ضروری تنبیہ

ادارہ طلوع اسلام کے بعض مضمون نگاروں نے ایک شامی یہودی کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسو برس بعد جمع کی گئی ہیں اور حدیث جمع کرنے والے زیادہ تر ایرانی عجمی مسلمان تھے جنہوں نے مادی طاقت میں مسلمانوں سے شکست کھا کر دوسرے طریقہ سے ان کو شکست دینے کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی حجت شرعی قرار دے کر حدیث میں اپنی طرف سے غلط باتیں ثابت کرنا شروع کر دیں اور اس طرح مسلمانوں کو مذہبی میدان میں شکست دے دی۔

اس عقلمند سے کوئی پوچھے کہ امام حسن بصری عطاء بن ابی رباح، محمد بن سیرین، سعید بن جبیر، سلیمان بن یسار، زید ابن اسلم، نافع، ابن ابی نجیح، ربیعۃ الرائی، امام زین العابدین، سالم بن عبداللہ بن عمر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، حکم بن عتیبہ، حماد بن ابی سلیمان، عبداللہ بن مبارک وغیرہ یہ خالص عربی نہیں ہیں ان میں ایرانی خون موجود تھا۔ کسی کے باپ ماں دونوں غلام تھے۔ کسی کی ماں ایرانی تھی تو ان بزرگوں نے بھی مسلمانوں کو گمراہ کیا تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو گویا اس وقت کے تمام مسلمان بیوقوف ہی تھے۔ عوام بھی اور خلفاء و حکام بھی کہ ان ایرانی النسل علماء کی علمی و عملی ترقی کو بجائے سازش

سمجھنے کے قابل رشک سمجھتے اور خاندان قریش کو علمی پستی پر زجر و توبیخ کرتے تھے۔

تاریخ اسلام کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ خلافت ۷۰ھ کے قریب تھا اس وقت متعدد حضرات صحابہ دنیا میں موجود تھے۔ اسی زمانہ میں یہ ایرانی النسل جماعت حدیث وتفسیر وفقہ میں مسلمانوں کی امام تسلیم کرلی گئی تھی۔ اگر اس زمانہ کے عوام وخلفاء وحکام بیوقوف تھے تو آج کل کے منکرین حدیث ان سے بڑھ کر بیوقوف ہوں گے ان کو عقلمند کوئی تسلیم کرے گا؟

پھر ان عقلمندوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ علم قرآن میں بھی یہ ایرانی النسل بزرگ عربوں پر سبقت لے گئے تھے۔ چنانچہ فن قرأت کے بدور سبعہ میں بجز دو کے سب ایرانی النسل ہی تھے۔ اسی طرح علم لغت اور نحو و بلاغت میں بھی زیادہ تر ایرانی النسل علماء نظر آئیں گے۔ اگر حدیث میں ایرانیوں نے سازش کی تھی تو کیا قرآن اور لغت میں بھی ان کی سازش تسلیم کی جائے گی؟ نعوذ باللہ۔

اگر کہا جائے کہ قرآن تو متواتر ہے تو ان کو سمجھنا چاہیے کہ صحابہ کے بعد قرآن کا تواتر بھی زیادہ تر عجمیوں ہی کے طفیل ہے کہ وہ سب سے زیادہ قرآن کی خدمت کرنے والے اور حفظ کرنے والے نظر آئیں گے۔

قرآن کریم کی حفاظت کا مطلب

اگر کہا جائے کہ قرآن کی حفاظت کا خدا نے وعدہ کیا ہے تو سوال یہ ہے کہ حفاظت قرآن کے وعدہ کا مطلب کیا ہے؟ کیا صرف حروف وکلمات قرآن کی حفاظت کا وعدہ ہے یا اس کے معانی ومطالب کی حفاظت بھی اس میں شامل ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف حروف وکلمات کی حفاظت کافی نہیں جب تک معانی ومطالب کی حفاظت نہ کی جائے کہ اصل مقصود کلام کے معانی ہی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ معانی ومطالب کی حفاظت زبان عربی کی حفاظت۔ اس کے لغت اور گرائمر وغیرہ کی حفاظت۔ اس سے طریق استنباط کی حفاظت، نزول قرآن کے وقت جس کا قسم کا ماحول تھا اور جس قسم کے واقعات درپیش تھے ان کی تاریخی حیثیت سے حفاظت، قرآن پر عمل کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس

طرح صحابہ کو دکھلایا اور اس کے موافق نظام زندگی قائم کرنے کا جو طریقہ بتلایا ان سب کی حفاظت، داخل ہے پس یہ کہنا کہ خدا نے صرف قرآن کے نقوش وحروف اور کلمات کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے غلط ہے بلکہ اس میں وہ سب امور داخل ہیں جن پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے جن میں سب سے پہلا درجہ حدیث رسول کا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ قرآن کو سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے تھے۔ آپ کا سب سے بڑا فریضہ کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم وتبیین ہی تھی۔ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ. آپ نے جو کچھ فرمایا وہ قرآن ہی کی شرح ہے۔ اس کی حفاظت سب سے پہلے ضروری ہے۔

احادیث صحیحہ کے رد کرنے سے قرآن مجید کو رد کرنا لازم آتا ہے

پھر جس طرح قرآن کے قاریوں میں بعضے شاذ یا غلط پڑھنے والے بھی ہیں جن کی قرأت کو رد کر دیا جاتا ہے اسی طرح حدیث رسول کے راویوں میں بھی بعض غلط قسم کے راوی گھس گئے ہیں جن کی روایتیں رد کر دی جاتی ہیں۔ اگر احادیث رسول کو خواہ وہ کیسی ہی صحیح ہوں۔ بعض غلط قسم کے راویوں کی وجہ سے حجت نہ مانا جائے تو کیا قرآن کو بھی شاذ یا غلط قرأت کرنے والوں کی وجہ سے حجت نہ کہا جائے گا؟ منکرین حدیث کو عقل سے کام لینا چاہیے، یہودیوں کے پروپیگنڈے کا شکار بن کر اپنے دین کو نہ بدلنا چاہیے۔ تمام فقہاء اور خیارِ امت اور صالحین کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ قرآن کے بعد حدیث صحیح حجت ہے اور حنفیہ کا مذہب تو یہ ہے کہ حدیث ضعیف بھی رائے اور قیاس سے مقدم ہے۔ جو لوگ حدیث کو حجت شرعیہ نہیں مانتے وہ اجماع امت کی مخالفت کرتے اور مذہب ابو حنیفہؒ کے خروج کا ارتکاب کرتے ہیں۔ منکر حدیث اپنے کو حنفی کہنے کا ہرگز حق نہیں رکھتا اور قرآن کی تفسیر میں اس کا کوئی قول بھی ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ جو عامۃ مفسرین کے خلاف ہو۔

منکرین حدیث سے ایک سوال

ان سے کوئی پوچھے کہ اگر سلف پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو قرآن کی تفسیر میں تم پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ سلف سے بے اعتمادی اور اپنے اوپر اعتماد اپنی جہالت کا اقرار ہے۔ اگر سلف پر اعتماد نہ کیا جائے تو قرآن کا صحیح پڑھنا بھی دشوار ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ادارہ طلوع اسلام کا سرکردہ بھی جہاں تک ہمارا خیال ہے قرآن صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ صحیح تفسیر تو کیا کرے گا؟ ہم نے ایک منکر حدیث حافظ قرآن کو دیکھا ہے جس کے مضامین کبھی کبھی طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور طلوع اسلام کو اس کی قابلیت پر ناز ہے۔ ایسا غلط قرآن پڑھتا ہے کہ ہمارے گھروں کے بچے بھی اس سے اچھا اور صحیح پڑھتے ہیں۔

طلوع اسلام کی ایک اور غلطی

اس کے بعد طلوع اسلام نے عنوان، ''فقہ حنفی دجالوں کا کلام ہے'' کے تحت حمدویہ کے حوالہ سے محمدؒ بن مسلمہ مدنی کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا وجہ ہے کہ ابوحنیفہ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی۔ مگر مدینہ میں داخل نہیں ہو سکی۔ محمد بن مسلمہ نے جواب دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے۔ جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا اور یہ بھی چونکہ دجالوں کا کلام ہے اس لئے وہاں داخل نہیں ہو سکا۔''

اس روایت کا غلط ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ دونوں میں دجال کے داخلہ کی نفی کی ہے جیسا بخاری اور مسلم کی بعض روایات میں موجود ہے اور حمدویہ کے سوال سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ مدینہ کے سوا تمام شہروں میں جن میں مکہ بھی داخل ہے امام ابوحنیفہ کی رائے داخل ہو چکی تھی۔ اگر امام ابو حنیفہ کی رائے دجالوں کا کلام ہے تو مکہ میں وہ کیسے داخل ہو گئی؟ پھر خود امام ابوحنیفہ مکہ اور مدینہ میں کیونکر داخل ہو گئے۔ اگر معاذ اللہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال تھے؟ تاریخ

شاہد ہے کہ امام صاحب نے پچپن حج کئے تھے اور مدینہ منورہ میں اس سے بھی زیادہ ان کا داخلہ ثابت ہے۔

اس روایت کے غلط ہونے کا ثبوت

اس روایت کی ایک سند میں انقطاع ہے کیونکہ راوی کہتا ہے حدثنا صاحب لنا عن حمدویه ہمارے ایک ساتھی نے حمدویہ سے روایت بیان کی۔ یہ صاحب کون ہے؟ اور محمد بن مسلمہ مدینی بھی مجہول ہے وہ حارث بن مسکین کا کاتب نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا نام محمد بن سلمہ ہے۔ وہ مصری ہے۔ مدینی نہیں۔ دوسری سند میں محمد بن الحسن نقاش ہے جو مشہور کذاب ہے اور مجسمہ میں اس کا شمار ہونا معلوم ہے۔ ابورجاء مروزی نے تاریخ مرد میں بہت غرائب اور منکرات روایت کی ہیں وہ بھی حجت نہیں۔

ابن ابی العوام حافظ نے اپنی سند کے ساتھ عبدالعزیز دراوردی سے روایت کیا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد مذاکرہ اور مدارست کرتے دیکھا ہے جب کوئی کسی کے قول پر توقف اور تامل کرتا۔ دوسرا بے تکلف رک جاتا۔ نہ چہرہ پر بل پڑتا نہ ایک دوسرے کو سخت سست کہتا نہ اس کی خطا نکالتا یہاں تک کی اسی جگہ پر دونوں صبح کی نماز پڑھتے۔ حافظ صیمری (خطیب کے استاد) نے بھی اسی کے قریب الفاظ سے یہ روایت بیان کی ہے۔ اور ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ امام مالک اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ کی موافقت کرتے ہیں اور دراوردی کا بیان ہے۔ کہ امام مالک کے پاس امام ابوحنیفہ کے مسائل فقہ میں سے ساٹھ ہزار کے قریب مسائل تھے۔ امام شافعیؒ نے کتاب الام (جلد ۷ صفحہ ۲۴۸) میں فرمایا ہے میں نے دراوردی سے پوچھا کیا مدینہ کے علماء میں سے کسی کا یہ قول ہے کہ عورت کا مہر ربع دینار سے کم نہیں ہوسکتا؟ کہا نہیں بخدا امام مالک سے پہلے مجھے کسی کا یہ قول معلوم نہیں۔ پھر دراوردی نے کہا میرا خیال یہ ہے کہ امام مالک نے یہ مسئلہ امام ابوحنیفہ سے لیا ہے۔

پھر دنیا جانتی ہے کہ مدینہ میں امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب ان کے اصحاب کے

اصحاب بکثرت داخل ہوئے اور ان کی فقہ کو وہاں سے رائج کیا ہر زمانہ میں ایسا ہوتا رہا۔ امام محمد نے تین سال مدینہ میں قیام کر کے مؤطا پڑھی اور جن مسائل میں علماء مدینہ کو حنفیہ سے اختلاف تھا ان میں مذہب حنفی کی ترجیح ثابت کرنے کے لئے مدینہ ہی میں کتاب الحجج تصنیف کی جو طبع ہو چکی ہے۔

امام ابو یوسف کا مدینہ پہنچ کر امام مالک سے بعض مسائل میں مذاکرہ کرنا اور ان کو لاجواب کر دینا تاریخ میں موجود ہے۔

حافظ ابن ابی العوام نے اپنی کتاب میں مدینہ منورہ کے جن حنفی علماء کے نام گنائے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ان میں ہر طبقہ کے علماء موجود ہیں۔

پھر ہم اس غلط گو کے کان میں چپکے سے یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں اگر امام ابو حنیفہ کی باتیں تیرے نزدیک دجالوں کا کلام ہیں۔ تو خود اپنے امام کے متعلق تیری کیا رائے ہے جو اکثر مسائل میں ابو حنیفہ کی موافقت کرتے ہیں؟ بلکہ ان کی فقہ کا تانا بانا ہی فقہ حنفی سے تیار ہوا ہے اگر تم کو اس سے انکار ہے تو جن کتابوں میں مسائل خلاف کا ذکر ہے وہ گلا گھونٹنے کو کافی ہیں۔ اور نہایت ندامت کے ساتھ تمہیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ مذہب مالک کی کتاب المدونہ کی بنیاد وہ سوالات ہیں جو امام محمد بن حسن شیبانی نے قائم کئے اور ان کے جوابات مذہب ابو حنیفہ کے موافق دیئے۔ اسد بن الفرات نے ان سوالات کے جواب مذہب امام مالک پر حاصل کرنا چاہے تو سوائے عبدالرحمٰن بن القاسم کے کوئی تیار نہ ہوا ان سوالات و جوابات ہی کا مجموعہ مدونہ امام مالک ہے۔

یہ روایت سند اور درایت پر ہر دو لحاظ سے غلط ہے

غرض یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی لچر ہے اور درایۃً بھی غلط ہے۔ جس کا جی چاہے آج بھی جا کر دیکھ لے کہ مدینہ منورہ میں فقہ حنفی رائج ہے اور بکثرت علماء حنفیہ اور فقہ حنفی کی درس گاہیں بھی موجود ہیں اسی طرح مکہ معظمہ میں جا کر دیکھ لیا جائے۔

پھر اس متعصب کو یہ بھی نظر نہیں آتا کہ مدینہ میں فرقہ قدریہ کی ایک جماعت

امام مالک کے زمانہ میں موجود تھی جس کا رئیس ابراہیم بن محمد بن ابی یحیی اسلمی ہے جس کو اسماء رجال والے اپنی کتابوں میں ہر برائی سے متہم کرتے ہیں۔ اور وہ امام مالک کو ہر قسم کی برائی سے متہم کرتا ہے۔ اور اس نے اپنے علم کو مدینہ میں پھیلایا بھی ہے چنانچہ امام شافعی نے جس طرح امام مالک سے علم حاصل کیا ہے اس سے بھی حاصل کیا ہے۔ مگر اس قدری کو اور اس کی جماعت کو یہ متعصب دجال نہیں کہتا حالانکہ وہ اس کے امام کو بہت برا بھلا کہتا ہے۔ الٹا امام ابوحنیفہ کو دجال کہتا ہے جو امام مالک کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کے شاگرد اور مقلد بھی امام مالک کی سب سے زیادہ عظمت کرتے ہیں۔ اور خود امام مالک بھی امام ابوحنیفہ کا غائت درجہ احترام کرتے ہیں۔ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ سچ ہے بعض دفعہ تعصب سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔

طلوع اسلام کا ایک اور افتراء

اس کے بعد طلوع اسلام نے عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہ حدیث میں بالکل (یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے؟) ''یتیم تھے''۔

اس روایت کے غلط ہونے کے دلائل

اس روایت کے غلط اور موضوع ہونے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ عبداللہ بن مبارک کی کتابیں امام ابوحنیفہ کی حدیثوں اور مسائل فقہیہ سے بھری ہوئی ہیں اور ان کا شمار فقہاء حنفیہ میں کیا جاتا ہے۔ ابوبکر مروزی نے کتاب الورع میں جسے وہ امام احمدؒ سے روایت کرتے ہیں۔ ذکر کیا ہے کہ ابن راھویہ نے عبداللہ بن مبارک کی کتابوں سے تین سو زیادہ حدیثیں انتخاب کی تھیں جو امام ابوحنیفہؒ کے لئے حجت تھیں۔ ابو میلہ شاعر نے عبداللہ بن مبارک کی وفات پر جو ان کا مرثیہ کہا تھا اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

و برأی النعمان کنت بصیرا　　حین یوتی مقائس النعمان

اور تم امام ابوحنیفہ کی فقہ میں بہت بصیرت والے تھے جبکہ امام کے قیاسات کو بیان کیا جائے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مبارک مرتے دم تک فقہ ابوحنیفہ میں مشغول

اور اس میں صاحب بصیرت مشہور ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے اپنی متعدد اسانید کی ساتھ عبداللہ ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ کسی نے ان کے سامنے امام ابوحنیفہ پر کچھ طعن کیا تو فرمایا خاموش رہو واللہ اگر تم ابوحنیفہؒ کو دیکھ لیتے تو ان کو بڑا عقل والا اور بڑی عظمت والا پاتے۔ اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن المبارک امام ابوحنیفہ کو ہر قسم کی بھلائی سے یاد کرتے ان کی بہت مدح وثنا اور صفت بیان کرتے تھے اور ابواسحق فزاری امام ابوحنیفہ سے کراہت کرتے تھے اور جب دونوں کسی جگہ جمع ہو جاتے تو ابواسحق فزاری کی مجال نہ تھی کہ ابن المبارک کے سامنے امام صاحب کی شان میں کچھ بھی زبان سے نکالے۔ حافظ ابن ابی العوام نے اپنی سند کے ساتھ عبدان سے روایت کیا ہے (جو بخاریؒ کے مشائخ میں سے ہیں) کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب میں لوگوں کو امام ابوحنیفہ کا تذکرہ برائی کے ساتھ کرتے دیکھتا ہوں۔ مجھے بہت رنج ہوتا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب نازل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے اقوال ابن مبارک کے امام ابوحنیفہ کی تعریف میں منقول ہیں جو افتراء کرنے والوں کے جھوٹ کا پردہ فاش کرتے ہیں۔

طلوع اسلام کا امام ابوحنیفہ پر افتراء

اس کے بعد طلوع اسلام نے ابوقطن کا قول نقل کیا ہے ”امام حنیفہ حدیث میں گونگے تھے“۔ (زمن کا ترجمہ گونگا غلط ہے۔ عاجز کہنا چاہیے)

اس کی سند میں عبداللہ بن احمد ہے جس پر ہم پہلے جرح کر چکے ہیں اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ عام محدثین کی طرح ایک حدیث کو بہت سندوں کیساتھ روایت نہیں کرتے تھے۔ جیسا ابراہیم بن سعید جوہری کا قول ہے کہ ”جو حدیث میرے پاس سو طریقوں سے نہ ہو میں اس میں یتیم ہوں۔“ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ طرز نہ تھا۔ نہ وہ لاکھوں حدیثیں روایت کرنے والے تھے، بس ان کے پاس حدیثوں کے صحائف سے بھرے ہوئے چند صندوق تھے جن میں سے چار ہزار کے قریب حدیثوں کو انتخاب کرلیا تھا جن کا تعلق احکام سے تھا۔

امام ابوحنیفہ کی مجلس فقہی

اس کے علاوہ بقیہ احادیث میں وہ اپنے ارکان مجلس اور شاگردوں کی روایت پر کفایت کرلیا کرتے تھے جو مختلف علوم کے ماہر اور مجلس فقہی کے اراکین تھے جس کے صدر خود امام صاحب تھے۔ اس مجلس میں مسائل واحکام پر ہر پہلو سے بحث کی جاتی پھر ان کو ایک دفتر میں مدون کرلیا جاتا تھا۔ حافظ ابن ابی العوام بسند حسن امام ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا ہم سے فرماتے کہ تمہارے پاس اس مسئلہ میں کیا آثار ہیں؟ ہم اپنے آثار بیان کرتے اور امام صاحب اپنی روایتیں بیان کرتے (اگر ان میں باہم تعارض نہ ہوا تو خیر ورنہ) پھر یہ دیکھتے کہ زیادہ آثار کس طرف ہیں؟ اگر کسی جانب آثار زیادہ ہوتے اس کو اختیار فرما لیتے اگر قریب قریب یا مساوی ہوئے تو اجتہاد سے کسی جانب کو ترجیح دی جاتی تھی۔ (یہ تھا امام صاحبؒ کا اجتہاد! جن کے بارے میں طلوع اسلام کہتا ہے کہ وہ تو بس قرآن اور اجتہاد کے پابند تھے، حدیثوں کے پابند نہ تھے حالانکہ امام صاحب آثار صحابہ کی موجودگی میں بھی اجتہاد نہیں کرتے تھے)۔

خطیب بغدادی کی شہادت

اور یہ تو خود خطیب نے (جلد۱۴ صفحہ ۲۴۷) ابن کرامہ سے نقل کیا ہے کہ وکیع بن الجراح کی مجلس میں کسی نے کہا ابوحنیفہ نے (اس مسئلہ میں) خطا کی وکیع نے فرمایا ابوحنیفہ کیسے خطا کرسکتے ہیں جب کہ ان کی مجلس میں ابو یوسف اور زفر جیسے صاحب نظر و قیاس اور یحییٰ بن ابی زائدہ اور حفص بن غیاث اور مندل جیسے حفاظ حدیث اور قاسم بن معن جیسا ماہر لغت وعربیت اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و متقی موجود رہتے ہیں۔ جس شخص کے جلیس ایسے ہوں وہ خطا نہیں کرسکتا۔ اگر بالفرض خطا کرے بھی تو وہ اس کو راہ صواب کی طرف واپس لے آئیں گے جسے امام صاحبؒ کی اس مجلس فقہی کے ارکان کی پوری کیفیت دیکھنی ہو وہ نصب الرایہ کا مقدمہ مؤلفہ علامہ محمد زاہد کوثری مصریؒ کا مطالعہ کرے۔ اس میں بہت تفصیل کے ساتھ اس مجلس کی ہیئت وشان واضح کردی گئی ہے۔

امام ابوحنیفہ کثرت سے احادیث روایت کرتے تھے

پھر امام صاحب کے پاس احادیث احکام کا بمقدار کثیر موجود ہونا ان کے مسانید ہی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان میں بغیر تکرار متن اور بغیر تکرار طرق کے امام صاحب نے حدیث کی اتنی کثیر مقدار روایت کی ہے جو امام شافعی اور امام مالک کی روایت کردہ احادیث سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ پھر امام صاحب نے جتنی حدیثیں روایت کی ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑا اور امام مالک اور امام شافعی نے خود اپنی روایت کردہ احادیث کی خاصی مقدار کو ترک کردیا ہے (مگر ترک حدیث سے بدنام امام صاحب کو کیا جاتا ہے)

عبداللہ بن نمیر اور طلوع اسلام کی غلط بیانی

اس کے بعد طلوع اسلام نے عبداللہ بن نمیر کا قول نقل کیا ہے کہ ''میں نے لوگوں کو اس پر متفق پایا ہے کہ وہ رائے تو رائے ابوحنیفہ کی حدیث پر بھی اعتماد نہ کرتے تھے۔''

اس روایت کا غلط ہونا اسی سے واضح ہے کہ عبداللہ بن نمیر خود امام صاحب سے روایت کرتے اور ان کی تعریف کرتے اور ان کی رائے بھی بیان کیا کرتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ایسی سند کے ساتھ جو پہاڑ کی طرح مضبوط ہے عبداللہ بن نمیر نے امام صاحب سے حدیث لعان روایت کی اور ان کی رائے بھی بیان کی ہے۔ امام صاحب سے حدیث روایت کرنے والے علماء کی بہت بڑی جماعت ہے۔ نے شک ہو وہ تہذیب الکمال مصنفہ علامہ مزی کو دیکھ لے معلوم ہو جائے گا کہ امام صاحب سے روایت کرنے والے کیسے کیسے حضرات ہیں جنہوں نے شرق وغرب کو علم حدیث وفقہ سے بھر دیا ہے۔ چنانچہ ابن حجر مکی شافعی نے امام صاحب کے مناقب میں اقرار کیا ہے کہ ''دوسرے آئمہ کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی جو امام ابوحنیفہ کو نصیب ہوئی کہ ان کے شاگرد بہت زیادہ ہیں جن کے ذریعہ ان کا علم تمام آفاق میں پھیل گیا ہے۔

طلوع اسلام اور حجاج بن ارطاۃ

اس کے بعد طلوع اسلام نے حجاج بن ارطاۃ کا قول نقل کیا ہے کہ "ابوحنیفہ کون تھا؟ ابوحنیفہ کی بات کون قبول کرتا تھا (یہ ترجمہ غلط ہے ان سے علم کون لیتا تھا، لکھنا چاہیے) ابوحنیفہ تھا ہی کیا؟"

اگر ادارۂ طلوع اسلام میں کوئی بھی صاحب علم ہوتا تو ایسی لغویات کو ہرگز سپردِ قلم نہ ہونے دیتا۔

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ حجاج بن ارطاۃ ناقدین حدیث کے نزدیک خود مجروح ہے۔ اس کے قول کو جرح وتعدیل کے سلسلہ میں وہی بیان کرسکتا ہے جسے علم سے مس بھی نہ ہو۔ پھر اس بات کا مہمل ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ کو تو دنیا جانتی ہے ان کے علم سے شرق وغرب درخشندہ وتاباں ہے جس کے سامنے علماء کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ آدھی سے زیادہ امت مسلمہ ان کی تقلید کرتی ہے۔ مگر حجاج بن ارطاۃ کو کون جانتا ہے؟ اس مقام پر ملک معظم ایوبی نے السہم المصیب فی کبد الخطیب میں بہت تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ امام ابوحنیفہ کون ہیں؟ جسے معلوم نہ ہو اس سے معلوم کرلے۔

طلوع اسلام اور یحییٰ بن سعید القطان

اس کے بعد طلوع اسلام نے یحییٰ بن سعید قطان کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے امام ابوحنیفہ کی حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا تو کہا وہ حدیث والے تھے ہی کب؟"

اس کی سند میں محمد بن العباس خزاز ہے جس پر جرح گزرچکی۔ خطیب نے بھی خود اس پر جرح کی ہے۔ (ج ۳ صفحہ ۱۲۲) کہ جب اس کے پاس اپنی کتاب نہ ہوتی تو ابو الحسن رزاز کی کتاب سے بغیر سماع کے روایت کردیتا تھا اور رزاز پر بھی جرح گزرچکی ہے کہ اس کی کتابوں میں اس کا بیٹا اضافہ کردیا کرتا تھا۔

پھر اس روایت کا غلط ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ یحییٰ بن سعید قطان کے متعلق یحییٰ بن معین نے اپنی تاریخ میں جو کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں ہے تصریح کی ہے کہ وہ بھی

وکیع بن الجراح کی طرح امام ابوحنیفہ کے فتوے پر عمل کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ یحییٰ بن سعید قطان جیسا محدث ایسے شخص کے فتاویٰ پر کیسے عمل کر سکتا تھا جس کو حدیث نبوی میں مہارت تامہ حاصل نہ ہو۔ علامہ ابن عبدالبر نے بھی کتاب الانتقاء میں یحییٰ بن سعید قطان کا امام صاحب کے فتاویٰ پر عمل کرنا بیان کیا ہے اور خود خطیب نے بھی صفحہ ۳۴۵ و صفحہ ۳۴۶ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے بھی اپنی کتابوں میں اس کو نقل کیا ہے۔

طلوع اسلام کی ایک اور غلط بیانی

اس کے بعد یحییٰ بن معین کا قول طلوع اسلام میں نقل کیا گیا ہے کہ ان سے امام ابوحنیفہ کی حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا تو یحییٰ نے کہا کہ ان کے پاس حدیثیں تھیں ہی کتنی کہ تم ان کے متعلق پوچھتے ہو؟''

اس کی سند میں علی بن محمد بن مہران سواق ہے جو کہ دارقطنی کے ضعیف مشائخ میں سے ہے۔ اس روایت کا غلط ہونا ظاہر ہے کیونکہ یحییٰ بن معین حنفی ہیں امام محمد سے جامع صغیر کو روایت کرتے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے انتقاء میں متعدد اسانید سے یحییٰ بن معین کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ ابوحنیفہ ثقہ ہیں۔ میں نے کسی کو انہیں ضعیف کہتے نہیں سنا۔ یہ شعبہ ان کو لکھتے ہیں کہ میرے حکم سے حدیث بیان کرو۔ اور شعبہ شعبہ ہی ہے (کہ امیر المومنین فی الحدیث ہے)

طلوع اسلام کا ایک اور افتراء

اس کے بعد طلوع اسلام میں ابوبکر بن ابی داؤد کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ابوحنیفہ نے کل ایک سو پچاس حدیثیں روایت کی ہیں اس میں بھی آدھی حدیثوں میں غلطی کی ہے۔''

ابوبکر بن ابی داؤد پر جرح گزر چکی اس کو خود اس کے باپ امام ابوداؤد نے جھوٹا بتلایا ہے اور ابن صاعد و ابن الاصبہانی و ابن جریر نے بھی اس کو کذاب کہا ہے۔ وہ ناصبی مجسم ہے۔ اس قابل نہیں کہ جرح و تعدیل میں اس کے اقوال سے احتجاج کیا جائے

کہ وہ خود ہی مجروح ہے۔ پھر امام ابو حنیفہ کے سترہ مسانید ہی میں ایک ہزار کے قریب حدیثیں موجود ہیں۔ کتاب الآثار ان کے علاوہ ہے امام صاحب کی حدیثوں کا صحیح ہونا ''عقود الجواہر المنیفہ'' سے معلوم ہوسکتا ہے جس میں علامہ زبیدی نے امام صاحب کی ایک ایک حدیث کو بیان کر کے بتلایا ہے کہ امام کے علاوہ اور کس کس نے اس کو روایت کیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ امام صاحب روایت حدیث میں بہت متشدد ہیں۔ جو راوی بغیر حفظ کے اپنے لکھے ہوئے پر ہی اعتماد کرے وہ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کی حدیث غیر صحیح کیسے ہوسکتی ہے؟ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے پاس حدیثوں کا بڑا ذخیرہ تھا جس میں سے انہوں نے چار ہزار حدیثوں کو جن کا احکام سے تعلق تھا منتخب فرمالیا تھا۔ جیسا امام بخاریؒ نے جامع صحیح میں بحذف مکررات چار ہزار حدیثوں کو منتخب کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام صاحبؒ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ اس لئے ابو بکر بن ابی داوٗد کے قول مذکور کو وہی بیان کرسکتا ہے جس کو علم حدیث سے ذرا بھی مس نہیں۔ کوئی عالم اس کی بات پر اصلا التفات نہیں کرسکتا۔ اگر ابن ابی داوٗد میں کچھ بھی علم وتحقیق کی شان ہوتی تو اس طرح کی مہمل بات زبان سے نہ نکالتا بلکہ ان حدیثوں کو بیان کرتا جن میں امام صاحب نے اس کے نزدیک خطا کی تھی اور ان کی خطا بھی ظاہر کرتا اور یہ بھی بتلاتا کہ یہ حدیثیں اس نے کون سی کتاب سے شمار کی تھیں، یا کس کے واسطہ سے اس کو پہنچی تھیں؟

طلوع اسلام میں سفیان ثوری کی طرف ایک قول کی غلط نسبت

اس کے بعد طلوع اسلام میں سفیان ثوری کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے سامنے ابو حنیفہ کا ذکر آیا تو کہا کہ ابو حنیفہ نہ ثقہ تھے نہ مامون تھے''۔ الخ۔ اس کی سند میں علی بن احمد رزاز ہے جس کا بیٹا اس کی کتابوں میں اضافات کیا کرتا تھا اور وہ مغفل ان سب کو روایت کر دیا کرتا تھا وہ علی بن محمد بن سعید موصلی سے روایت کر رہا ہے وہ بھی ثقہ نہیں ہم پہلے اس پر جرح کر چکے ہیں۔ دوسری سند میں ابراہیم بن ابی اللیث نصر الترمذی

ہے۔جس کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ اگر اس کے پاس اسی آدمی منصور بن المعتمر جیسے (ثقات) بھی آمدورفت کرتے جب بھی وہ کذاب ہی رہتا۔ ابن معین کے علاوہ اور بہت لوگوں نے اس کو جھوٹا بتلایا ہے۔ سفیان ثوری بھلا ایسی بیہودہ بات زبان سے کیسے نکال سکتے تھے جب کہ وہ امام صاحب سے بعض احادیث کی روایت بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ مسانید امام میں ان کا امام صاحب سے روایت کرنا ثابت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ خفیہ طور سے امام صاحب کے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ بعض دفعہ امام صاحب سفیان ثوری کے والد سے کوئی روایت بیان کرتے تو ان الفاظ سے روایت کرتے تھے اخبرنا ابو ھذا المختفی خلف الاستوانہ ہم سے اس شخص کے باپ نے جو ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھے ہیں یہ حدیث بیان کی۔“

”طلوع اسلام“ کی عمارت تاریخ خطیب کی لغویات پر قائم ہے

ہم اس فصل کے آخر میں جب محدثین کے تعریفی الفاظ امام صاحب کی ثناء و صفت میں بیان کریں گے اس وقت معلوم ہوگا کہ سفیان ثوری امام صاحب کے کس قدر مداح تھے۔ اس وقت تو ہم تاریخ خطیب کی ان بے ہودہ لغویات کا پول کھولنا چاہتے ہیں۔ جو مجروحین وکذابین کے واسطہ سے امام صاحب کی شان میں روایت کی گئی ہیں۔ طلوع اسلام ان لغویات پر کسی عمارت کا قائم کرنا اگر فریب خوردگی نہیں ہے تو عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کا اور دھوکہ دینے کے سوا اور کیا ہے؟ کیا ادارہ طلوع اسلام میں کوئی بھی ایسا صاحب علم نہیں جسے یہ معلوم ہو کہ تاریخ خطیب کی ان لغویات و ہذیانات کا جواب ایک دو نہیں متعدد کتابوں میں دیا جا چکا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ہم کو بتلایا جائے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے پھر کس لئے ان بے ہودہ باتوں سے مسلمانوں کے قلوب کو مجروح کیا گیا ہے؟ اور اگر جواب نفی میں ہے تو ایسے ادارہ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آرگن کا نام طلوع اسلام رکھیں اور مسائل علمیہ واحکام شرعیہ میں داخل در معقول دے۔

تاریخ خطیب صفحہ ۴۱۹ وصفحہ ۴۵۰ میں احمد بن عطیہ کی یہ روایت بسند صحیح موجود ہے کہ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کیا سفیان (ثوری) نے امام ابوحنیفہ سے روایت کی ہے؟ کہا ہاں ابوحنیفہ ثقہ ہیں اور حدیث میں سچے اور اللہ کے دین میں قابل اطمینان و اعتماد ہیں۔

احمد بن الصلت پر خطیب کی جرح مہمل ہے

خطیب نے احمد بن عطیہ پر جرح کی ہے کہ وہ احمد بن الصلت کے نام سے مشہور ہے ثقہ نہیں ہے مگر احمد بن الصلت کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نے امام ابوحنیفہ کے مناقب میں کتاب لکھی اور عبداللہ بن جزاء صحابی سے امام صاحب کا روایت کرنا اور حضرت انس صحابی سے بھی روایت کرنا بیان کیا ہے۔ حالانکہ اس میں احمد بن الصلت منفرد نہیں ہے بلکہ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم جلد اصفحہ ۴۵ میں دوسرے طریق سے جس میں احمد بن الصلت نہیں ہے۔ امام صاحب کا سماع عبداللہ بن جزءٔ زبیدی سے بیان کیا ہے اور ابن سعد کے حوالہ سے اس کی تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس بن مالک اور عبداللہ بن جزءٔ صحابی کو دیکھا ہے۔

عبداللہ بن جزءٔ صحابی کا سن وفات

رہا ذہبی کا یہ کہنا کہ عبداللہ بن جزاء کا انتقال ۸۶ھ میں بمقام مصر ہوا ہے۔ ان کو امام صاحب نہیں پاسکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرن اول یعنی صحابہ کی ولادت اور وفات کے سنہ میں بہت اختلافات ہیں۔ کیونکہ وفیات کے باب میں کتابیں بہت مدت کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اس لئے کسی ایک شخص کی روایت سے کسی کے سن وفات پر قطعی حکم لگانا دشوار ہے۔ دیکھو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بڑے مشہور صحابی ہیں۔ ان کے سن وفات میں بہت اختلاف ہے۔ کسی نے ۱۸ھ کہا کسی نے ۲۲ھ کہا ہے۔ ذہبی کو اس پر اصرار ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ۳۲ھ تک زندہ رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جمع قرآن میں دوسرے صحابہ کے ساتھ شریک تھے۔ جیسا طبقات ابن سعد

میں تصریح ہے۔ عبداللہ بن جزاء صحابی کا وہ درجہ کہاں جو حضرت ابی بن کعب کا ہے تو ان کی وفات میں اختلاف ہونا چنداں بعید نہیں۔ چنانچہ حسن بن علی غزنوی نے عبداللہ بن جزاء کی وفات ۹۹ھ میں بیان کی ہے۔ ہمارے نزدیک اسی قول کا صحیح ہونا قرین قیاس ہے اور احمد بن الصلت کی روایت قابل اعتماد ہے۔ خصوصاً جبکہ ابن ابی خیثمہ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا تھا کہ بیٹا اس شخص کی روایات کو لکھ لیا کرو۔ کیونکہ وہ ہمارے ساتھ مجلس (حدیث) میں ستر سال سے حدیثیں لکھتا رہا ہے۔ مراد احمد بن الصلت ہے اس کی سند عالی ہے۔ اس سے بہت لوگوں نے حدیث روایت کی ہے۔ جن میں بڑے بڑے آئمہ بھی شامل ہیں مگر اہل تعصب اس کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں جبکہ وہ ابن عیینہ سے یہ بات نقل کرتا ہے کہ علماء چار ہیں۔ عبداللہ بن عباس اپنے زمانہ میں۔ شعبی اپنے زمانہ میں، ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں، اور سفیان ثوری اپنے زمانہ میں۔ کیونکہ تاریخ خطیب میں اضافہ کرنے والے تو سفیان بن عیینہ کو امام صاحب کی مذمت کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں اور جن راویوں کے ذریعہ سے مذمت نقل کی گئی ہے۔ ان کی حقیقت حال کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور بتلا چکے ہیں کہ سفیان بن عیینہ امام صاحب کے شاگردوں اور مداحوں میں سے ہیں۔ ان کی طرف سے امام صاحب کی شان میں مذمت روایت کرنا مجروحین کذابین ہی کا کام ہے۔

آج تک پوری امت اسلامیہ امام ابوحنیفہؒ کو امام اعظم کے لقب سے یاد کرتی آئی ہے

اگر عبداللہ بن عباسؓ و شعبیؒ و ثوریؒ کی صف میں امام ابوحنیفہؒ کو شمار کرنے کی وجہ سے احمد بن الصلت جھوٹا ہو گیا۔ تو کیا یحییٰ بن معین کو بھی جھوٹا کہا جائے گا؟ جن سے خطیب کے استاد صمیری نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ فقہا چار ہیں۔ ابوحنیفہ، سفیان، مالک اور اوزاعی۔ اور پوری امت اسلامیہ نے ہر زمانہ میں امام ابوحنیفہؒ کو ائمہ مذاہب میں سب سے پہلے رکھا اور امام اعظم کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور خود خطیب نے

اسانید جیدہ کے ساتھ بڑے بڑے اماموں کا یہ قول روایت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عالم تھے اور امام ابوحنیفہ کے علم نے شرق وغرب کو بھر دیا ہے۔ جس پر مورخ ابن اثیر کے قول کے موافق آدھی امت عمل کر رہی ہے۔ اور علامہ علی قاری شارح مشکوۃ کے نزدیک دو تہائی امت چل رہی ہے۔ اس کے بعد طلوع اسلام کس ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ مندرجہ بالا آراء کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ یہ کن لوگوں کی رائے ہے۔ اور کس کے متعلق ہے؟ ان میں کا ہر شخص حدیث اور علم رجال کا ستون تسلیم کیا گیا ہے۔"

سبحان اللہ! سند کے اخیر میں سفیان ثوری۔ یحیٰ بن سعید قطان، یحیٰ بن معین کا نام آنے سے ہی یہ سمجھ لیا گیا کہ ان اساتین امت کا یہ فیصلہ امام ابوحنیفہ کے متعلق ہے۔ یہ نہ دیکھا گیا کہ سند کے شروع اور وسط میں کتنے کذاب وضاع اور مجروحین دہرے ہوئے ہیں۔

خوابوں کے سہارے

تاریخ خطیب میں امام ابوحنیفہؒ کی مذمت کو ایک خواب پر ختم کیا گیا ہے اور اس کو اپنے خاتمہ کا اندیشہ کئے بغیر لکھ دیا گیا۔

سند کی ابتداء میں عبداللہ بن جعفر بن درستویہ دراہمی ہے جس پر برقانی اور لالکائی کی جرح بار بار گزر چکی ہے کہ یہ شخص مبہم ہے اس کو جب کوئی چند درہم دے دیتا تو ایسی باتیں کر دیتا تھا جو اس نے کسی سے سنی بھی نہیں تھیں۔ سند کی انتہا بشر بن ابی الازھر نیساپوری پر ہے جو نیشاپور میں فقہا حنفیہ کے امام تھے اور سب علماء سے زیادہ امام ابوحنیفہ کے متبع اور ان کی تعظیم کرنے والے تھے۔ یقیناً یہ خواب وضع کر کے بشر بن ابی الازہر کے سر تھوپ دیا گیا۔ جیسا تاریخ خطیب میں امام صاحب کے دوسرے شاگردوں کی زبان سے بھی ان کی مذمت میں بہت باتیں وضع کر کے بیان کر دی گئی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خطیب کی زبان یا قلم سے یہ خواب کیسے نکل سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی مقبولیت کے متعلق چند خواب

حالانکہ امام محمد بن حسن کے ترجمہ میں اس نے (جلد۲ صفحہ ۱۸۲) پر عمدہ سند سے خود ہی یہ خواب نقل کیا ہے کہ ابن ابی رجاء قاضی فرماتے ہیں کہ میں نے محمویہ سے سنا جن کو ہم ابدال میں شمار کرتے تھے۔ کہ میں نے امام محمد بن حسن کو خواب میں دیکھا تو پوچھا آپ کا انجام کیسا ہوا؟ کہا مجھ سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تم کو علم کا خزانہ اس لئے نہیں بنایا تھا کہ تم کو عذاب دوں۔ میں نے پوچھا کہ امام ابو یوسف کا کیا حال ہے؟ فرمایا وہ مجھ سے بھی اوپر ہیں۔ میں نے پوچھا امام ابوحنیفہ کا کیا حال ہے؟ فرمایا وہ ابو یوسف سے بھی کئی درجے اوپر ہیں۔

اگر خطیب کو خوابوں سے احتجاج کرنا تھا۔ تو اس خواب کو بھی یہاں نقل کر دینا تھا۔

علامہ حافظ ابن عبدالبر نے کتاب الانتقاء میں اس خواب کو دوسری سند سے بیان کیا ہے۔ جس میں احمد بن الصلت نہیں ہے جس کو خطیب نے گرانا چاہا ہے۔ حالانکہ وہ ثقہ ہے۔ وہ عمدہ سند سے محمد بن شجاع سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں ابورجاء نے خبر دی۔ جو عبادت اور بزرگی میں بڑے درجہ پر تھے کہ امام محمد بن الحسن کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ کہا مجھے بخش دیا میں نے کہا اور امام ابو یوسف؟ کہا وہ مجھ سے بھی بلند درجہ پر ہیں۔ میں نے کہا اور امام ابوحنیفہ؟ کہا ارے وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔

اس خواب کو اس سند سے خطیب بھی روایت کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے شیخ عتیقی نے بھی صیدلانی سے اس کو روایت کیا ہے۔

حافظ صمیری نے اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ واصحابہ میں اچھی سند سے محمد بن ابی رجاء سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہ میں نے امام محمد بن الحسن کو خواب میں دیکھا تو پوچھا آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ فرمایا مجھے جنت میں داخل کر دیا اور فرمایا کہ میں نے تم کو علم کا خزانہ اس لئے نہیں بنایا کہ تم کو عذاب دوں۔ میں نے کہا اور

امام ابو یوسف؟ کہا وہ تو مجھ سے ایک درجہ اوپر ہیں۔ میں نے کہا کہ اور امام ابوحنیفہ؟ کہا وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔ اس سند سے بھی خطیب یہ خواب روایت کرسکتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے استاد صمیری کی روایت سے ہے۔ جن کو خطیب ثقہ بتلاتا اور ان کی بہت تعریف کرتا ہے۔ حافظ ابن ابی العوام نے بھی اچھی سند سے اس خواب کو ابوعلی احمد کے حوالہ سے محمد بن ابی رجاء سے ابو رجاء سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پھر حافظ ابن ابی العوام نے دوسری سند کے ساتھ ابونعیم فضل بن وکین سے روایت کیا ہے کہ میں حسن بن صالح کے پاس اس دن کے آخری حصہ میں گیا۔ جس میں وہ اپنے بھائی علی بن صالح کو دفن کر چکے تھے۔ تو انہوں نے ایک اچھا خواب بیان کیا۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد میں حسن بن صالح کے پاس پھر گیا۔ تو مجھے دیکھتے ہی بولے ابونعیم! تمہیں خبر بھی ہے۔ آج رات میں نے اپنے بھائی علی بن صالح کو دیکھا کہ وہ سبز کپڑے پہنے ہوئے میرے پاس آئے میں نے کہا تمہارا تو انتقال ہو چکا ہے؟ کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ سبز کپڑے تمہارے بدن پر کیوں ہیں؟ کہا یہ جنت کے سندس واستبرق ہیں اور میرے پاس تمہارے واسطے بھی ایسے ہی کپڑے ہیں۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے تم سے کیا معاملہ کیا؟ کہا مجھے بخش دیا اور میری وجہ سے اور امام ابوحنیفہ کی وجہ سے فرشتوں پر مباہات کی (یعنی خوشی کا اظہار فرمایا) میں نے کہا ابوحنیفہ نعمان بن ثابت؟ کہا ہاں۔ میں نے کہا ان کا درجہ کہاں ہے؟ کہا ہمارے پاس ہی اعلیٰ علیین میں ہے۔ قاسم بن غسان راوی کہتے ہیں کہ ابونعیم جب کبھی امام ابوحنیفہ کا تذکرہ کرتے یا کوئی دوسرا امام صاحب کا تذکرہ ان کے سامنے کرتا تو فرماتے بخ بخ فی اعلی علیین واہ واہ سبحان اللہ وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔ پھر یہ واقعہ بیان کیا کرتے۔

حضرت مولینا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کا اپنا خواب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فصل کو اپنے ایک خواب پر ختم کروں جو اسی ماہ رجب میں دیکھا ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میرے پاس تشریف لائیں اور فرمایا السلام علیکم و رحمۃ اللہ یا اسی کے قریب کوئی لفظ تھا، میں نے دریافت کیا آپ کون ہیں؟ میں نے پہچانا نہیں۔ فرمایا میں ام المومنین عائشہ ہوں۔ میں تم

کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیکھیں گے تو آپ بھی بہت خوش ہونگے اور میرے خیال میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زیارت اسی وجہ سے نصیب ہوئی کہ میں ان ایام میں اللہ کے ایک مقبول بندے فقیہ الامۃ امام ابوحنیفہؒ کے اوپر سے غلط اتہامات کو دور کر رہا ہوں اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہر اس شخص کیلئے موجب تسلی ہیں۔ جس پر کذابین نے جھوٹے الزامات لگائے ہوں کہ حضرت صدیقہ پر بھی منافقین نے واقعہ افک میں جھوٹی تہمت لگائی تھی۔ جس سے ان کا بری اور پاک ہونا سورۃ النور کی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فقہاء صحابہ میں سے ہیں ان کو فقیہ الامت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے خاص مناسبت ہے اس لئے ان کے اوپر سے غلط اتہامات کو دفع کرنا ان کی مسرت کا باعث ہوا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ امید ہے کہ امام صاحب کا یہ تبریہ بارگاہ رسالت پھر بارگاہ صمدیت میں بھی قبول ہو گیا ہے۔ احقر نے امام صاحب کے مناقب میں ایک مستقل کتاب بزبان عربی بھی تالیف کی تھی۔ جس کا نام حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ''ابخا الوطن عن الازدراء بامام الزمن'' تجویز فرمایا تھا اس کا مسودہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے مسودات میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اور اعلاء السنن کے بقیہ حصوں کی طباعت کی کوئی صورت پیدا فرمائیں۔ آمین۔

طلوع اسلام کی ایک اور غلط بیانی

اس کے بعد طلوع اسلام نے ''امام ابو یوسف کے متعلق ائمہ رجال کی رائے کا عنوان قائم کر کے عبداللہ بن مبارک سے ان کی مذمت نقل کی ہے۔

مگر اس کی کوئی سند بھی ایسے مجروحین سے خالی نہیں۔ جن کی روایت سے احتجاج ائمہ رجال کے نزدیک جائز نہیں۔ جیسے سلم بن سالم۔ علی بن مہران۔ عبیدۃ الخراسانی اور عبدالرزاق بن عمر اور ان ہی جیسے دوسرے مجروحین ہیں۔

صریح کذب بیانی

کمال یہ ہے کہ تاریخ خطیب جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۶ وصفحہ ۲۵۷ میں ابن المبارک کی طرف یہ بات بھی منسوب کی گئی ہے کہ جب امام ابو یوسف کا انتقال ہوا۔ اور اس کی خبر

ابن المبارک کو پہنچی تو کہا یعقوب الشقی ...... حالانکہ بالاتفاق عبداللہ بن مبارک کا انتقال امام ابو یوسف سے ایک سال پہلے ہو چکا تھا تو کیا وہ امام ابو یوسف کے انتقال کے وقت دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں یہ بات کہنے آئے تھے۔ حق تعالیٰ جھوٹوں کو اسی طرح رسوا کیا کرتا ہے۔ وکفی اللہ المومنین القتال۔

ایک اور دروغ

اس کے بعد امام بخاری سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے نعمان (امام ابو حنیفہ) کا قول نقل کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو یعقوب (امام ابو یوسف) پر تعجب کیوں نہیں آتا۔ اس نے مجھ پر اس قدر جھوٹ باندھ دیئے ہیں۔ جو میں نے کبھی نہیں کہے''۔ اس روایت کا غلط ہونا اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری نے امام ابوحنیفہ کو نہیں پایا۔ درمیان میں واسطہ ہے۔ جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ اگر وہ واسطہ حمیدی یا نعیم بن حماد ہے تو ہم بتلا چکے ہیں کہ ان دونوں کی کوئی روایت بھی امام ابوحنیفہ کے بارہ میں قابل قبول نہیں ہے۔ اگر کوئی اور واسطہ ہے تو جب تک نام معلوم نہ ہو مجہول کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

امام احمد بن حنبل امام ابو یوسف کی تعریف کرتے ہیں

اس کے بعد امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے ان کی مذمت نقل کی گئی ہے۔ حالانکہ احمد بن کامل شجری صاحب ابن جریر نے کہا ہے کہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل اور علی بن المدینی تینوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام ابو یوسف نقل روایات میں ثقہ ہیں۔ ان کے زمانہ میں ان سے مقدم کوئی نہ تھا۔ علامہ ابن الجوزی نے اپنی کتاب اخبار الحفاظ میں امام ابو یوسف کو ان سو افراد میں شمار کیا ہے جن کی قوت حافظہ ضرب المثل تھی۔ یہ کتاب کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے۔

تاریخ خطیب کی دارقطنی کی طرف غلط نسبت

اس کے بعد دارقطنی سے نقل کیا گیا ہے کہ ان سے امام ابو یوسف کے متعلق پوچھا

گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ محمد بن الحسن کی نسبت زیادہ قوی ہیں مگر اندھوں میں کانے ہیں۔"

یہ روایت بھی غلط ہے۔ کیونکہ دارقطنی نے اپنی کتاب "غرائب[1] مالک" میں امام محمد کو ثقات حفاظ متقین میں شمار کیا ہے اور جب امام ابو یوسف ان سے بھی زیادہ قوی ہیں تو وہ تو ثقہ حافظ متقین سے بھی اوپر ہوئے پس تاریخ خطیب میں دارقطنی کی طرف جو قول منسوب کیا گیا ہے۔ وہ محض بکواس ہے۔

طلوع اسلام کا دروغ بے فروغ

اس کے بعد طلوع اسلام نے "امام محمد بن الحسن کے متعلق ائمہ رجال کی رائے" کا عنوان قائم کر کے یحییٰ بن معین وغیرہ سے ان کا کذاب ہونا نقل کیا ہے اس دروغ بے فروغ کو لکھتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ ان اقوال کی سندوں میں وہی ہالکین مجروحین دھرے ہوئے ہیں۔ جن پر ہم بار بار جرح نقل کر چکے ہیں۔ اس لئے یہ سب اقوال دیوار پر مار دینے کے قابل ہیں ہم اوپر دارقطنی کا قول نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے "غرائب مالک" میں امام محمد کو ثقات حفاظ متقین میں شمار کیا ہے۔

اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے متعلق محدثین کے اقوال توثیق و تعدیل بھی نقل کر دیں جو ان حضرات کی مدح و ثناء میں صحیح اور حسن اور عمدہ اسانید سے روایت کئے گئے ہیں۔ تاریخ خطیب بغدادی کا مطالعہ کرنے والے اگر اسماء رجال کا کچھ بھی علم رکھتے ہیں تو وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان حضرات کی مدح و ثناء میں جو اقوال روایت کئے گئے ہیں ان کی سندیں کیسی ہیں اور مذمت میں جو اقوال منقول ہیں ان کی سندیں کس قدر ساقط اور مہمل ہیں۔

---

[1] دارقطنی نے اس کتاب میں حدیث رفع یدین عندالرکوع روایت کر کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ امام مالک نے حدیث رفع یدین عندالرکوع کو موطا میں روایت نہیں کیا تو دارقطنی نے کہا کہ اس حدیث کو امام مالک سے بیس ثقات حفاظت متقین نے روایت کیا ہے جن میں سے محمد بن الحسن الشیبانی اور یحییٰ بن سعید قطان ہیں۔ (نصب الرایہ) ان میں سب سے پہلا نام امام محمد کا ہے تو وہ نمبر اول کے ثقہ حافظ متقن ہوئے۔

الامام محمد بن الحسن الشیبانیؒ

مجتہد مطلق اور بہت بڑے امام ہیں۔ بڑے بڑے علماء نے ان سے استفادہ کیا ہے امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ یہ مسائل دقیقہ آپ نے کہاں سے لئے ہیں؟ فرمایا محمد بن الحسن کی کتابوں سے خطیب بغدادی کے امام شافعیؒ نے ان سے ہی فقہ حاصل کیا ہے۔ اسی طرح امام ابوعبید قاسم بن سلام اور امام اسد بن الضرات جو مذہب امام مالک کو مدون کرنے والے ہیں۔ اور فقہ میں ان ہی کے شاگرد ہیں۔ دارقطنی نے ''غرائب مالک'' میں ان کو ثقہ حفاظ متقنین میں شمار کیا ہے۔ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے جامع صغیر امام محمد سے سنی ہے۔ ابن المدینی کہتے ہیں کہ محمد بہت سچے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے اوپر علم فقہ میں سب سے زیادہ احسان امام محمد کا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اجتہاد کو امام محمد کی وفات کے چھ سال بعد فروغ حاصل ہوا ہے۔ تو ان کی شان میں ۔بے ہودہ اقوال نقل کرنا خطیب بغدادی کے امام شافعی کی شان کو پست کرنا اور ان کے علم پر دھبہ لگانا ہے۔

تانیب

امام ابو حنیفہ کی صحبت میں بالالتزام رہے۔ ان سے فقہ و حدیث حاصل کیا۔ سفیان ثوری قیس بن الربیع عمر بن زر۔ مسعر بن کدام وغیرہ سے حدیث سنی شام میں امام اوزاعی وغیرہ سے اور مدینہ میں امام مالک وغیرہ سے حدیث سنی۔ ان سے امام شافعی نے حدیث روایت کی۔ چنانچہ مسند شافعی میں ان کی روایتیں امام محمد سے موجود ہیں۔ ابوعبید قاسم بن سلام اور ہشام بن عبیداللہ رازی، ابوسلیمان جوزجانی۔ علی بن مسلم طوسی، ابوجعفر احمد بن محمد بن مہران نے اور بہت لوگوں نے ان سے روایت کی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام محمد نے فرمایا کہ میں نے امام مالک کے پاس تین سال قیام کیا۔ اور سات سو سے زیادہ حدیثیں ان کی زبان سے سنی ہیں۔ حالانکہ امام مالک خود حدیث بہت کم پڑھتے تھے۔ بلکہ عموماً شاگرد پڑھتے اور وہ سنتے تھے۔ اگر امام محمد کا قیام ان کے پاس

طویل عرصہ تک نہ ہوتا اور ان کی عزت امام مالک کے دل میں نہ ہوتی، تو یہ بات ان کو حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ امام محمد بھی موطا مالک کے راویوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ (تعجیل المنفعۃ) اور اوپر گزر چکا کہ دارقطنی نے امام محمد کو اپنی کتاب غرائب مالک میں ثقات حفاظ میں شمار کیا ہے۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر کتابیں پڑھی ہیں۔ امام شافعی اور احمد بن حنبل ان کی بہت عظمت کرتے تھے۔ (تعجیل المنفعۃ) ذہبی نے میزان میں کہا ہے کہ امام محمد مالک بن انسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ علم کا سمندر ہیں، اور مالک کی حدیثوں میں قوی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب وہ مالک سے روایت کرتے ہیں قوی ہیں تو جن مشائخ کوفہ کی صحبت میں امام مالک سے بھی زیادہ رہے ہیں ان کی حدیثوں میں قوی کیوں نہ ہوں گے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ امام محمد کی پیدائش جزیرہ میں ہوئی تھی اور نشو ونما کوفہ میں ہوا۔ انہوں نے حدیث کی روایت میں کوشش کی اور بہت حدیثیں سنیں۔ کوفہ سے بغداد آئے تو لوگ ان کے پاس کثرت سے آمدورفت کرتے تھے اور حدیث وفقہ سنتے تھے۔ خطیب کی روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ جب وہ امام مالک سے روایت کرتے تو گھر بھر جاتا اور لوگ اس کثرت سے حدیث سننے آتے کہ جگہ تنگ ہو جاتی۔ اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ علماء کے قلوب میں امام محمد کی کس قدر عظمت تھی۔

الامام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری

مجتہد مطلق ہیں بڑے بڑے مجتہدین کے استاذ ہیں۔ ابن حبان کو اگرچہ حنفیہ سے بہت زیادہ انحراف ہے مگر امام ابو یوسف کے متعلق فرماتے ہیں کہ حافظ متقن ہیں۔ بہت نیک تھے۔ پے در پے روزے رکھتے تھے اور علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ قاضی القضاۃ بننے کے بعد بھی دوسو رکعتیں ہر رات پڑھتے تھے۔ حافظ طلحہ بن جعفر معدل فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف کی شان مشہور ہے۔ ان کی فضیلت ظاہر ہے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ فقیہ تھے ان کے زمانہ میں کوئی ان سے مقدم نہ تھا۔ علم اور

قضا اور ریاست وقدر ومنزلت میں انتہائی درجہ پر تھے۔ سب سے پہلے ان ہی نے مذہب ابوحنیفہ کے اصول فقہ میں کتابیں تصنیف کیں۔ مسائل کا املا کیا فقہ حنفی کو تمام اطراف عالم میں پھیلایا ہے۔ ہلال بن یحییٰ بصری فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف تفسیر ومغازی اور تاریخ عرب کے حافظ تھے۔ ان کے علوم میں فقہ سب سے کم درجہ پر تھا۔ یعنی ان کا فقہ جس درجہ کا ہے اس کو تو عالم اور جاہل سب جانتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے یحییٰ بن خالد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو یوسف ہمارے یہاں آئے اور فقہ ان کے علوم میں سب سے کم درجہ کا علم تھا۔ انہوں نے اپنی فقہ سے شرق وغرب کو مالا مال کر دیا ہے۔ اور یحییٰ بن معین سے دوری نے روایت کیا ہے کہ ابو یوسف صاحب حدیث اور صاحب سنت تھے۔ (یعنی متبع سنت تھے۔ بعض محدثین کی طرح تشبیہ یا تجسیم کے قائل نہ تھے)۔

امام ابو یوسف کا حافظہ

ابن جریر نے اپنی کتاب الذیل المذیل میں لکھا ہے کہ ابو یوسف بعض محدثین کی مجلس میں حاضر ہوتے اور اس سے پچاس ساٹھ حدیثیں سنتے پھر مجلس سے باہر آکر سب حدیثوں کو بجنسہ بیان کر دیتے تھے اور اس سے ان کی قوت حافظہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اسی لئے ابن الجوزی نے ان سو افراد میں ان کو شمار کیا ہے جن کی قوت حافظہ ضرب المثل تھی۔ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے (تانیب)

اسلام میں سب سے پہلے قاضی القضاۃ

سب سے پہلے قاضی القضاۃ کا لقب ان ہی کو دیا گیا۔ علامہ ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو یوسف کو حفاظ حدیث میں شمار کیا۔ اور الامام العلامۃ فقیہ العراقین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے ہشام بن عروہ اور ابو اسحٰق شیبانی اور عطا بن اُسائب اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے حدیث سنی۔ اور ان سے امام محمد بن الحسن الفقیہ اور امام احمد بن حنبل اور بشر بن الولید اور یحییٰ بن معین اور علی بن الجعد (شیخ البخاری) اور بہت مخلوق نے روایت کی ہے۔ امام مزنی نے کہا ہے کہ ابو یوسف سب سے

زیادہ متبع حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ابو یوسف حدیث میں عدل و انصاف سے کام لیتے تھے۔ ابن معین فرماتے ہیں کہ اصحاب الرائے میں ابو یوسف سے زیادہ حدیث کا عالم اور زیادہ مضبوط دوسرا نہیں محمود بن غیلان کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے پوچھا کہ ابو یوسف کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ کہا میں ان سے خود روایت کرتا ہوں۔

ابن عدی کا قول

ابن عدی نے کہا کہ اہل الرائے میں ابو یوسف سے زیادہ حدیث کا عالم نہیں۔ بسا اوقات وہ اپنے اصحاب کی مخالفت کرتے اور آثار کا اتباع کرتے ابن عدی فقہ اور قیاس اور علوم عربیہ سے کوسوں دور رہے اور ابتدا میں وہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے متعلق بہت زبان درازی کرتے تھے۔ پھر امام ابوجعفر طحاوی سے ملے اور ان سے استفادہ کیا تو کسی قدر ان کی حالت اچھی ہوگئی، یہاں تک کہ مسند ابی حنیفہ کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ (تانیب صفحہ ۱۶۹) اس لئے امام ابو یوسف کی شان میں جو تھوڑے سے تعریفی جملے ان کے قلم سے نکل گئے ہیں یہ بھی غنیمت ہیں۔

ابن حبان نے امام ابو یوسف کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا کان شیخا متقنا اور یہ لفظ توثیق کے اعلیٰ الفاظ میں سے ہے۔ سمعانی نے کتاب الانساب میں کہا ہے کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل اور علی بن المدینی تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ابو یوسف روایت میں ثقہ ہیں۔ ان کے زمانہ میں کوئی بھی ان سے مقدم نہ تھا۔ علم اور قضا اور ریاست وقدر و منزلت میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔

آئمہ ثلثہ کی تعریف میں امام احمد بن حنبل کا قول

بیہقی نے بھی امام ابو یوسف کو ثقہ کہا ہے اور امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے کہ جس مسئلہ میں تین شخص متفق ہوں۔ پھر ان کے مخالف کی بات نہ سنی جائے گی، پوچھا گیا وہ تین کون ہیں؟ فرمایا ابوحنیفہ و ابو یوسف اور محمد بن الحسن۔ ابوحنیفہ قیاس میں

سب سے زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ اور ابو یوسف آثار اور احادیث کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ اور محمد عربیت میں سب سے زیادہ ماہر ہیں۔

خطیب نے یحیٰ بن معین سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ابو یوسف سے بہت حدیثیں لکھیں ہیں۔ عباس (دوری) نے امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے طلب حدیث شروع کی تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسف کے پاس گیا۔ ان کے بعد دوسروں سے حدیثیں لکھی ہیں۔ عاصم بن یوسف کہتے ہیں۔ میں نے امام ابو یوسف سے کہا لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس وقت علم میں آپ سے بہتر کوئی نہیں۔ فرمایا کہ میرا علم امام ابو حنیفہ کے علم کے سامنے ایسا ہے۔ جیسے دریائے فرات کے سامنے چھوٹی سی نہر۔

لطیفہ

حافظ ابن ابی العوام نے امام طحاوی سے عبدة بن سلیمان بن بکر سے ابراہیم ابن الجراح سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے (طلب علم کے لئے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو امام ابو یوسف سے پوچھا کہ وہاں کس کی صحبت اختیار کروں؟ فرمایا حماد بن زید کے پاس جاؤ اور ان کی بہت تعریف کی (بڑی عظمت سے ان کا تذکرہ کیا) چنانچہ بصرہ پہنچ کر میں نے حماد بن زید کی صحبت میں رہنے کا التزام کرلیا مگر بخدا جب کبھی ان کی مجلس میں امام ابو یوسف کا ذکر آتا وہ ان کی شان میں بُرے الفاظ ہی استعمال کرتے تھے۔ ایک دن ان کے پاس ایک عورت آئی جو کوئی دستاویز لکھوانا چاہتی تھی۔ حماد بن زید کو اس کی درخواست کا رد کرنا بھی گراں تھا۔ اور درس حدیث کو موقوف کرنا بھی گراں تھا۔ میں نے ان کی پریشانی کا احساس کر کے عرض کیا کہ آپ اس عورت کو فرما دیجئے کہ یہ کاغذ میرے حوالہ کر دے۔ میں دستاویز لکھ دوں گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور درس حدیث کو میری فراغت تک موقوف کرنے کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں آپ درس حدیث جاری رکھئے۔ جب میں دستاویز لکھ چکا تو کاغذ ان کے

حوالہ کیا۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھا۔ تو تعجب سے کہنے لگے۔ تم لوگ یہ علم کس سے حاصل کرتے ہو؟ میں نے کہا اسی شخص سے جس کا ذکر آپ کی مجلس میں کبھی آتا ہے تو آپ اس کی مذمت بھی ساتھ ساتھ کر دیتے ہیں۔ اور ان کا برتاؤ آپ کے ساتھ غائبانہ یہ ہے کہ جب میں نے بصرہ آنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ آپ کے سوا کسی کے پاس نہ جاؤں فرمایا وہ کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا امام ابو یوسف اس پر حماد بن زید شرمندہ ہو گئے اور اس کے بعد ہمیشہ ان کا ذکر خیر بھلائی سے کرنے لگے (پھر کبھی برائی نہیں کی) یہ تو حماد بن زید کا حال ہے۔ اسی سے اندازہ کرلیا جائے کہ بعض راویان حدیث بعض دفعہ کسی فقیہ کا قول ظاہر حدیث کے خلاف سنتے ہیں تو اس کو مخالفت حدیث پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ حدیث کے مطلب و مقصد کو فقہاء ان جیسے حضرات سے زیادہ جانتے ہیں۔ البتہ جو محدثین فقہا بھی ہوتے ہیں وہ ہرگز امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کو مخالف حدیث نہیں سمجھتے۔

امام الائمۃ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ

مجتہد کبیر، سراج الامۃ کاشف الغمہ امام الائمۃ ہیں۔ آپ کے علم نے دیار اسلام کے شرق و غرب کو منور کر دیا ہے۔ ائمہ متبوعین میں آپ ہی کو شرف تابعیت حاصل ہوا ہے۔

امام صاحب کا تابعی ہونا

امام صاحب کا بعض صحابہ کو دیکھنا اور ان سے ملاقات کرنا ثابت ہے البتہ روایت کرنے میں اختلاف ہے۔ مگر ملا علی قاری وغیرہ کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ امام صاحب نے بعض صحابہؓ سے روایت بھی کی ہے۔ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ حضرت انس بن مالک صحابی رضی اللہ عنہ کو امام صاحب کا دیکھنا اور تابعین میں داخل ہونا محدثین کی بڑی جماعت کے نزدیک ثابت ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے ایک سوال کے جواب میں اور حافظ عراقی۔

دارقطنی اور امام ابومعشر عبدالکریم بن عبدالصمد طبری شافعی نے اس کی تصریح کی ہے اور وہ صحابہ سے امام صاحب کی روایت بھی ثابت کرتے ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ صحابہ سے امام صاحب کا روایت کرنا باطل نہیں ہے۔ حافظ ابوالحجاج مزی اور حافظ خطیب بغدادی حافظ ابن الجوزی حافظ ابن عبدالبر اور سمعانی صاحب کتاب الانساب اور امام نووی، حافظ عبدالغنی مقدسی، امام جزری اور نورپشتی اور صاحب کشف الکشاف اور صاحب مراۃ الجنان امام یافعی اور علامہ ابن حجر مکی شافعی اور علامہ احمد قسطلانی اور علامہ ازنیقی صاحب مدینۃ العلوم اور علامہ بدرالدین عینی نے بھی امام صاحب کا حضرت انسؓ کو دیکھنا ثابت کیا۔ اور ان کو تابعین میں شمار کیا ہے۔

امام صاحب کا علومرتبہ

پس امام صاحب حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں والذین اتبعو هم باحسان رضی الله عنهم و رضوا عنه سمعانی نے کتاب الانساب میں کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ طلب علم میں مشغول ہوئے اور اس میں درجہ کمال کو پہنچے تو ان کو وہ مرتبہ حاصل ہوا جو دوسروں کو حاصل نہ ہوا۔

دنیا کا سب سے بڑا عالم

ایک بار خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں تشریف لے گئے تو عیسیٰ بن موسیٰ نے منصور سے کہا کہ یہ شخص آج کل دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے۔ اور مکی بن ابراہیم کا قول ہے (جن کے واسطہ سے امام بخاری کی اکثر ثلاثیات مروی ہیں) کہ ابوحنیفہؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ میں نے حدیث کی شرح کرنے میں امام ابوحنیفہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا اور یزید بن ہارون نے (جو صحاح ستہ کے رجال میں بڑے درجہ کے ثقہ اور حجت ہیں) فرمایا کہ میں نے ایک ہزار علماء کو پایا اور اکثر سے حدیث لکھی ان میں پانچ شخصوں سے زیادہ فقیہ زیادہ متقی زیادہ عالم کسی کو نہیں پایا۔ جن میں پہلا نمبر امام ابوحنیفہ کا ہے اھ علامہ ابن عبدالبر نے جامع العلم میں اس کو

بیان کیا ہے۔ خطیب نے شداد بن حکیم کا قول نقل کیا ہے۔ کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ علم والا کسی کو نہیں دیکھا اھ۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن داؤد خریبی سے سنا وہ فرماتے تھے کہ اہل اسلام پر امام ابوحنیفہ کے لئے نمازوں میں دعا کرنا واجب ہے اس کے بعد حدیث وفقہ کو مسلمانوں کے لئے امام صاحب کا محفوظ کرنا بیان کیا۔ امام ابو جعفر شیرازی نے شقیق بلخی کا قول نقل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ سب سے زیادہ متقی سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عابد تھے۔ ابراہیم بن عکرمہ مخزومی نے کہا میں نے کسی عالم کو امام ابوحنیفہ سے زیادہ عابد و زاہد اور ان سے زیادہ علم والا نہیں دیکھا اھ۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں کوفہ پہنچا تو وہاں کے علما سے دریافت کیا کہ تمہارے شہروں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ سب نے کہا۔ امام ابوحنیفہ، خلف بن ایوب فرماتے ہیں کہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا پھر آپ کے اصحاب کو پہنچا پھر تابعین کو اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے پاس پہنچ گیا۔'' اور ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں حدیث وقرآن ہی کا نام علم تھا۔ جو شخص اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم تھا۔ وہ قرآن و حدیث کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔ اس لئے امت کا اتفاق ہے کہ امام صاحب بڑے فقیہ مجتہد تھے۔ اور اس لئے ان کو امام اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی تعریف میں اکابر دین کی شہادتیں

(۱) خطیب نے محمد بن بشر سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوری کے پاس آتا جاتا تھا جب میں سفیان ثوری کے پاس جاتا اور وہ پوچھتے کہاں سے آرہے ہو؟ میں کہتا امام ابوحنیفہؒ کے پاس سے آرہا ہوں تو فرماتے تم سب سے بڑے فقیہ زمانہ کے پاس سے آئے ہو۔

(۲) حجر بن عبدالجبار کہتے ہیں کہ قاسم بن معن سے کسی نے کہا کہ تم امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں شمار ہونے پر راضی ہو؟ تو فرماتے ہیں کہ امام بوحنیفہؒ کی مجلس سے زیادہ نفع بخش کسی کی مجلس نہیں۔

(۳) محمد بن مزاحم نے عبداللہ بن مبارک سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں

کہ ابوحنیفہؒ سب سے بڑے فقیہ ہیں میں نے فقہ میں ان کی مثل کسی کونہیں دیکھا۔

(۴) نیز فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ذریعہ سے میری (علمی) مدد نہ فرماتے تو میں عام لوگوں کی طرح ایک آدمی ہوتا۔

(۵) حافظ ابونعیم کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ مسائل (شرعیہ) میں بڑے باریک بین تھے۔

(۶) یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن قطان کو یہ کہتے سنا کہ ہم اللہ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے ہم نے امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے بہتر رائے نہی سنی اور ہم نے بکثرت ان کے اقوال کو اختیار کیا ہے۔

(۷) ربیع و حرملہ (جو امام شافعیؒ کے خاص شاگردوں میں ہیں) فرماتے ہیں کہ ہم نے امام شافعیؒ سے سنا فرماتے تھے کہ فقہ میں سب لوگ امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں (یعنی ان سے مستفید) ''تہذیب''

(۸) امام اسفرائنی نے اپنی سند سے علی بن المدینی (شیخ الامام البخاری) سے نقل کیا ہے کہ میں نے عبدالرزاق سے سنا ہے کہ ان کے استاد معمر فرماتے تھے کہ حسن بصری کے بعد امام ابوحنیفہؒ سے بہتر فقہ میں گفتگو کرنے والا کسی کونہیں پایا۔

(۹) ابوحیان توحیدی کہتا ہے کہ تمام بادشاہ سیاست میں حضرت عمرؓ کے عیال ہیں اور فقہاء قیاس میں امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں۔

(۱۰) نضر بن شمیل فرماتے ہیں کہ لوگ فقہ میں سوئے ہوئے تھے یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے ان کو اپنے بیان و تحقیق سے بیدار کر دیا۔ (تلک عشرہ کاملہ)

امام ابوحنیفہؒ کا حافظ حدیث ہونا مسلم ہے اور اس بارے میں چند شہادتیں

اور ظاہر ہے کہ فقہ بغیر حفظ احادیث و آثار اقوال صحابہ و تابعین اور معرفت اختلافات و ناسخ و منسوخ کے حاصل نہیں ہوسکتا جب علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ امام

ابوحنیفہؒ سب سے بڑے فقیہ تھے تو اس سے ان کا حافظ احادیث ہونا خود مسلم ہو گیا۔

(۱) اسی لئے ابن خلدون مورخ نے کہا ہے کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کے مجتہد عظیم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ علماء کے درمیان ان کے مذہب پر اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے اور اس سے رداً وقبولاً بحث کی جاتی ہے۔

(۲) علامہ ذہبی نے امام صاحب کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ خطیب نے اسرائیل بن یونس سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ بڑے اچھے آدمی ہیں جن حدیثوں میں احکام (شرعیہ) مذکور ہیں ان کے بہت بڑے حافظ اور بہت زیادہ محقق اور مسائل حدیث کے بہت بڑے عالم ہیں۔

(۳) علامہ ابن القیم نے اعلام الموقعین یحییٰ بن آدم کا قول نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شہر کی سب حدیثوں کو جمع کرلیا تھا اور شروع سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تمام حدیثوں پر ان کی نظر تھی اس سے بڑھ کر امام صاحب کے حافظ حدیث ہونے کی اور کیا دلیل ہوگی کیونکہ اس وقت کوفہ مرکز علوم تھا وہاں بڑے بڑے حفاظ حدیث موجود تھے۔

(۴) یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میں نے وکیع سے افضل کسی کو نہیں پایا اور وہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر فتوے دیتے اور ان کی سب حدیثوں کے حافظ تھے انہوں نے امام صاحب سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

(۵) سفیان بن عیینہ کا قول گزر چکا ہے کہ مجھے سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ نے محدث بنایا میں کوفہ پہنچا تو امام صاحب نے لوگوں سے کہا یہ شخص عمرو بن دینار کی حدیثوں کا سب سے بڑا عالم ہے ان کے اس فرمانے سے لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور میں نے درس حدیث شروع کر دیا۔

(۶) محمد بن سماء (شاگرد امام محمد بن الحسن) کہتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنی کتابوں میں ستر ہزار سے اوپر حدیثیں ذکر کی ہیں اور کتاب الآثار کو چالیس ہزار حدیثوں سے منتخب فرمایا ہے۔

(۷) حافظ ابن حجر نے تہذیب میں فرمایا ہے کہ محمد بن سعد عوفی کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے سنا کہ ابوحنیفہ ثقہ ہیں۔ وہی حدیث بیان کرتے ہیں جو حفظ یاد ہو اور جو حفظ یاد نہ ہو اس کی روایت نہیں کرتے (یعنی صرف کتاب پر اعتماد کر کے روایت نہیں کرتے)

(۸) صالح بن محمد نے یحییٰ بن معین سے روایت کیا ہے کہ ابوحنیفہؒ ثقہ ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے کتاب الانتقاء میں بیان کیا ہے کہ ابن معین اور عبداللہ بن احمد دورتی سے سوال کیا گیا کہ کیا ابوحنیفہؒ سے حدیث سنی جائے؟ ابن معین نے کہا وہ ثقہ ہیں میں نے کسی کو انہیں ضعیف کہتے نہیں سنا۔ یہ شعبۃ بن الحجاج ان کو لکھتے ہیں کہ میرے حکم سے حدیث بیان کرو اور شعبہ شعبہ ہی ہے۔ الخ۔

(۹) ابن عبدالبر نے جامع العلم میں بیان کیا ہے کہ ابن معین سے کسی نے کہا اے ابوزکریا! کیا ابوحنیفہ حدیث میں سچے ہیں؟ فرمایا ہاں بہت سچے ہیں شعبہ کی رائے ان کے بارے میں بہت اچھی تھی۔ ابن عبدالبر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علی بن المدینی نے کہا کہ ابوحنیفہ سے سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک روایت کرتے ہیں وہ ثقہ ہیں ان میں کوئی بات نہیں۔

(۱۰) حافظ ابن الاثیر جزری فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ علوم شرعیہ میں بہت اچھے امام تھے ابن حجر مکی نے خیرات حسان میں لکھا ہے کہ شعبہ نے فرمایا بخدا ابوحنیفہؒ بہت سمجھدار اور اچھے حافظہ والے تھے۔ (تلک عشرۃ کاملہ)

ایک واقعہ

ابن مندہ نے اپنی سند سے ابن معین سے روایت کیا ہے کہ میں نے علی بن سہر سے سنا کہ جب اعمش حج کو چلے تو قادسیہ پہنچ کر مجھے بلایا ان کو معلوم تھا کہ میں ابوحنیفہ کے حلقہ میں بیٹھا کرتا ہوں فرمایا کہ کوفہ واپس جاؤ اور ابوحنیفہ سے درخواست کرو کہ میرے واسطے احکام حج قلم بند فرمادیں۔ چنانچہ میں واپس ہوا اور ان سے یہ درخواست کی تو امام

صاحب نے مجھے احکام حج املا کرا دیئے۔ پھر میں اس کتاب کو لے کر اعمش کے پاس آیا (اس سے معلوم ہو گیا کہ محدثین کو امام صاحب کے علم پر کس قدر اعتماد تھا)

امام ابوحنیفہؒ کے علو مرتبہ پر دیگر شہادتیں

(۱) امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ مشکل مسائل کو ابوحنیفہ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

(۲) امام جعفر صادق نے فرمایا کہ ابوحنیفہ اپنے شہر میں سب سے بڑے فقیہ ہیں۔

(۳) یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ میں نے حسن بن صالح سے سنا کہ ابوحنیفہ جہاں تک ہم جانتے ہیں حدیث میں بڑے ثقہ تھے۔

(۴) ابن مبارک فرماتے ہیں کہ مسعر (بن کرام) جب امام صاحب کو دیکھتے کھڑے ہو جاتے اور آپ کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے تھے وہ امام صاحب کے بڑے معتقد اور ثنا خواں تھے، اور دنیا جانتی ہے کہ مسعر بن کرام حفظ حدیث اور زہد میں کوفہ کے لئے فخر تھے۔

(۵) سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ مسعر بن کرام فرماتے تھے جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان ابوحنیفہؒ کو واسطہ بنا لے مجھے امید ہے کہ اس کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا اور اس نے اپنے لئے احتیاط میں کچھ کوتاہی نہیں کی (کیونکہ امام صاحب کا مذہب احتیاط پر ہی مبنی ہے۔

(۶) ابن حجر نے قلائد العقیان میں لکھا ہے کہ امام سفیان ثوری فرماتے تھے کہ ہم امام ابوحنیفہ کے سامنے ایسے تھے جیسے باز کے سامنے چڑیا اور واقعی وہ سید العلماء ہیں (علماء کے سردار)

(۷) ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں ابن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میرے نزدیک قرأت تو حمزہ کی قرأت ہے۔ اور فقہ ابوحنیفہؒ کا فقہ ہے میں نے اسی پر لوگوں کو پایا ہے۔

(۸) ابن حجر فرماتے ہیں کہ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ مشہور اماموں میں کسی کو ایسے اصحاب اور شاگرد نصیب نہیں ہوئے جیسے امام ابوحنیفہؒ کو نصیب ہوئے اور علماء وعوام نے جتنا نفع امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے احادیث مشکلہ کی تفسیر اور مسائل کے استنباط میں حاصل کیا اتنا اور کسی سے حاصل نہیں کیا۔

(۹) حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ جن محدثین نے امام اصاحب کے بارے میں کلام کیا ہے ان کے نزدیک امام صاحب میں بڑا عیب یہ تھا کہ وہ رائے اور قیاس میں زیادہ انہماک رکھتے تھے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں (اگر فقیہ قیاس سے کام نہ لے تو قرآن حدیث سے مسائل کا استنباط کیونکر ہوگا؟ اور علم فقہ کس طرح مدون ہوگا؟)

(۱۰) یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب یعنی اہل حدیث امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں بہت زیادتی کرتے ہیں۔

(۱۱) ابن داؤد خریبی (جو اصحاب صحاح کے رجال میں ثقہ شمار ہوتے ہیں) فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے متعلق لوگ دو قسم پر ہیں ایک حاسد دوسرے جاہل اور میرے نزدیک ان میں جاہل اچھا ہے (کہ بے چارہ معذور ہے) ایک شخص نے ابن داؤد خریبی سے پوچھا کہ لوگوں نے (یعنی اہل حدیث نے) امام ابوحنیفہؒ میں کیا عیب دیکھا؟ فرمایا بخدا مجھے تو اس کے سوا اور کوئی عیب معلوم نہیں ہوا کہ ابوحنیفہ بولتے ہیں تو صحیح بات کہتے ہیں اور دوسرے بولتے ہیں تو خطا کرتے ہیں میں نے امام صاحب کو صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھا میں خود ان کے ساتھ تھا اور مخلوق کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔

(۱۲) موسیٰ بن ابی عائشہ نے (جو اصحاب صحاح کے رجال میں ثقہ عابد تابعی ہیں) ایک بار امام صاحب کی کوئی حدیث بیان کی تو حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا ہم ان کی حدیث نہیں چاہتے فرمایا خبردار اگر تم ان کو دیکھتے تو ضرور چاہتے مجھے تمہارے اور ان کے متعلق کس شاعر کا یہی قول یاد آتا ہے۔

اقلوا علیهم ویلکم لا ابالکم
من اللوم اوسدو المکان الذی سدوا

ترجمہ: تمہارا ناس ہوتمہارا باپ مرے ان پر ملامت کم کردیا اس جگہ کو پر کردو جسے انہوں نے پر کیا۔ (خطیب بغدادی)

(۱۳) علامہ عینی نبایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے ائمہ نے امام صاحب کے مدح وثنا کی ہے جن میں عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، اعمش، سفیان ثوری، عبدالرزاق حماد بن زید اور وکیع جیسے حضرات ہیں۔ ائمہ ثلثہ امام مالک و شافعی احمد رحمہم اللہ امام صاحب کی رائے پر فتویٰ دیا کرتے تھے ان کے علاوہ اور دوسرے بھی بہت حضرات ہیں۔

(۱۴) اسماعیل بن ابی فدیک کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو دیکھا کہ امام ابوحنیفہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے چل رہے تھے جب مسجدی نبویؐ کے قریب پہنچے تو امام ابوحنیفہ کو آگے کردیا۔

(۱۵) نضر بن محمد مروزی شاگرد امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید انصاری اور ہشام بن عروہ اور سعید بن ابی عرہ کوفہ آئے تو امام صاحبؒ نے ہم سے فرمایا کہ جاؤ دیکھو ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جس کو ہمیں سننا چاہیے؟ اس سے امام صاحب کی طلب حدیث کی شان ظاہر ہے۔

(۱۶) جبان بن علی (محدث جلیل) فرماتے ہیں کہ دین و دنیا کے جس معاملہ میں بھی امام صاحبؒ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا ان کے پاس کوئی اچھا اثر ضرور ملتا تھا (خواہ حدیث مرفوع ہو یا قول صحابہ وتابعین)

(۱۷) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے باپ نے فرمایا کہ بیٹا تم نعمان بن ثابتؒ کی صحبت کو اپنے اوپر لازم کرلو ان کی وفات سے پہلے ان سے علم حاصل کرلو۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ میں امام ابوحنیفہؒ کے فتاوی اپنے باپ کے سامنے پیش کرتا تو بڑا تعجب کرتے تھے (یہ دونوں باپ بیٹے ثقات حفاظ میں سے ہیں)

(۱۸) وکیع بن جراح سے کسی نے کہا آپ امام زفر کے پاس بہت آتے جاتے ہیں؟ فرمایا تم لوگوں نے ہمیں امام ابوحنیفہ کے متعلق تو دھوکہ میں رکھا۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔اب زفرؒ کے متعلق بھی دھوکہ دینا چاہتے ہوتا کہ ہمیں اس کے بعد اس کے شاگردوں کامحتاج بننا پڑے۔ (یہ وکیع بن جراح وہی ہیں جن کے متعلق یحییٰ بن معین کا قول گزر چکا ہے کہ میں نے ان سے افضل کسی کونہیں پایا اور وہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوی دیا کرتے تھے۔ ابتداء میں ناواقف حضرات کی طرح یہ بھی امام صاحب سے منحرف تھے۔ جامع ترمذی میں جوان کے بعض اقوال امام صاحب کے خلاف مذکور ہیں وہ اسی زمانہ کے ہیں۔ بعد میں حقیقت منکشف ہوئی تو امام صاحب کی شاگردی اختیار کی مگر فقہ کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ امام صاحب کا انتقال ہوگیا تو امام زفر کی صحبت اختیار کی اس پر بعض محدثین نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو بتلا دیا کہ تم لوگ دھوکہ میں ہو اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہو۔تم نے امام صاحب کے اقوال کو سمجھا نہیں خواہ مخواہ ان کو مخالفت حدیث پر محمول کرنے لگے۔

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں خطیب بغدادی کے استاد کی شہادت

حافظ صمیری (خطیب بغدادی کے استاد جن کی وہ بہت تعریف اور توثیق کرتے ہیں (فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں علی بن مسہر بھی ہیں (جو اصحاب صحاح کے رجال ثقات میں سے ہیں) ان سے ہی سفیان ثوری نے امام ابوحنیفہؒ کا علم حاصل کیا اور ان کی کتابوں کو نقل کیا تھا۔ حافظ ابن سندہ نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ اعمش کے پاس ایک شخص آیا اور کوئی مسئلہ ان سے دریافت کیا تو فرمایا اس حلقہ میں پہنچ جاؤ مراد امام ابوحنیفہؒ کا حلقہ تھا کیونکہ ان کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا تو برابر اس میں باری باری کلام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ صحیح جواب پالیتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب شخصی نہیں بلکہ شورائی ہے

امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ اسد بن الضرات سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے جن اصحاب نے ان کی کتابیں مدون کی ہیں وہ چالیس افراد تھے جن میں دس

حضرات سب سے مقدم تھے جیسے امام ابو یوسف اور امام زفر اور داؤد طائی۔ اسد بن عمرو، یوسف بن خالد سمتی، یحیٰ بن زکریا بن ابی زائدہ یحیٰ بن زکریا نے تو تمیں سال تک خدمت کتابت وتدوین کا حق ادا کیا ہے۔

بقیہ حضرات کے نام خطیب بغدادی کی روایت میں مذکور ہیں یعنی حفص بن غیاث، قاسم بن معن، فضیل بن عیاض، حبان بن علی، مندل بن علی، امام محمد بن الحسن، وغیرہم خطیب نے اپنی سند کے ساتھ ابن کرامہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے وکیع بن جراح سے کہا کہ ابوحنیفہؒ نے (فلاں مسئلہ میں) خطا کی ہے تو انہوں نے امام صاحب کے ان اصحاب گرامی کا نام لے کر فرمایا کہ جس کو مجلس میں ایسے ایسے مجتہد اور حفاظ حدیث اور ماہران عربیت اور زہاد واتقیاء رہتے ہوں وہ کیسے خطا کر سکتا ہے اور خطا کر بھی جائے تو یہ لوگ اسے خطاء پر کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ یقیناً حق کی طرف لے آئیں گے۔ مفصل روایت اوپر گزر چکی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مذہب ابوحنیفہؒ شخصی نہیں ہے بلکہ شورائی ہے کہ چالیس ائمہ اجلہ کے مشورہ کے بعد مسائل لکھے جاتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ جس طرح فقہ کے امام اعظم ہیں اسی طرح علم حدیث کے بھی بڑے امام اور مجتہد ہیں

کتب اسماء رجال واصول حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جرح وتعدیل کے باب میں جس طرح شعبہ اور امام مالک کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے اقوال بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ امام سفیان ثوریؒ جیسے بزرگوں کے متعلق بھی امام صاحب سے دریافت کیا جاتا تھا کہ ان سے روایت کی جائے یا نہیں؟ امام صاحب نے فرمایا ہاں ان سے روایت کرو وہ ثقہ ہیں۔ مگر ابواسحاق کی حدیثیں حارث کے واسطہ سے نہ لینا۔ اسی طرح جابر جعفی کی حدیث بھی نہ لینا (کتاب المدخل للبیہقی) اس سے امام صاحب کا درجہ علم حدیث میں کس قدر بلند نظر آتا ہے کہ وہ سفیان ثوریؒ جیسے محدث جلیل کی حدیثوں پر ناقدانہ کلام فرماتے ہیں۔ حارث اعور اور جابر جعفی امام صاحب کے

نزدیک لائق اعتماد نہ تھے۔ مگر سفیان ثوریؒ ان کی حدیثوں کو بے تکلف روایت کرتے تھے اس لئے امام صاحب نے سائل کو متنبہ کر دیا کہ سفیان کی وہ حدیثیں نہ لینا جو ان مجروحین کے واسطہ سے ہوں۔ امام صاحب نے عطاء بن ابی رباحؒ، امام جعفر صادقؒ کی توثیق کی۔ زید بن عیاش کو مجہول کہا۔ طلق بن حبیبؒ کو قدری بتلایا۔ جہم بن صفوان کو معطلہ میں شمار کیا مقاتل کو مجسمہ میں داخل کیا اور ان کے یہ اقوال محدثین نے کتب اسماء رجال میں نقل کئے اور احتجاج و اعتماد کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ عمرو بن دینارؒ کی کیفیت لوگوں کو امام صاحب ہی سے معلوم ہوئی۔ عبداللہ بن مغفلؓ صحابی کے بیٹے یزید کا نام امام صاحب کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا اصول حدیث کی کتابوں میں برابر امام صاحب کے اقوال بیان کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تدریب الراوی اور مقدمہ اعلاء السنن وغیرہ جن سے امام کی عظمت شان کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس طرح فقہ میں امام اعظم ہیں اسی طرح علم حدیث کے بھی بڑے امام اور مجتہد ہیں علامہ ذہبی جیسے اہل انصاف نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

تاریخ خطیب بغدادی کی مہمل روایات کی حقیقت

اس کے بعد تاریخ خطیب بغدادی کی وہ مہمل روایات جو مجہولین، کذابین، مجروحین سے نقل کی گئی ہیں سب پادر ہوا ہو گئیں کیونکہ اصول حدیث کا یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ جس شخص کی امامت و عدالت درجہ تواتر و شہرت کو پہنچ جائے اس کے متعلق کوئی جرح قبول نہ کی جائے گی۔ اور امام صاحب کی عدالت و امامت کی تو یہ شان ہے۔

کالشمس فی کبدالسماء وضوءھا یغشی البلاد مشارقا ومغاربا

جیسے آفتاب وسط آسمان چمک رہا ہو جس سے مشرق و مغرب میں روشنی پھیل رہی ہے اگر کسی اندھے کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو اس میں آفتاب کا قصور نہیں اس کی آنکھوں کا قصور ہے۔

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

پھر یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ بہت لوگوں کو امام صاحب سے اور ان کے شاگردوں سے حسد تھا جو لوگ ان پر جرح کرتے تھے وہ افراط وتفریط اور حدود سے تجاوز کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی جرح ہرگز قابل التفات نہیں ہوسکتی۔

فدتہ نفوس الحاسدین فانھا معذبۃ فی حقرۃ و مغیب

وفی تعب من یحسد الشمس ضؤھا ویجھد ان یأتی بھا لضریب

حاسدوں کی جانیں ان پر فدا ہو جائیں کیونکہ وہ تو ان کے سامنے بھی عذاب میں گرفتار ہیں اور پیچھے بھی اور جو شخص آفتاب کی روشنی پر حسد کرنے لگے اور اس جیسا دوسرا لانے کی کوشش کرے وہ خود بھی پریشان ہوگا جس کو اس سے زیادہ امام صاحب کے فضائل و مناقب معلوم کرنے کا شوق ہو وہ میری کتاب انجاء الوطن کی طباعت کا انتظار کرے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے اچھی طرح حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

طلوع اسلام کے غلط دعاوی

اس کے بعد طلوع اسلام نے عنوان قائم کیا ہے کہ ''حنفی کیونکر اہل حدیث بن گئے'' اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کے معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو حنفیہ نے چھوڑ دیا ہے وہ روایت پرست حضرات کے طوفان سے تنگ آ کر خود ان ہی کے سایہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔''

یہ ساری عمارت اسی غلط دعوے پر مبنی ہے جو گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے کہ فتنہ خلق قرآن فرو ہونے کے بعد طاقت اقتدار محدثین کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور انہوں نے حنفیہ سے انتقام لینا شروع کیا تو وہ اہل حدیث سے مرعوب ہو گئے۔ ''ہم نے اس غلط بیانی پر طلوع اسلام کو تاریخ میں بدل ڈالنے میں انگریز کا شاگرد بتلا کر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اس فتنہ کے فرو ہو جانے کے بعد بھی عہدۂ قضا برابر حنفیہ کے ہاتھ میں رہا۔ ہمیں بتلایا جائے کہ فتنہ خلق قرآن فرو ہو جانے کے بعد محدثین کے ہاتھ میں محکمہ احتساب کب اور کس خلیفہ کے زمانہ میں آیا؟ اپنی طرف سے یہ ایک فرضی افسانہ

گھڑ لینا اور اس پر غلط دعوے کی بنیاد قائم کر کے یہ کہہ دینا کہ حنفیہ محدثین سے مرعوب ہو کر اہل حدیث بن گئے تھے۔ شیخ چلی کی خرافات نہیں تو اور کیا ہے؟ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الصدیق امامت نمبر بابت ماہ جمادی الاخری ۱۳۷۵ھ)

طلوع اسلام نے اس غلط بیانی کے بعد اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''اس طوفان بدتمیزی کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت کی اکثریت کا مسلک فقہ حنفی ہی کے مطابق رہا اور حنفی مسلمان اس وقت تک اہل حدیث سے الگ فرقہ کی حیثیت سے موجود چلے آتے ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ اکثریت میں ہیں۔''

میں کہتا ہوں کہ فتنۂ خلق قرآن کے وقت بھی اور اس کے فرو ہو جانے کے بعد بھی امت کی اکثریت کا مذہب فقہ حنفی ہی تھا اور وہ کسی وقت بھی اہل حدیث سے مرعوب نہیں ہوئے نہ ان کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے یہ سب طلوع اسلام کا تراشا ہوا افسانہ ہے۔

طلوع اسلام کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ حنفیہ کے نزدیک صرف متواتر حدیث قابل قبول ہے

آگے چل کر پھر وہی بے تکی ہانکی کہ احناف حدیث کے معاملہ میں ظاہری طور پر اپنی فقہ کے موسس امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متبع نہیں رہے لیکن حدیث کو قبول کرنے کے لئے خود ان کی اصول کی کتابوں میں جو شرائط مذکور ہیں وہ اہل حدیث کی شرائط سے بالکل مختلف ہیں پھر علامہ محمد الخضر ی مصری کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''حنفیہ کے نزدیک صرف متواتر حدیث ہی اصولاً قابل قبول ہے۔'' ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ کسی امام کا مذہب معلوم کرنے کے لئے خود ان کی کتابوں اور اس کے اصحاب کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ دنیا کے سامنے مسانید امام اعظم موجود ہیں۔ امام محمدؒ کی موطا اور کتاب الآثار، امام ابویوسفؒ کی کتاب الخراج اور کتاب الآثار طبع ہو چکی ہیں۔ کیا طلوع اسلام یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کی سب حدیثیں متواتر ہیں؟ امام محمد نے کتاب الحجج

اور موطا میں جن احادیث سے مالکیہ کے اقوال کا رد کیا ہے اور امام ابو یوسف نے سیر الاوزاعی کی تنقید میں جو روایات بیان کی ہیں کیا وہ بھی سب متواتر ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہو گیا کہ خبر متواتر کی تعداد ایک یا دو سے زیادہ نہیں'' اور اگر نفی میں ہے تو یہ دعویٰ غلط ہے کہ حنفیہ کے نزدیک صرف متواتر حدیث ہی قابل قبول ہے متاخرین کی کتابوں کو چھوڑ دو کہ وہ تو طلوع اسلام کے نزدیک محدثین کے نزدیک مرعوب ہو گئے تھے خود امام اعظمؒ اور ان کے اصحاب کی کتابیں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ فقہ حنفی کے موسس اخبار آحاد کو حجت مانتے اور ان سے احکام کا برابر استنباط کرتے رہتے ہیں ہلال رازی کی کتاب الاوقاف طبع ہو چکی ہے اور وہ بلاواسطہ امام ابو یوسفؒ کے شاگرد ہیں امام جصاص رازیؒ امام طحاویؒ صرف دو واسطوں سے امام محمدؒ و ابو یوسفؒ کے شاگرد ہیں۔ امام سرخسیؒ اور شمس الائمہ بزدویؒ تین چار واسطوں سے صاحبین کے شاگرد ہیں ان کی کتابیں اصول فقہ حنفی میں دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا کوئی ان کتابوں سے ثابت کر سکتا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک صرف خبر متواتر ہی حجت ہے اخبار آحاد حجت نہیں۔

طلوع اسلام کے دعوی کی تردید اور اخبار آحاد کے قبول کرنے کی شرائط

فقہ حنفی کے موسس اعلیٰ اور ان کے اصحاب کی کتابوں سے اخبار آحاد کے قبول کرنے کی جو شرائط معلوم ہو رہی ہیں مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(۱) مراسیل ثقات حجت ہیں جبکہ ان سے قوی تر حجت معارض نہ ہو حدیث مرسل کا حجت ہونا قرون فاضلہ میں سنت متوارث تھی۔ ابن جریر کا قول ہے کہ مرسل کو مطلقاً رد کر دینے کی بدعت دوسری صدی کے شروع میں ظاہر ہوئی ہے (ملاحظہ ہو اصول باجی و تمہید ابن عبدالبر و شرح علل الترمذی لابن رجب) امام بخاری جزو قرأت خلف الامام وغیرہ میں تو مرسل سے احتجاج کرتے ہی ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے بعض مقامات پر اپنی صحیح میں بھی مرسل سے احتجاج کیا ہے۔ صحیح مسلم میں بھی کچھ مراسیل موجود ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم للعلامۃ العثمانی) جو لوگ

محض ارسال کی بناء پر مرسل کو مطلقاً ضعیف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں وہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آدھا حصہ چھوڑتے ہیں جس کو امام ابوحنیفہ نے قبول کیا ہے امام ابوحنیفہ کا مرسل کو حجت سمجھنا ایسا مشہور مسئلہ ہے جس سے علم فقہ کا ادنیٰ طالب علم بھی انکار نہیں کر سکتا مذہب حنفی کے بہت سے مسائل حدیث مرسل ہی پر مبنی ہیں جیسے نماز میں قہقہہ سے وضو کا باطل ہو جانا اور دارالحرب میں حربی کافر سے سودی معاملہ کا جائز ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اگر طلوع اسلام کے نزدیک حنفیہ صرف حدیث متواتر ہی کو حجت مانتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ ان مسائل میں حنفیہ کے پاس کون سی متواتر حدیث ہے؟ اور جبکہ امام صاحب کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے تو یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ اسی حدیث کو مانتے ہیں جس پر فقہاء امصار متفقۃ عامل ہوں کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ حدیث مرسل کو تمام فقہاء نہیں مانتے۔

(۲) قرآن وسنت سے جو اصول کلیہ جمع کئے گئے ہیں اگر کوئی خبر واحد ان اصول کے خلاف وارد ہوگی تو اس میں تاویل کی جائے گی۔ اصول کو نہیں چھوڑا جائے گا جیسے حدیث مصراۃ قاعدہ کلیہ الخراج بالضمان کے خلاف ہے حنفیہ نے اس کو حکم سیاسی پر محمول کیا ہے اگر کسی وقت خلیفہ کو ضرورت محسوس ہو تو سیاستۃً حدیث مصراۃ کو جاری کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اصل قاعدہ پر عمل کیا جائے گا۔ علماء اور فقہا اس اشارہ کو سمجھ جائیں گے۔ اگر ادارہ طلوع اسلام نہ سمجھے تو اس کی فہم کا قصور ہوگا۔

مخالفیت اصول کی بناء پر کسی صحیح حدیث کے ظاہر کو چھوڑ دینا اور اس میں تاویل کرنا حدیث کی مخالفت نہیں بلکہ قوی دلیل کو ضعیف پر ترجیح دینا ہے جس سے کسی مجتہد کو بھی چارہ نہیں۔

(۳) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کتاب اللہ کے عمومات اور ظواہر بھی قطعی ہیں اگر خبر واحد کسی عام یا ظاہر کتاب اللہ کے خلاف وارد ہوگی تو اس میں تاویل کی جائے گی کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کو نہیں چھوڑا جائے گا۔

(۴) جو خبر واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے خلاف نہ ہو بلکہ مجمل کتاب اللہ

کا مطلب واضح کر رہی ہو وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حجت ہے کیونکہ جب کتاب اللہ کی عبارت مجمل ہے تو بغیر بیان کے وہ کسی حکم پر دلالت نہیں کرسکتی جیسے آیت وضو میں لفظ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ مجمل ہے اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ پورے سر کا مسح مراد ہے یا بعض کا تو جن اخبار آحاد میں مسح ناصیہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا ہے ان کو آیت کا بیان قرار دے کر حنفیہ نے چوتھائی سر کا مسح لازم کیا۔ اسی طرح والمطلقٰت یتربّصن بانفسھن ثلاثۃ قروء میں لفظ قروء مجمل ہے کہ اس سے مراد حیض ہے یا طہر کیونکہ لغۃً یہ لفظ دونوں معنی میں مستعمل ہے حنفیہ نے حدیث عدۃ الامتہ حیضتان کو اس کا بیان قرار دے کر ثلثۃ قروء سے تین حیض مراد لئے ہیں۔ کیا طلوع اسلام کے نزدیک یہ حدیثیں متواتر ہیں؟ اگر نہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ حنفیہ متواتر کے سوا کسی حدیث کو نہیں مانتے۔

(۴) خبر واحد کے مقبول ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو خواہ سنت مشہورہ قولی ہو یا فعلی کیونکہ سنت مشہورہ بہر حال مقدم ہے اگر اس کے خلاف خبر واحد وارد ہوگی تو یا منسوخ ہوگی یا مؤوّل۔

(۵) ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایک خبر واحد کے معارض دوسری خبر واحد نہ ہو اگر دو خبریں معارض ہوں گی تو ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے گی۔ وجوہ ترجیح معلوم کرنے کے لئے میرا مقدمہ اعلاء السنن ملاحظہ کیا جائے نماز کے اندر آمین بلند آواز سے کہنا اور رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین کرنا اسی اصل کے ماتحت ہے کہ اس میں متعارض خبریں وارد ہیں امام صاحب نے آمین بالسر اور ترک رفع یدین کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ دوسری روایتوں کو تعلیم پر محمول کیا یا منسوخ قرار دیا۔

(۶) ایک شرط یہ بھی ہے کہ خود راوی کا عمل اپنی روایت کے خلاف نہ ہو۔ جیسے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اذا ولغ الکلب فی اناء احد کم فلیغسلہ سبعا الخ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات دفعہ دھویا جائے ان کے فتوے کے خلاف ہے جس میں تین بار دھونے کو کافی کہا گیا ہے اس صورت میں عمل راوی کو ترجیح دی جائیگی۔ اور

روایت کو استحباب وغیرہ پر محمول کیا جائے گا۔ اس اصول میں بہت سے فقہاء سلف امام صاحب کے ساتھ ہیں۔ جیسا شرح علل الترمذی لابن رجب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

(۷) عموم بلویٰ میں خبر واحد قبول نہ کی جائے گی یعنی صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں جو عمل عام طور سے رواج پذیر ہوا اس کے خلاف خبر مشہور یا متواتر ہی قبول کی جاسکتی ہے خبر واحد قبول نہ کی جائے گی۔ جیسے تراویح کا بیس رکعت ہونا حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی عام معمول تھا اس کے خلاف مؤطا کی وہ روایت قبول نہ کی جائے گی جس میں تراویح کی آٹھ رکعت مذکور ہیں۔ اس کو راوی کا وہم قرار دیا جائے گا کہ اس کو تراویح اور تہجد میں خلط ہوگیا ہے یا کسی عذر پر محمول کیا جائے گا۔

(۸) جو خبر واحد کسی ایسے حکم کے متعلق وارد ہو جس میں صحابہ کا اختلاف ہے تو اس کے مقبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے کسی صحابی نے اس حدیث کو رد نہ کیا ہو جسے ایک صحابی روایت کر رہا ہے۔

(۹) خبر واحد کے مقبول ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ سلف میں سے کسی نے اس حدیث میں یا اس کے راوی میں کوئی جرح نہ کی ہو سلف سے مراد صحابہ واکابر تابعین ہیں۔

(۱۰) حدود اور تعزیرات میں اختلاف روایات کے وقت اسی روایت کو ترجیح ہوگی جس میں زیادہ خفت ہو۔

(۱۱) اسی طرح حدود میں اختلاف روایات کے وقت اسی روایت کو لیا جائے گا جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ ہو۔

کیونکہ حدود کو شبہات سے ساقط کر دینے کا حکم ہے۔ اسی لئے امام صاحبؒ نے دس درہم (پونے تین روپے) سے کم قیمت کا مال چرانے میں چور کا ہاتھ کاٹنے کو منع فرمایا ہے کیونکہ اس باب میں روایات مختلف ہیں بعض میں رُبع دینار آیا ہے (اڑھائی درہم) بعض میں دس درہم آیا ہے احتیاط اسی میں ہے کہ دس درہم کی روایت کو ترجیح دی جائے۔

(۱۲) حدیث سننے کے بعد سے روایت کرنے کے وقت تک راوی کو حدیث حفظ یاد ہو۔ درمیان میں کسی وقت بھولا نہ ہو۔ اگر اس نے استاذ سے حدیث سن کر قلم بند کرلی۔ پھر حفظ یاد نہ رہی تو صرف کتاب کے بھروسہ پر روایت کرنا امام صاحب کے

نزدیک جائز نہیں۔ صاحبین اور جمہور فقہا و محدثین کے نزدیک جائز ہے جبکہ اپنی قلم کو پہچانتا ہے اور کتاب کی پوری حفاظت کرتا رہا ہے۔

طلوع اسلام کا دعویٰ جہالت پر مبنی ہے

حافظ محمد بن یوسف صالحی (شافعی) نے اپنی کتاب عقود الجمان فی مناقب النعمان میں حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ کے ان اعتراضات کے جواب میں جو امام ابوحنیفہؒ پر انہوں نے اپنی مصنف میں کئے ہیں۔ ان ہی اصول کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ امام نے ان اصول کی بناء پر بعض اخبار آحاد پر عمل نہیں کیا اور اس میں وہ منفرد نہیں ہیں کیونکہ کوئی مجتہد بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ ساری حدیثوں پر عمل کرتا ہے۔ جب کسی مسئلہ میں مختلف روایتیں ہوں گی لامحالہ ایک کو لیا جائے گا۔ دوسری کو ترک کیا جائے گا۔ پھر وجوہ ترجیح میں مجتہدین کی رائیں مختلف ہوسکتی ہیں کوئی حفظ و اتقان رواۃ کی بناء پر ایک روایت کو دوسری پر ترجیح دیتا ہے کوئی فقہ راوی کی بناء پر ترجیح دیتا ہے کبھی ضعیف روایت کو حسن یا صحیح پر اس لئے ترجیح دی جاتی ہے کہ وہ سنت مشہورہ یا عموم کتاب اللہ یا ظاہر کتاب اللہ یا عمل صحابہ کے موافق ہے اس موافقت کی وجہ سے اس کا ضعف مبدل بقوت ہو جاتا ہے۔ طلوع اسلام کا یہ دعویٰ کہ حنفیہ زبان سے حدیث کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ جب حدیث پر عمل کرنے کا سوال سامنے آئے تو یا تو کوئی حدیث ان کی شرائط پر پوری ہی نہ اترے اور یا ضعیف اور موضوع حدیثوں کی آڑ لے لی جائے۔'' محض جہالت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حنفیہ سے زیادہ حدیث پر عمل کسی کا بھی نہیں ہے جب ان کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے تو موصول کیسے حجت نہ ہوگی؟ شافعیہ اور محدثین صرف موصول کو حجت مانتے ہیں۔ مرسل و منقطع کو ارسال و انقطاع کی علت سے رد کر دیتے ہیں۔ اب ہمیں بتلایا جائے کہ حدیث پر عمل حنفیہ زیادہ کرتے ہیں یا شافعیہ اور اہلحدیث؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ ضروری ہے کہ حنفیہ کے پاس بھی خبر واحد کی صحت وضعف کا فیصلہ کرنے کیلئے کچھ اصول ہیں جن کا نمونہ اوپر گزر چکا ہے دوسرے ائمہ اور محدثین کے پاس بھی کچھ

اصول ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث محدثین کے اصول پر صحیح ہو حنفیہ کے اصول پر صحیح نہ ہو یا محدثین کے اصول پر ضعیف ہو حنفیہ کے اصول پر ضعیف نہ ہو۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ جس حدیث کو محدثین نے اپنے اصول پر صحیح کہا ہے حنفیہ نے اس کو رد کبھی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ محمل حسن پر محمول کیا ہے جس کو شک ہو وہ ہماری کتاب اعلاء السنن اور اس کے مقدمہ انہاء السکن کا مطالعہ کرے۔

حنفیہ پر ایک افتراء

رہا حدیث کا موضوع کی آڑ لینا یہ تو سراسر افترا ہے۔ حنفیہ نے کسی مسئلہ میں بھی حدیث موضوع کی آڑ نہیں لی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ابن الجوزی جیسے متشددین نے کسی صحیح حدیث کو بھی موضوع کہہ دیا ہو اور دوسرے محدثین نے اس کو موضوع نہ مانا ہو۔ حنفیہ نے عام محدثین کے قول کو راجح قرار دے کر حدیث کے موضوع ہونے سے انکار کر دیا ہو، حدیث کو موضوع مان لینے کے بعد اس سے استدلال کرنا تو کجا اس کا روایت کرنا بھی جائز نہیں۔ جب تک یہ تصریح نہ کردی جائے کہ یہ حدیث موضوع ہے قول رسول نہیں ہے۔

طلوع اسلام کی ایک اور جہالت

آگے چل کر طلوع اسلام نے علامہ خضری مصری کے حوالہ سے امام ابو یوسفؒ کی کتاب الرد علی الاوزاعی کا اقتباس دیا ہے جس میں امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ
''تم صرف اس حدیث کو لو جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو اور شاذ حدیث کو چھوڑ دو''

اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو طلوع اسلام کے مسلک کی تائید کرتی ہو۔ محدثین وفقہا سب کے نزدیک روایت شاذہ حجت نہیں، خصوصاً جبکہ عموم بلوی میں وارد ہو تو حنفیہ کے نزدیک اصلا حجت نہیں۔

طلوع اسلام کی علمیت

اس کے بعد امام ابو یوسفؒ کے واسطہ سے چند حدیثیں بیان کی ہیں جو اکثر مرسل یا منقطع ہیں ان میں سے کوئی بھی مشہور یا متواتر نہیں اور طلوع اسلام کا دعویٰ یہ ہے

کہ حنفیہ کے نزدیک متواتر کے سوا کوئی حدیث قابل قبول نہیں ۔ پس یا تو امام ابو یوسفؒ کی طرف ان احادیث کی نسبت غلط ہے یا طلوع اسلام کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ حنفیہ کے نزدیک صرف حدیث متواتر ہی قابل قبول ہے ۔ پھر جس شمارہ میں امام ابو یوسف کی کتاب الرد علی الاوزاعی کا اقتباس دیا گیا ہے اسی میں حدیث مثلہ معہ کی تحقیق میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ محدثین کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں داخل کر دی جاتی تھیں (ص ۶۶ طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۲ء) تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ امام شافعی کی کتاب الام میں امام ابو یوسف کی کتاب الرد علی الاوزاعی بھی اسی طرح داخل نہ کر دی گئی ہو؟ آخر اس کی کیا وجہ کہ امام ابو یوسف کی یہ کتاب نہ امام محمد روایت کرتے ہیں نہ ہلال رازیؒ نہ عصام بن یوسفؒ نہ محمد بن سماعہؒ وغیرہم جو امام ابو یوسفؒ کے خاص شاگرد اور ان کی فقہ حنفی کے راوی اور امام ابوحنیفہ کے مقلد و متبع بھی ہیں صرف امام شافعی ہی کتاب الام میں روایت کرتے ہیں اور کتاب الام کو امام شافعیؒ سے روایت کرنے والا بھی تنہا ربیع بن سلیمان ہے جس کی حالت یہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے مناظرات و مکالمات کو ایسے انداز سے بیان کرتا ہے جس سے امام محمدؒ امام شافعیؒ کے سامنے طفل مکتب نظر آتے ہیں حالانکہ دنیا جانتی ہے اور خود شافعیہ کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ امام شافعیؒ امام محمد کے شاگرد ہیں مسند شافعی میں ایسی روایتیں بکثرت موجود ہیں جو امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے روایت کی ہیں مگر کتاب الام کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ۔ اس میں ان دونوں استاد شاگرد کے مناظرے اور مکالمے اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں کہ استاد شاگرد معلوم ہوتا ہے اور شاگرد استاد پس یا تو ربیع بن سلیمان قابل اعتماد نہیں جیسا بعض محدثین[1] کا خیال ہے یا بقول طلوع اسلام کتاب الام میں بھی جھوٹی حدیثیں داخل کر دی گئی ہیں ۔

---

[1] قال مسلمة كان (ای ربیع بن سلمان) یوسف بفضلة شدیدة وهو ثقة وروى ابو الحسین الرازی الحافظ عن علی بن ابی حسان الزیادی سمعت ابایزید القراطبی یوسف بن یزید یقول سماع الربیع بن سلمان من الشافعی لیس بالثبت وانما اخذ اكثر الكتب من ان البویطی بعد موت البویطی كذا فی التهذیب ص ۲۴۶ ج ۳

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو کچھ ہے وہ قرآن ہی کا بیان ہے اور اسی کی تشریح ہے

مدیر طلوع اسلام کو چیلنج

یہ تو الزامی جواب تھا۔ جس سے عہدہ برآ ہونا طلوع اسلام کیلئے آسان نہیں ہے۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس پر تو پوری امت کا اتفاق ہے کہ جو حدیث قرآن کے مخالف ہو۔ وہ ہرگز قابل قبول نہیں مگر اس کا فیصلہ کرنا فقہاء مجتہدین ہی کا کام ہے کہ کون سی حدیث مخالف قرآن ہے۔ یہ کسی پ ت ع کا منصب نہیں۔ جو نہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ حدیث کو اور سمجھنا تو دور رہا قرآن وحدیث کو صحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتے۔ ان لوگوں کی عقل کا اسی سے اندازہ کرلیا جائے کہ جو حدیثیں ایسے مضامین پر مشتمل ہوں۔ جن سے قرآن خاموش ہے وہ بھی ان کے نزدیک قرآن کے خلاف ہیں اور دلیل کیسی خوبصورت بیان کی گئی ہے کہ قرآن جس مسئلہ میں خاموش ہے، حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو اس کو بھی خاموش ہی رہنا چاہیے۔ ایسی جگہ حدیث کا زبان کھولنا ضرور قرآن کی مخالفت ہے اور مدیر طلوع اسلام اس دلیل پر حاشیہ چڑھاتا ہے سبحان اللہ ایدک اللہ بروح منہ (ص ۵۳ دسمبر ۱۹۵۲ء)

ان عقل کے دشمنوں سے کوئی پوچھے کہ قرآن تو اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا ہے نِسَاءُ كُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ اس نے کچھ نہیں بتلایا کہ یہاں حرف انی کیف کے معنی میں ہے یا مِنْ اَیْنَ کے۔ پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا۔ تمہاری بیبیاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیت کے ہیں۔ تو اپنے کھیت میں جس طرح چاہو آؤ۔ دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ۔ دوسری صورت میں بیوی سے پیچھے کی طرف سے بھی وطی کرنا جائز ہو جاتی ہے جیسا بعض علماء شیعہ کا خیال ہے تو کیا حدیث کو یہاں خاموش ہی رہنا چاہیے؟ اور اگر کسی حدیث میں اس کی تشریح کر دی گئی کہ یہاں انی بمعنی کیف ہے تو وہ خلاف قرآن ہوگی؟ اور کیا ادارہ طلوع اسلام اس مسئلہ میں شیعہ کی ہم نوائی پر آمادہ ہوگا؟

اسی طرح آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً میں قرآن خاموش ہے کہ یہاں استمتاع سے مراد وطی اور دخول ہے یا نکاح متعہ۔ دوسری صورت میں اس سے نکاح متعہ کا جواز نکلتا ہے۔ جیسا عام علماء شیعہ کا خیال ہے تو کیا طلوع اسلام کے نزدیک یہاں بھی حدیث کو خاموش ہی رہنا چاہیے؟ اور کیا وہ نکاح متعہ کو جائز قرار دیگا؟

اسی طرح آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اتنا کہہ کر خاموش ہے کہ آفتاب ڈھلنے سے لے کر رات کی اندھیری تک نماز پڑھتے رہو۔ کیا یہاں بھی حدیث کو خاموش رہنا چاہیے؟ اور کیا ادارۂ طلوع اسلام سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی اندھیری تک نماز پڑھتے رہنے اور دنیا کے سب کاروبار چھوڑ دینے کو فرض کہے گا؟ اور جن حدیثوں میں ظہر وعصر مغرب وعشا کے اوقات کی تحدید مذکور ہے۔ ان کو خلاف قرآن کہے گا؟

اسی طرح آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں قرآن یہ کہہ کر خاموش ہے کہ حیض گندی چیز ہے اس حالت میں تم بیبیوں سے الگ رہو۔ اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان کے پاس نہ جاؤ۔ جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حائضہ عورت سے بالکل الگ تھلگ رہنا چاہیے نہ اس کے ہاتھ کی روٹی کھائی جاوے نہ پانی پیا جاوے نہ اسے کسی چیز کو ہاتھ لگانے دیا جائے۔ جیسا یہود اور ہنود کا عمل ہے تو کیا یہاں بھی حدیث کو خاموش رہنا چاہیے؟ اور کیا ادارۂ طلوع اسلام حائضہ عورت سے وہی معاملہ کرے گا۔ جو یہود و ہنود کیا کرتے ہیں؟

اسی طرح آیت وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ تو اتنا کہہ کر خاموش ہے کہ پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور خبیث چیزیں حرام ہیں ان کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ طیبات کیا ہیں۔ خبائث کیا ہیں؟ اگر اس کو ہر قوم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو بعض قومیں تو کتے، بلی، سانپ، بندر، گدھے، خچر کو بھی طیبات میں شمار کرتی ہیں اور بے تکلف کھاتی ہیں۔ تو کیا حدیث کو بھی اس جگہ خاموش رہنا چاہیے؟ اور کیا ادارۂ طلوع اسلام کتے، بلی، گدھے، خچر اور سانپ اور بندر کو حلال قرار دیگا؟ اگر نہیں تو اس کا یہ

دعویٰ غلط ہے کہ قرآن جس مسئلہ میں خاموش ہے۔ وہاں حدیث کو بھی خاموش رہنا چاہیے اور ایسی جگہ حدیث کا زبان کھولنا قرآن کی مخالفت ہے۔

اس عقلمند سے کوئی پوچھے کہ اگر حدیث کا ایسے مسائل میں زبان کھولنا قرآن کی مخالفت ہے تو فقہ کا زبان کھولنا تو اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ پھر تو فقہ کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔ کیا فرماتے ہیں خضری مصری مصنف تاریخ الفقہ الاسلامی ایسی جماعت کے بارہ میں جو ان کی تاریخ الفقہ کے حوالہ سے اپنا الو اس طرح سیدھا کرنا چاہتی ہے کہ سرے سے فقہ ہی دنیا سے نیست و نابود ہو جائے۔ جس پر عالم اسلام کو فخر ہے اور دوسری قومیں بھی اس کی عظمت کے سامنے گردنیں جھکا دیتی ہیں اور علامہ خضری بھی اس کی عظمت وجلالت کے قائل ہیں۔

کوئی بوج بجھکڑ

ممکن ہے ادارہ طلوع اسلام کا کوئی بوج بجھکڑ یہ جواب دینے کی کوشش کرے کہ ان مسائل مذکورہ میں قرآن خاموش تو نہیں ہے۔ بالا جمال ناطق ہے اور اجمال کی تفسیر کے لئے حدیث کو زبان کھولنے کا حق ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی صحیح حدیثیں ہیں وہ قرآن کا بیان اور تشریح وتوضیح ہی ہیں۔ مگر اس کے سمجھنے کے لئے عقل سلیم کی ضرورت ہے۔ سلیم کے نام خطوط لکھ دینا کافی نہیں۔ قرآن صاف صاف کہہ رہا ہے، وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ o ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس بات کو کھول کر بیان کردیں۔ جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے اور تاکہ وہ خود بھی فکر سے کام لیں۔ پس حدیث رسول میں جو کچھ ہے۔ وہ قرآن ہی کا بیان اسی کی تشریح ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

قرآن کریم کے ارشادات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی نہیں سمجھ سکتا

اس لئے وہ حدیث ہمارے خلاف نہیں۔ جس میں بقول طلوع اسلام رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں ۔ جس کو قرآن نے حرام کیا ہے۔'' الخ

مگر قرآن کے ارشادات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہ صحابہ سمجھتے تھے نہ فقہاء مجتہدین تو ادارہ طلوع اسلام کس شمار میں ہے۔ اس لئے جن چیزوں کو حدیث میں حرام کیا گیا ہے اور تم کو قرآن میں ان کی حرمت نظر نہیں آتی ۔ یہ تمہاری نظر کا قصور ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر قرآن کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کی خیر منائے ۔ ایسا شخص قابل خطاب نہیں۔

﴿قال الشاطبی رحمه الله السنة راجعة فی معناها الی الکتاب فهی تفصیل مجمله و بیان مشکله و بسط مختصره و ذلک لانها بیان له وهو الذی دل علیه قوله تعالی و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیهم فلا تجد فی السنة امرا الا و القرآن قد دل علی معناه دلالة اجمالیة او تفصیلیة و ایضاً فکل مادل علی القرآن هو کلیة الشرح و ینبوع لها فهو دلیل علی ذلک الی ان قال فالسنة فی محصول الامر بیان لما فیه و ذلک معنی کونها راجعة الیه﴾ (مقدمہ فتح الملہم ص ۲۱)

شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنت اپنے معانی و مطالب میں کتاب اللہ کی طرف ہی رجوع کرتی ہے کیونکہ اس میں مجملات قرآن کی تفصیل اور مشکلات کا بیان اور مختصر کی توضیح ہے کیونکہ سنت قرآن کا بیان ہے اور یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیهم پس تم سنت میں جو بات بھی پاؤ گے قرآن نے اس کو اجمالاً یا تفصیلاً ضرور بتلایا ہے۔ پھر جن دلائل سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ قرآن میں شریعت کلی طور پر مذکور ہے اور وہ شریعت کا سرچشمہ ہے وہی اس پر بھی دلالت کرتی ہیں (کہ اس کلی کے لئے جزئیات بھی ہونی چاہئیں اور سرچشمہ

سے نہریں اور دریا بھی نکلنے چاہئیں۔ اسی کا نام سنت ہے، خلاصہ یہ کہ (حجیت) سنت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مفہوم قرآن کا بیان ہے یہی مطلب ہے قرآن کی طرف سنت کے راجع ہونے کا۔ اھ۔

طلوع اسلام کی ایک اور جہالت

آگے چل کر طلوع اسلام نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ فقہ حنفی ابدالآباد تک کیلئے ناقابل تغیر نہیں تھا۔ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ ''جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جاسکتے وہ کبھی خود اپنے فیصلوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھا جائے؟''

اس کے جواب میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے غیر متبدل نہیں یا ان کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ طلوع اسلام نے یہ نتیجہ ان مہمل روایات سے نکالا ہے جن میں امام صاحب کی طرف بعض احادیث کا رد کر دینا منقول ہے۔ ہم نے ان روایات پر مفصل کلام کر کے بتلا دیا ہے کہ ان کی سندوں میں مجہولین۔ مجروحین کذابین بھرے ہوئے ہیں اور جن احادیث پر امام صاحب نے عمل نہیں کیا وہاں ان سے زیادہ قوی حدیث یا قرآن کے عموم اور ظاہر پر عمل کیا ہے۔ اس کو رد حدیث پر محمول کرنا جہالت ہے بلکہ اس کی حقیقت دو دلیلوں میں سے اقوی کو ترجیح دینا ہے۔

اس کے بعد طلوع، اسلام نے اسی تاریخ خطیب سے بعض روایات نقل کر دی ہیں۔ جس پر بہت تفصیل کے ساتھ ہم کلام کر چکے ہیں کہ اس میں امام صاحب کے جس قدر معائب بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی کوئی سند بھی عیب سے خالی نہیں۔ چنانچہ یہاں بھی نضر بن محمد مروزی سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک شامی امام ابوحنیفہ سے فقہ پڑھ کر اپنے وطن کو واپس جانے لگا۔ تو اس سے کہا تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔''

اس کی سند میں حاجب بن احمد طوسی ہے۔ جس کے متعلق حاکم نے لکھا ہے کہ

اس نے کبھی کوئی حدیث نہیں سنی ۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی علماء کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔ اور اگر روایت کو مان لیا جائے تو نضر بن محمد یا امام صاحب نے اہل شام کی مذمت کے طور پر یہ فرمایا ہوگا کہ تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ کیونکہ اہل شام فقہ حنفی کو اس وقت شر سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ سراسر خیر ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جس فقہ کو تم خیر سمجھ کر لے جا رہے ہو۔ تمہارے ملک والے اس کو خیر نہیں سمجھتے ۔ کیونکہ محدث شام اوزاعیؒ اس وقت تک امام صاحب سے منحرف تھے۔ پھر آخر میں حج کے موقعہ پر امام صاحب سے ملے تو ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔

تاریخ خطیب میں اضافہ کرنے والے اصل مقصود کو تو سمجھے نہیں اس روایت کو بھی امام صاحب کے عیوب میں لکھ مارا۔ طلوع اسلام کو تو ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا چاہیے اس نے اس سے اپنا الو سیدھا کر لیا کہ امام ابوحنیفہ جب اپنی فقہ کو سب سے بڑی شر فرما رہے ہیں۔ وہ اس کو غیر متبدل کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس عقلمند سے کوئی پوچھے کہ متبدل یا غیر متبدل ہونے کا سوال تو الگ رہا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب امام صاحب اپنی فقہ کو سب سے بڑی شر سمجھتے تھے تو ساری عمر اس میں کیسے مشغول رہے؟ اور امت بھی بے وقوف ہی تھی کہ سب سے بڑی شر میں درجہ اعلیٰ حاصل کرنے پر انہیں امام اعظم کا لقب دے دیا۔ یہ حال ہے منکرین حدیث کی عقل کا بس یوں ہی یہ لوگ قرآن کو بھی سمجھتے ہوں گے کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ''۔

اس کے بعد مزاحم میں زفر سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے اپنے فتاویٰ کی نسبت فرمایا بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ پھر امام زفر سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے ابو یوسف سے فرمایا۔ تیرا ناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے۔ اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر کیونکہ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں اور کل میری کچھ رائے ہوتی ہے اور پرسوں میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

نیز ابونعیم سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو

کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب؟ ان سب روایات کی سندوں میں ابن رزق۔ ابن سلم موجود ہیں جن پر بار بار جرح گزر چکی ہے۔ نیز ابراہیم جوہری بھی سندوں میں دہرا ہوا ہے۔ جس پر حافظ حجاج شاعر نے جرح کی ہے کہ یہ شخص حدیث بیان کرتے ہوئے سو جاتا تھا اور لوگ لقمہ دیتے اور یہ اسی حالت میں لقمہ لیتا تھا۔

صحیح روایت وہ ہے جو حافظ ابن ابی العوام نے امام طحاوی کے حوالہ سے محمد بن عبداللہ عینی سے سلیمان بن عمران سے اسد بن الفرات سے اسد بن عمرو سے بیان کی ہے کہ ہم لوگ امام صاحب کے سامنے مسائل میں اپنے اپنے مختلف جوابات بیان کرتے تھے امام صاحب سب کو سن کر اپنا جواب بیان کرتے جو سب پر حاوی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ ایک مسئلہ میں تین دن تک بحث ہوتی رہتی۔ اس کے بعد اس کو دفتر میں لکھا جاتا تھا۔ اسی سند سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ امام صاحب کے جن اصحاب نے امام صاحبؒ کے مسائل کتابوں میں جمع کئے ہیں۔ وہ چالیس حضرات تھے۔'' حافظ صمیری (شیخ الخطیب) نے اپنی سند سے اسحٰق بن ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے اصحاب ایک ایک مسئلہ میں ان کے ساتھ غور وخوض کرتے تھے۔ اگر عافیۃ (القاضی) کسی دن مجلس میں حاضر نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے کہ ابھی اس مسئلہ (کی بحث) کو ختم نہ کرو جب تک عافیہ نہ آ جائے۔ جب وہ حاضر ہوتے اور سب کی موافقت کرتے اس وقت امام صاحب اس مسئلہ کو مع جواب کے دفتر میں لکھنے کا حکم دیتے ورنہ منع کر دیتے''۔ اس طرح فقہ حنفی کے مسائل مدون ہوئے ہیں کہ جب تک ہر مسئلہ پر ہر پہلو سے پوری طرح بحث وگفتگو ختم نہ ہو جاتی اس وقت تک اس کو کتاب میں درج نہیں کیا جاتا تھا۔ ممکن ہے امام ابو یوسف نے کسی مسئلہ میں تنہا امام صاحب کا جواب سن کر اسے نوٹ کر لیا ہو۔ اور امام صاحب نے منع کر دیا ہو کہ جب تک جملہ فقہاء و محدثین واراکین مجلس اس مسئلہ پر ہر پہلو سے گفتگو نہ کر لیں اس وقت تک دفتر فقہ میں کوئی مسئلہ درج نہ کرو۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جس امام نے اس طرح بڑے بڑے محدثین وفقہا ومجتہدین اور ماہرین عربیت کے مشورہ سے قرآن وحدیث کے مسائل کو منضبط کیا ہو اس کی فقہ قیامت تک کے لئے امت مسلمہ کا دستور العمل بننے کے قابل ہے یا جوپ ت ع

تنہا اپنی عقل سے قرآن کے مطالب بیان کریں وہ قیامت تک کے لئے امت کا دستور العمل بن سکتے ہیں؟ جن کی حالت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کوصحیح طور سے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ سمجھنا تو درکناران علقمندوں سے کوئی پوچھے کہ قرآن کے غیر متبدل ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ جو کچھ تم اس کا مطلب بیان کرتے ہو وہ بھی غیر متبدل ہے؟ امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ حدیث رسول قرآن کا بیان ہے۔ اس لئے قرآن کے وہی معانی ومطالب صحیح ہیں جو حدیث کی روشنی میں بیان کئے جائیں۔ اور فقہاء ومجتہدین کا قیاس قرآن وحدیث کے معانی و مطالب کا مظہر ہے۔ خود کسی معنی ومطلب کا مثبت نہیں۔ اس لئے فقہاء ومجتہدین کے اقوال سے قرآن وحدیث ہی کے مطالب ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی خارجی حکم کا اثبات نہیں ہوتا۔ تو جب قرآن قیامت تک کے لئے دستور العمل ہے۔ حدیث وفقہ بھی قیامت تک کے لئے دستور العمل ہیں کیونکہ یہ اسی کا بیان اور تشریح ہیں۔

﴿قال ابن عبدالبر فی مباحث السنة ان ذلک المعبر فی السنة هو المراد فی الکتاب فکان السنة بمنزلة التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب و دل علی ذلک قوله تعالی لتبین للناس مانزل الیهم فاذ احصل بیان قوله تعالی والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما بان القطع من الکوع و ان المسروق نصاب فاکثر من حرز مثله فذلک هو المراد من الآیة. لا ان تقول ان السنة اثبت هذه الاحکام دون الکتاب. کما اذا بین لنا مالک و غیره من المفسرین معنی آیة او حدیث فعملنا بمقضاه فلا یصح لنا ان نقول انا عملنا بقول فلان دون ان نقول عملنا بقول الله او قول رسوله علیه الصلاة والسلام وهکذا سائر مابینتهُ السنة من کتاب الله تعالیٰ فمعنی کون السنة قاضیة علی الکتاب انها بینة له

فلایوقف مع اجماله واحتماله وقد بینت المقصود منه لا انها مقدمة علیه .ا ھ ٭

(من فتح الملهم جلد ا ص ۲۱)

''علامہ حافظ ابن عبدالبر نے سنت کے باب میں فرمایا ہے کہ جو کچھ سنت میں بیان کیا گیا ہے کتاب اللہ کی مراد کا بیان ہے۔ سنت کتاب اللہ کے معانی کی تفسیر اور شرح ہے جس پر حق تعالیٰ کا ارشاد لتبین للناس مانزل الیھم دلالت کر رہا ہے۔ مثلاً جب حدیث نے بیان کر دیا کہ آیت والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما (چوری کرنے والے مرد وعورت کا ہاتھ کاٹ دو) سے مراد پہنچے کے گٹے سے ہاتھ کاٹنا ہے جبکہ مقدار نصاب کی چوری کی گئی ہو (یعنی ربع دینار یا ایک دینار) اور محفوظ مال کی چوری کی گئی ہو، تو کہا جائے گا کہ آیت کی مراد یہی ہے۔ جو حدیث میں مذکور ہے۔ یہ نہ کہا جائیگا کہ یہ احکام حدیث نے ثابت کئے ہیں قرآن نے ثابت نہیں کئے۔ جیسے امام مالک یا اور کوئی مجتہد ہمارے سامنے کسی آیت یا حدیث کا مطلب بیان کرے اور ہم اس کے موافق عمل کریں تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہم نے فلاں کے قول پر عمل کیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم نے اللہ ورسول کے ارشاد پر (فلاں مجتہد کی تفسیر کی روشنی میں) عمل کیا ہے۔ اسی طرح ان تمام احکام کو سمجھو جو حدیث نے احکام کتاب اللہ کے متعلق بیان کئے ہیں۔ پس یہ جو کہا گیا ہے کہ سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت کتاب اللہ کے مقصود کو بیان کرتی ہے۔ لہٰذا قرآن کے اجمال واحتمال پر ٹھہر جانا جائز نہیں

جبکہ سنت نے اس کا مقصود واضح کر دیا ہے۔ اس قول کا یہ مطلب ہر
گز نہیں کہ سنت کتاب اللہ سے مقدم ہے اھ۔

یہی تمام اہل مذاہب کا مسلک ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ واحمد بن حنبلؒ کا اتباع نہیں کرتے بلکہ ان کی تفسیر کی روشنی میں کتاب اللہ اور سنت رسول کا اتباع کرتے ہیں اور جب کتاب اللہ نا قابل تبدیل ہے تو اس کے وہ معانی و مطالب بھی جو حدیث نے بیان کئے ہیں فقہاء امت نے قرآن و حدیث سے سمجھ کر بیان کئے ہیں۔ نا قابل تبدیل ہیں۔ مگر چونکہ مجتہد معصوم نہیں اس لئے وہ قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کرنے کے بعد یہی کہے گا کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ ہماری فہم کے مطابق ہے۔ جو بہتر سے بہتر ہم نے سمجھا ہے اگر کوئی ہمارے قول سے بہتر قرآن و حدیث کا مطلب بیان کر سکے وہی صحت کے زیادہ قریب ہوگا۔ اس میں طلوع اسلام کے لئے کوئی حجت نہیں کیونکہ وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قرآن کا مطلب بیان کرنے میں وہ خطا سے معصوم ہے۔ قرآن کی عبارت والفاظ تو یقیناً محفوظ ہیں۔ مگر اس کا جو مطلب ادارۂ طلوع اسلام اپنی طرف سے بیان کرتا ہے اس کے محفوظ اور معصوم ہونے کی کیا دلیل ہے۔

پس اگر خطا سے معصوم نہ ہونا فقہ کو قابل تبدیل قرار دے سکتا ہے۔ تو وہ معانی و مطالب بھی قابل تبدیل ہیں۔ جو ادارۂ طلوع اسلام قرآن کی شرح میں بیان کرتا ہے۔ ورنہ وہ فرق بتلایئے کہ اس کے بیان کردہ معانی و مطالب کو حدیث وفقہ کے بیان کردہ معانی و مطالب پر کیا ترجیح ہے اور کیوں؟ جماعت منکرین حدیث نے بس ایک لفظ یاد کرلیا ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر غیر متبدل صرف قرآن ہے۔ مگر ان عقلمندوں نے یہ نہیں سمجھا کہ قرآن کے غیر متبدل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب بھی غیر متبدل ہیں۔ اب اس کا فیصلہ کرنا رہ گیا کہ قرآن

کے معانی ومطالب وہ صحیح ہیں۔ جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور فقہ میں فقہاء امت نے بیان کئے ہیں یا وہ صحیح ہیں جو پرویز اور تمنا عنادی محض ہٹ دھرمی سے بے پر کی اڑاتے ہیں؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ طلوع اسلام جس مسلک کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ وہ نہ حضرات صحابہ کا مسلک ہے نہ اجلہ تابعین کا نہ امام ابوحنیفہ کا۔ بلکہ خوارج کا مسلک ہے۔جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد شروع مقالہ میں بیان کر چکا ہوں ان ادرکتھم لا قتلنھم قتل عاد و ثمود کہ اگر میں ان کو پاؤں تو قوم عاد وثمود کی طرح نیست ونابود کر کے رکھ دوں۔

حوائج بشریہ اور تعلیم نبوت

حوائج بشریہ اور تعلیم نبوت

زندگی کی ضروریات سے جن کو حوائج بشریہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے تقریباً ہر شخص واقف ہے اور ان کے پورا کرنے کے لئے ہر انسان کا ایک خاص طرز عمل ہے خواہ وہ اس نے اپنی طبیعت سے ایجاد کیا ہو یا کسی حکیم و ڈاکٹر سے پوچھ کر اختیار کیا ہو یا کسی آسمانی و غیر آسمانی کتاب سے اس نے سمجھا ہو یا اپنے ملک و رواج کے دستور العمل سے اخذ کیا ہو کھانا پینا سونا جاگنا، شادی و غمی، تکلم و سکوت یہ وہ ضروریات ہیں جن سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں اور ان کی تھوڑی بہت ضرورت ہر انسان کا حق ہوتی ہے اس وقت ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروریات زندگی کے پورا کرنے میں جس طرز عمل کو اختیار فرمایا اور اس کے اتباع کو اپنی امت کے لئے سنت قرار دیا وہ کس درجہ کامل و مکمل دستور العمل ہے جس میں ثواب آخرت و رضاء الٰہی کا بھرپور خزانہ موجود ہونے کے علاوہ انسان کی دنیوی مصالح اور حفظ صحت وغیرہ کی بھی اس درجہ رعایت کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں پھر ہر کام میں افراط و تفریط کے دونوں مضر پہلوؤں سے بچا کر ایسا معتدل طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہے جس پر نظر کرتے ہوئے ہر منصف کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ درحقیقت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل اور سید البشر اور تمام عالم سے عقل و حکمت میں ممتاز ہیں چنانچہ حوائج بشریہ یا ضروریات زندگی کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جن میں قلت اور کمی کا پہلو اختیار کرنا افضل ہے دوسری وہ جن میں کثرت اور زیادت قابل مدح ہوتی ہے۔ تیسرے وہ جن میں اختلاف ہے کہ کسی کے نزدیک ان میں قلت اور کمی افضل ہے اور کسی کے نزدیک کثرت و زیادت۔

اب ہم ان تینوں قسموں کے متعلق یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ضرورت بشری میں ہمیشہ افضل جانب ہی کو اختیار فرمایا ہے اور آپ کا طرز عمل ہر صورت میں وہی رہا ہے جو عقلاً درجہ کمال سمجھا جاتا ہے چنانچہ کھانا پینا اور سونا یہ

وہ ضروریات ہیں جن میں قلت اور کمی کو اختیار کرنا تمام عقلاء، وحکماء عرب وعجم کے نزدیک بالاتفاق افضل ہے اور ان کی زیادتی کو عقلاً ونقلاً وعادۃً برا اور مذموم سمجھا جاتا ہے ہر زمانہ میں عقلاء، اور حکماء کھانے پینے اور سونے کی قلت کو اپنے لئے مایہ ناز اور سبب افتخار سمجھتے آئے اور ان کی کثرت کو ہمیشہ بری نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں کیونکہ کھانے پینے کی کثرت غلبہ حرص کی دلیل ہے نیز اس سے شہوت بہیمیہ بھی بہت بڑھ جاتی ہے اور غلبہ حرص اور غلبہ شہوت یہ دو چیزیں ہی دینی اور دنیوی بہت سی مضرتوں کا سبب ہوا کرتی ہیں نیز کھانے پینے کی کثرت سے جسم انسانی بہت سی بیماریوں کا گھر ہو جاتا ہے اور اس سے طبیعت میں گرانی پیدا ہوتی اور دماغ رطوبات سے بھر جاتا ہے اور کھانے پینے میں کمی کرنا اس کی علامت ہے کہ یہ شخص اپنے نفس پر قابو یافتہ اور قناعت کے جوہر سے ممتاز ہے نیز ان میں کمی کرنے سے شہوت بہیمیہ کا بھی زیادہ غلبہ نہیں ہوتا اور صحت وتندرستی بھی اچھی رہتی ہے طبیعت ہلکی پھلکی اور دل ودماغ میں نشاط وسرور رہتا ہے اور قوت فکریہ میں بہت تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زیادہ سونا نفس کی سستی اور کمزوری کی علامت اور ذکاوت ذہن اور طبیعت کی تیزی کے زائل ہونے کا سبب ہے نیز زیادہ سونے سے کسل بڑھ جاتا اور بلند حوصلگی کم ہو جاتی اور عمر عزیز بے فائدہ رائیگاں جاتی ہے اور دل کی قساوت وغفلت زیادہ ہو کر گویا وہ بالکل مردہ ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جن کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ بداھت اور مشاہدہ خود اس کے لئے کافی دلیل ہے نیز حکماء سابقین کے اقوال اور صحیح احادیث اور حضرات صحابہ وتابعین کے آثار اور حکماء عرب کے اشعار وغیرہ ان کی مذمت ومضرت میں تواتر کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں اور جس شخص نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مقدسہ کو ایک نظر سے بھی دیکھا ہے وہ اس کا کبھی انکار نہیں کرسکتا کہ آپ نے کھانے اور پینے اور سونے میں ہمیشہ قلت اور کمی کو اختیار فرمایا ہے۔ غذا او نند میں آپ اس درجہ کمی کرتے تھے کہ اس سے زیادہ کمی جائز ہی نہیں کیونکہ حفظ صحت اور قوت علی الطاعت کے لئے جس قدر غذاء اور نیند کی عادۃً ضرورت ہے اس کا اختیار کرنا تو ہر شخص پر واجب ہے ان دونوں میں اتنی کمی کرنا جس سے صحت پر

برا اثر پڑنے یا طاعات میں بہت کمزوری ہونے لگے شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیر ہو کر کبھی اپنا پیٹ نہیں بھرا۔ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن پے در پے گیہوں کی روٹی سیر ہو کر کبھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے اور قاضی عیاض نے اپنی سند متصل کے ساتھ حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ماملأ ابن آدم وعاءً شرا من بطنہ حسب ابن آدم اکلات یقمن صلبہ فان کان لامحالۃَ فثلث لطعامہ وثلث لشرابہٖ وثلث لنفسہ اھ۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیٹ سے برا کوئی برتن بھی انسان نہیں بھرتا آدمی کے لئے چند لقمے (کھا لینا) کافی ہیں جو اس کی پشت کو سیدھا کر دیں اور اگر وہ لامحالہ زیادہ ہی کھانا چاہے تو ایک تہائی کھانے کے لئے اور ایک تہائی پانی کے لئے اور ایک تہائی سانس کے لئے رکھنا چاہیے (اس سے زیادہ نہ کھانا چاہیے کیونکہ اتنی مقدار صحت بدن کی حفاظت اور اعتدال مزاج کے لئے کافی ہے اتنی خوراک کھانے والا علاج ومعالجہ کا بہت کم محتاج ہوگا اور اس کی طبیعت میں صفائی اور رقت ہوگی اور شہوت پر قابو یافتہ ہوگا اس میں غفلت اور قساوت نام کو نہ رہے گی عبادات وطاعات پر مداومت واستقامت اس کے لئے آسان ہو جائے گی۔

ناظرین یہ ہے وہ پاکیزہ تعلیم جو سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے حوائج بشریہ کے متعلق اپنی امت کو فرمائی ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی مصالح کا پوری طرح لحاظ کیا گیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غلام کو خریدنے کا ارادہ فرماتے تو اس کے سامنے کچھ چھوارے اور کھجور لا کر رکھ دیا کرتے تھے اگر وہ زیادہ کھانے والا ہوتا تو آپ صحابہ سے فرما دیتے کہ اس کو واپس کر دو کیونکہ زیادہ کھانا بھی ایک قسم کی نحوست ہے اور زیادہ کھانے پینے ہی سے نیند بھی زیادہ آتی ہے اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شب بیداری (کی نعمت) کم کھانے ہی سے نصیب ہوتی ہے جو لوگ پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں ان کو راتوں کو جاگنے کی

ہوس نہ کرنا چاہیے ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عنترہ شاعر کا یہ شعر پڑھا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ حتی انال بہ کریم المأکل

(ترجمہ) میں راتوں کو بھوکا رہتا ہوں اور عرصہ تک بھوکا رہتا ہوں تاکہ اس کے ذریعے سے عزت کی غذا حاصل کروں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس کے مصداق سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عزت کی غذا سے آپ نے جنت کی طرف اشارہ فرمایا اور سچ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لفظ کو جس معنی پر محمول کیا ہے وہ بہت ہی عجیب و غریب محمل ہے اگرچہ خود شاعر کو بھی نہ سوجھا ہو اور سلف صالحین میں سے بعض کا ارشاد ہے لا تاکلوا کثیرا فتشربوا کثیرا فترقدوا کثیرا فتخسروا کثیرا زیادہ نہ کھاؤ پھر اس پر پانی زیادہ پیو گے اور اس سے نیند زیادہ آئے گی اور زیادہ سونے سے نقصان بہت اٹھاؤ گے۔ کیونکہ اس سے عمر گرانمایہ بیفائدہ ضائع ہوتی ہے نیز اطباء کی تحقیق ہے کہ زیادہ سونے سے عمر بھی گھٹ جاتی ہے۔ وقد روی عنہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ کان احب الطعام الیہ ما کان علی ضففٍ ای کثرۃ الایدی اھ۔ ابویعلی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کھانا بہت محبوب تھا جس پر بہت سے ہاتھ پڑتے ہوں۔ یعنی آپ تنہا کھانے کو پسند نہ فرماتے تھے بلکہ مجمع کے ساتھ کھانا آپ کو محبوب تھا کیونکہ اس میں علاوہ امید برکت کے کرم و سخاوت اور ہمدردی و مواسات کی بھی شان پائی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں سے کسی خاص کھانے کی درخواست فرماتے اور نہ کسی خاص غذا کی طرف رغبت و خواہش ظاہر فرماتے تھے جو کچھ گھر والوں نے کھلا دیا وہ کھا لیا اور جو انہوں نے پیش کر دیا اسے قبول فرما لیا اور جو پلا دیا وہ پی لیا۔

اس پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ حدیث ابوہریرہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار آپ گھر میں تشریف لے گئے اور آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

میں نے ایک ہانڈی میں گوشت پکتا ہوا دیکھا تھا کیا میرا یہ خیال صحیح نہیں (مطلب یہ تھا کہ میرے سامنے وہ گوشت کیوں نہیں لایا گیا) تو اس سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے گوشت کی طرف رغبت ظاہر فرمائی اور یہ بات پہلی حدیث کے خلاف ہے۔

جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر والوں کی عادت معلوم تھی کہ وہ کسی عمدہ اور لذیذ کو میرے بغیر نہیں کھا سکتے تو پھر آج میرے سامنے جو یہ گوشت نہیں لایا گیا تو شاید وہ اس کو میرے لئے حلال نہیں سمجھتے اس لئے آپ نے حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے گوشت کا تذکرہ فرمایا تا کہ اگر مسئلہ شرعی میں ان سے کچھ غلطی ہوئی ہو تو اس پر ان کو متنبہ کر دیا جائے چنانچہ واقعہ یہی تھا کہ وہ گوشت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ باندی حضرت بریرہ کو کسی نے بطور صدقہ کے دیا تھا اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کی چیز نہ کھاتے تھے کیونکہ وہ آپ کے لئے حلال نہ تھا اس لئے گھر والوں نے وہ گوشت آپ کے سامنے اس خیال سے پیش نہ کیا کہ شاید یہ حضور کے لئے حلال نہ ہو۔ جب آپ کے دریافت فرمانے پر انہوں نے یہ واقعہ حضور سے عرض کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ تو بریرہ کے حق میں تھا اور اب اگر وہ ہمارے سامنے (بہ نیت ہدیہ) پیش کریں تو وہ ہدیہ ہوگا صدقہ نہ ہوگا پس آپ کو گوشت کی طرف رغبت ظاہر کرنا مقصود نہ تھا بلکہ اپنے گھر والوں کو یہ مسئلہ بتلانا مدنظر تھا کہ تبدل ملک سے بعض احکام بدل جاتے ہیں اور یہ علم فقہ کا اتنا بڑا قاعدہ ہے جس سے ائمہ مجتہدین نے صدہا مسائل مستنبط فرمائے ہیں۔

اور حکمت لقمان میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے صاحبزادے کو یہ نصیحت فرمائی کہ اے میرے پیارے بیٹے جب معدہ بھر جاتا ہے تو قوۃ فکریہ سو جاتی ہے اور حکمت (یعنی عقل) گونگی ہو جاتی اور اعضاء انسانی (سست ہوکر) عبادت سے بیٹھ جاتے ہیں اور صحیح حدیث میں جس کو امام بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا اور ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد بھی مذکورہ ہے کہ میں تو (خدائے تعالیٰ کا) غلام ہوں غلاموں ہی کی طرح کھاتا ہوں اور غلاموں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں اور غلاموں ہی کی طرح پانی پیتا ہوں اور کھانے کے وقت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنے کھڑے کر کے بیٹھا کرتے تھے اور تجربہ ہے کہ اس صورت میں کھانا کم کھایا جاتا ہے اور جس طرح آپ غذا میں تقلیل فرماتے تھے اس طرح سونے میں بھی بہت کمی کرتے تھے اور رات کا زیادہ حصہ یاد خدا اور نماز و تلاوت قرآن میں گزارتے تھے چنانچہ آثار صحیحہ اس پر بکثرت شاہد ہیں۔ نیز قرآن میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ اللَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ط﴾ (سورۂ مزمل پارہ ۲۹)

آپ کے پروردگار کو خوب معلوم ہے کہ آپ دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور آپ کے ساتھ والوں میں سے ایک جماعت بھی (ایسا ہی کرتی ہے) پھر بااین ہمہ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے **ان عینی تنامان و لا ینام قلبی** کہ (نیند میں) میری آنکھیں ہی سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا اس سے معلوم ہوا کہ آپ سوتے ہوئے بھی یاد خدا سے غافل نہ ہوتے تھے آپ کا مبارک دل اس وقت بھی خدا کی طرف متوجہ رہتا تھا اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت داہنی کروٹ پر لیٹا کرتے تھے کیونکہ اس صورت میں دل کو قرار وسکون حاصل نہیں ہوتا وہ معلق ہونے کی وجہ سے بے چین رہتا ہے تو نیند سے جلد افاقہ ہو جاتا ہے اور بائیں پہلو پہ لیٹنے سے چونکہ دل کو قرار وسکون رہتا ہے اس لئے سونے والے کو راحت زیادہ ملتی اور نیند گہری آتی ہے اسی وجہ سے اطباء نے بائیں کروٹ پر لیٹنے کو مفید بتلایا ہے مگر علامہ ابن القیمؒ نے ثابت کیا ہے کہ طبی اصول سے بھی دائیں کروٹ ہی پر لیٹنا مفید ہے کیونکہ اس صورت میں قلب اونچا رہتا ہے تو اس کی طرف بدن کے بخارات کم پہنچتے ہیں اور خون کا سیلان بھی اس کی طرف نہیں ہوتا اور بائیں کروٹ پر لیٹنے سے قلب کی طرف خون کا سیلان زیادہ ہوتا اور بدن کے بخارات بھی زیادہ پہنچتے ہیں جس سے قلب کمزور ہو جاتا ہے۔

ناظرین کرام اس وقت میں نے بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کھانے پینے اور سونے کے متعلق بیان کر دیا ہے

جس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان امور میں بہت قلت اور کمی فرماتے تھے اور ان میں کمی کرنا ہی باتفاق عقل ونقل بہتر اور افضل ہے لیکن اتنی گزارش اخیر میں ضروری ہے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی قوت کا اندازہ ضرور کر لیا جائے ایسا نہ ہو کہ آپ ان میں اتنی کمی کر دیں جو صحت اور قوت کے لئے ضرر رساں ثابت ہو کہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اگر توفیق الٰہی نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ بقیہ حوائج بشریہ کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

والسلام

حوائج ضروریہ اور تعلیم نبوت

نکاح

ناظرین کو النور کے گزشتہ نمبر میں معلوم ہو چکا ہے کہ حوائج بشریہ اور ضروریات زندگی کی تین قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم کا بیان پہلے گزر چکا ہے جس میں عقلاً ونقلاً قلت اور کمی اختیار کرنا موجب مدح ہے آج ہم دوسری قسم کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جس میں کثرت اور زیادت باعث مدح اور سرمایہ ناز شمار کی جاتی ہے۔ جیسے قوت نکاح اور عزت وجاہ یہ دونوں ایسے اوصاف ہیں کہ یہ کسی شخص میں جس قدر زیادہ اور کمال کے ساتھ پائے جائیں اسی قدر اس کی تعریف کی جاتی اور مدح وثناء سے داد دیجاتی ہے چنانچہ قوت نکاح کی زیادت کا محمود ہونا تو شرعاً وعادۃً تسلیم شدہ ہے انبیاء سابقین کی تمام شریعتیں اور عقلاء وحکماء کے اقوال اس کی مدح میں متفق نظر آتے ہیں کیونکہ قوت نکاح کامل ہونا کس کی دلیل ہے کہ یہ شخص قوی المزاج ہے اور مردانگی کا جوہر بدرجہ اتم اس کو حاصل ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ قوت مردانگی ہی اکثر اخلاق حمیدہ کی جڑ اور بلند حوصلگی کی بنیاد ہے۔ شجاعت اور بہادری، جرات اور دلیری، سخاوت اور اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور سیر چشمی یہ تمام صفات قوت مردانگی ہی سے پیدا ہوتی ہیں عنین اور نامرد کو ان خصلتوں کی ہوا بھی نہیں لگتی اسی لئے نامردی ایک ایسا عیب ہے جس کو ہر شخص نفرت کی

نگاہ سے دیکھتا اور اس سے پناہ مانگتا ہے اور بعض لوگوں نے تو اس عیب کی ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے حرام موت مر جانے کو بے لطف زندگی پر ترجیح دیکر خودکشی بھی کرلی ہے اور جس قدر یہ عیب ایک سنگین اور ناقابل برداشت عیب ہے۔ یوں ہی قوت مردانگی ایک بہت بڑا مایہ فخر اور اعلیٰ ترین جوہر ہے پھر جس طرح تمام اخلاق حمیدہ ہر شخص میں مختلف طور پر پائے جاتے ہیں کہ کسی میں کوئی خصلت بدرجۂ کمال ہے کسی میں بدرجہ متوسط کسی میں بدرجہ ادنیٰ اسی طرح قوت مردانگی میں بھی لوگوں کے مختلف درجے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس طرح کامل بہادر وہ شخص ہے جس سے زیادہ بہادر کوئی نہ ہو کامل سخی وہ ہے جس سے زیادہ سخی کوئی نہ ہو اسی طرح کامل مرد وہ ہے جس سے زیادہ قوت مردانگی کسی میں نہ ہو اور چونکہ یہ قوت تمام اعلیٰ خصلتوں کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کامل درجہ میں پایا جانا ہر شخص کو محبوب و مطلوب ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ہر زمانہ میں کثرت نکاح پر لوگ فخر کرتے اور اپنے اکابر کی مدح میں اس وصف کو پیش کرتے رہے ہیں جس کا انکار بجز ہٹ دھرم نامنصف آدمی کے کوئی نہیں کرسکتا اور شرعی نقطہ نظر سے بھی کثرت نکاح باعث افتخار و موجب مدح ہے اور اس کے متعلق بکثرت آثار و احادیث منقول ہیں چنانچہ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے افضل ہذہ الامۃ اکثرہا نساء کہ اس امت میں سب سے افضل و اکمل وہ ذات ہے جس کی بیبیاں سب سے زیادہ ہیں یعنی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ آپ نے گیارہ عورتوں سے نکاح کیا ہے جن میں سے حضرت خدیجہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا انتقال آپ کے سامنے ہی ہوگیا تھا باقی نو بیبیاں آپ کے بعد تک زندہ رہیں اور اتنے نکاحوں کی اجازت اس امت میں حضور صلی اللہ علیہ کے سوا کسی کو نہیں ہوئی نیز ابن مردویہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعا روایت کی ہے تناکحوا فانی مباہ بکم الامم یوم القیامۃ و فی لفظ الطبرانی فی الاوسط تزوجوا الولود فانی مکاثر بکم الامم و فی روایۃ ابی داؤد و النسائی و ابن ماجۃ فانا مکاثر بکم الامم سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کیا کرو کیونکہ میں قیامت میں تمہارے ساتھ فخر کروں گا اور طبرانی کی

روایت میں ہے کہ زیادہ بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کیا کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت پر دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کرونگا اور شیخینؒ نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبتل سے منع فرمایا ہے جس کے معنی عورتوں سے علیحدگی اختیار کرنا اور نکاح سے پرہیز کرنا ہے کیونکہ یہ طریقہ راہبوں کا ہے اور نصاری کی شریعت میں اس کی بہت فضیلت بیان کی جاتی ہے مگر شریعت اسلامیہ نے اس سے منع کیا ہے لارہبانیۃ فی الاسلام اسلام میں رہبانیت کا طریقہ نہیں ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قوت مردانگی انسان کا اعلیٰ ترین جوہر ہے جو فطرۃً اس میں ودیعت رکھا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جس قوت سے کام نہیں لیا جاتا وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوکر زائل ہو جاتی یا زوال کے قریب ہو جاتی ہے پس یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ انسان ایسے اعلیٰ جوہر کو جس سے بیشمار عمدہ خصلتیں اس میں پیدا ہوتی ہیں برباد کر کے اپنی فطرت میں نقصان وعیب کو جگہ دے کیونکہ اس قوت کے کمزور ہو جانے کا اثر دوسرے اخلاق پر بھی ضرور پڑتا ہے بہادری اور بلند حوصلگی اسی قوت پر موقوف ہے۔ دوسرا بقاء عالم کیلئے بھی اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے پس شریعت اسلامیہ نے اس جوہر کے برباد کرنے کو پسند نہیں کیا، علاوہ ازیں نکاح میں دینی اور دنیوی بہت سے منافع ہیں جو اس کے بدون حاصل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً مرد وعورت کی شہوت نفسانی کو سکون حاصل ہونا اور نگاہ وقلب کا عفیف ہو جانا یہ باتیں بدون نکاح کے بہت کم حاصل ہوتی ہیں یہ ممکن ہے کہ کوئی مرد مجاہدات و ریاضات سے اپنی خواہش پر قابو یافتہ ہو جائے لیکن اس میں جس قدر دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر یہ حالت گزری ہے بالخصوص نکاح نہ کرنے سے عورتوں کی زندگی پر جو برا اثر پڑتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں جن لوگوں میں نکاح نہ کرنے یا کم کرنے کا رواج ہے ان کی عورتیں عفیف و پاکدامن بہت کم ہوتی ہیں آئے دن ایسے عفت سوز واقعات پیش آتے ہیں جن کے سننے سے کلیجہ کانپ اٹھتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ بے حیائی اور فحاشی انسان کے دین و دنیا دونوں کیلئے سخت تباہ کن ہے۔ اسی لئے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج

فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لافا لصوم له وجاء رواه النسائی. جو کوئی اسباب نکاح کی قدرت رکھتا ہو اس کو ضرور نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے نگاہ نیچی رہتی ہے اور شرمگاہ (حرام کاری سے) محفوظ ہو جاتی ہے اور جس کو قدرت نکاح نہ ہو وہ روزے رکھا کرے کہ اس سے اس کی شہوت کم ہو جائے گی۔ امت محمدیہ میں اولیاء کرام کی جماعت باوجودیکہ دنیا کی لذات سے بے رغبتی میں مشہور ہے اور زہد کی تعلیم ان کے طریق میں سب سے پہلے کی جاتی ہے مگر نکاح کو وہ بھی زہد کے خلاف نہیں سمجھتے۔ سہل بن عبداللہ تستری جو کہ جلیل القدر زاہد اور بہت بڑے عابد گزرے ہیں فرمایا کرتے تھے کہ جو چیز سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھی اس سے بے رغبتی کیونکر کی جاسکتی ہے اور شیخ علی متقیؒ کا ارشاد ہے کہ ہر خواہش دل کو تاریک بنا دیتی ہے مگر نکاح سے دل میں نور اور صفائی پیدا ہوتی ہے اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ زیادہ عورتوں (سے نکاح کرنے) میں (کچھ بھی اسراف نہیں بخدا میں نئی شادی کا مشتاق ہوں اس لئے حضرات صحابہ میں جو لوگ زاہد مشہور تھے ان کے پاس بیبیاں اور باندیاں بکثرت تھیں اور قوت باہ میں بھی وہ دوسروں سے زیادہ تھے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال سے ساتویں دن دوسرا نکاح کیا پھر ان کے پاس چار بیبیاں اور انیس باندیاں ان عورتوں کے علاوہ تھیں جو وفات پا گئیں یا طلاق دیکر الگ کر دی گئی تھیں اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نکاح میں بہت رغبت رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ طلاق بھی بہت جلدی دیدیا کرتے تھے اسی لئے دو سو شریف زادیوں سے آپ نے نکاح کیا ہے اور بعض دفعہ چار عورتوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کیا ہے ایک بار حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اے لوگو! حسن اپنی بیبیوں کو بہت جلدی طلاق دے دیتے ہیں تم ان کو سوچ سمجھ کر اپنی لڑکیاں دیا کرو لوگوں نے جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین ہم بخدا اپنی لڑکیاں ان کو ضرور دیں گے اور بلا تامل دیں گے پھر جو ان کو پسند آئے گی اس کو رکھ لیں گے اور جو ناپسند ہوگی اس کو طلاق دیدیں گے ایک مرتبہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے سعید بن مسیّب فرازی کی لڑکی کو پیغام نکاح دیا اور

آپ کیساتھ ہی امام حسین اور ان کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن جعفر نے بھی پیغام بھیجا، سعید بن مسیبؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کہ میری لڑکی کے لئے تین صاحبوں کا پیغام آرہا ہے میں کس سے اس کا نکاح کروں آپ نے فرمایا کہ حسن تو طلاق بہت دیتے ہیں اور حسین کے مزاج میں سختی ہے لیکن تم عبداللہ بن جعفر کے پیام کو منظور کرلو، چنانچہ انہی سے اس کا نکاح ہوگیا۔

ف۔ سبحان اللہ اسلامی صداقت اس کو کہتے ہیں کہ باپ ہوکر اپنی اولاد کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور لڑکی والے سے اپنی اولاد کی حالت صاف صاف کھول دیتے ہیں کہ ان میں فلاں فلاں بات ہے تم ان سے اپنی بیٹی کا نکاح نہ کرو بلکہ تیسرے شخص سے کردو۔ مسلمانوں کواس واقعہ سے سبق لینا چاہیے) الغرض نکاح کوکسی نے بھی زہد کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ بہت سے علماء نے اس کو مکروہ سمجھا ہے کہ انسان حق تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے کہ اس کے نکاح میں کوئی عورت نہ ہو۔

ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیبیاں طاعون میں فوت ہوگئی تھیں اور وہ خود بھی اس وقت طاعون میں مبتلا تھے آپ نے اسی حالت میں فرمایا کہ میرا نکاح جلدی کسی عورت سے کرو کیونکہ میں بے نکاحی کی حالت میں خدا تعالیٰ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اس میں راز یہ تھا کہ وہ حق تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملنا چاہتے تھے کہ اس کی تمام مرضیات پر عمل کئے ہوئے ہوں اور نکاح حق تعالیٰ کو پسند ہے اس لئے بدون نکاح کئے مرنا ان کو گوارا نہ تھا کیونکہ یہ حالت سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھی۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر صحابہ میں بہت بڑے زاہد تھے مگر اسی کے ساتھ ان کی قوت باہ کی یہ حالت تھی کہ وہ رمضان کا روزہ جماع سے افطار کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رمضان کے مہینہ میں انہوں نے عشاء سے پہلے اپنی تین باندیوں سے فراغت حاصل کی حالانکہ اس وقت تک آپ نے کچھ کھایا پیا ہی نہ تھا اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ کھانے پینے میں بہت کمی کرتے تھے اور بعض دفعہ چند در چند فاقوں کی وجہ سے پیٹ کو پتھر بھی باندھ لیا کرتے تھے اور پہلے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ سیدنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دو وقت سیر ہو کر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی یہاں تک کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس حالت میں حق تعالیٰ نے آپ کو قوت جماع اس درجہ عطا فرمائی تھی جو خلاف عادت ہونے کی وجہ سے نہایت حیرت انگیز ہے اسی لئے آپ کے واسطے نو بیبیوں سے نکاح کرنے کی حق تعالیٰ نے اجازت دی حالانکہ اس امت میں چار سے زیادہ نکاح کی ایک وقت میں کسی کو اجازت نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بخاری اور نسائی نے روایت کی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر رات اور دن میں کسی وقت اپنی تمام بیبیوں سے فراغت حاصل کرلیا کرتے تھے حالانکہ وہ شمار میں گیارہ تھیں نو بیبیاں اور دو باندھیاں جن میں ایک کا نام ماریہ قبطیہ تھا اور دوسری کا ریحانہ حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہم لوگ آپس میں یہ کہا کرتے تھے کہ حضور کو تیس مردوں کی قوت عطا کی گئی ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ ونسائی نے ابو رافع سے بھی (جو کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں) اسی کے موافق روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب بیبیوں سے فراغت حاصل کی اور ہر ایک کے پاس جدا غسل کیا اور طاؤس وصفوان بن سلیم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس مردوں کی قوت عطا کی گئی تھی اور ابونعیم نے مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس مردوں کے برابر قوت دی گئی تھی۔ مگر دنیا کے مرد مراد نہیں بلکہ جنت کے چالیس مردوں کے برابر آپ میں قوت تھی۔ اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جنت کے ہر مرد میں (دنیا کے) ستر مردوں کے برابر قوت ہوگی اور دوسری روایت سے جس کو ترمذی نے صحیح غریب کہا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سو مردوں کے برابر طاقت ہوگی۔ پس پہلی روایت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو ہزار آٹھ سو مردوں کی طاقت ہوئی اور دوسری روایت چار ہزار مردوں کی۔

اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو بیبیوں پر اکتفا کرنا آپ کے غایت صبر کی دلیل ہے اگر آپ اس سے زیادہ بھی نکاح کرتے تو کچھ عجیب نہ تھا اور حضرات

انبیاء علیہم السلام میں اس قدر قوت کا ہونا محض اہل اسلام ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ دیگر اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ انبیاء میں دوسروں سے بہت زیادہ قوت ہوتی ہے تورات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بابت یہ خبر مذکور ہے کہ آپ کی ہزار بیبیاں تھیں بخاری و مسلم نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں آج کی رات سو بیبیوں کے پاس جاؤں گا یا ننانوے فرمایا (راوی کو شک ہے) پھر ان میں سے ہر ایک کے ایک ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرے گا اور اس وقت آپ کے وزیر نے یا فرشتہ نے کہا کہ انشاء اللہ کہہ لیجئے مگر آپ بھول گئے پھر آپ نے ایسا ہی کیا (کہ ایک رات میں سو یا ننانوے بیبیوں کے پاس گئے) مگر چونکہ انشاء اللہ نہ کہا تھا اس لئے کسی کو حمل نہ ٹھہرا صرف ایک بی بی حاملہ ہوئی جس سے ناتمام بچہ ساقط ہوگیا۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو ان کی بات پوری ہو جاتی۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی پشت میں سو مردوں کے برابر نطفہ تھا حاکم نے محمد بن کعب سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سات سو بیبیاں اور تین سو باندیاں تھیں اور سیدنا داؤد علی نبینا وعلیہ السلام باوجودیکہ بہت بڑے زاہد تھے کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے اس پر بھی ان کے پاس ننانوے بیبیاں تھیں جن کی طرف حق تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے **ان هـذا اخـی لـه تسع و تسعون نعجةً و لی نعجةً واحدة.** طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھ کو (بشریت کے لحاظ سے) چار باتوں میں سب آدمیوں پر فضیلت دی گئی ہے ایک سخاوت میں دوسری شجاعت میں، تیسری کثرت جماع میں، چوتھی مضبوطی کے ساتھ (دشمن کو) پکڑنے میں۔

غرض ان تمام دلائل سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم قوت مردانگی میں بھی درجہ کمال رکھتے تھے جو کہ مردوں میں بشریت کے لحاظ سے ایک اعلیٰ ترین وصف ہے اور بہت سے اخلاق حمیدہ اسی پر موقوف ہیں۔

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ بعض ان اشکالات کا بھی جواب دیں جو اس مقام پر بعض لوگوں کو پیش آسکتے ہیں۔سوممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ شبہ پیدا ہو کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وتبتل الیہ تبتیلا (دنیا سے نظر کو قطع کر کے حق تعالیٰ کی طرف یکسو ہو جاؤ) اس میں تو تبتل کا حکم ہے اور حدیث میں ہے۔ نُھی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن التبتل۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبتل سے منع فرمایا ہے سو آیت اور حدیث میں تعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جس تبتل کی ممانعت ہے اس سے وہ تبتل مراد ہے جس کو نصاریٰ باعث فضیلت سمجھتے تھے۔یعنی رہبانیت اور عورتوں سے علیحدگی اور بے رغبتی۔ اور آیت میں جس تبتل کا حکم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دل کا تعلق مخلوق سے قطع کر کے حق تعالیٰ کی طرف اس کو متوجہ کرو۔سونکاح اس تبتل کے منافی نہیں ہے بلکہ تقریر بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ نکاح اس تبتل میں معین ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے عفت اور قلب کو سکون اور وساوس وخطرات نفسانی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔جس کے بعد حق تعالیٰ کی طرف اس کا متوجہ ہونا سہل ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تمام شہوتیں دل کو تاریک کر دیتی ہیں۔مگر نکاح سے قلب کے نور وصفا میں ترقی ہوتی ہے پس وہ توجہ الی اللہ سے مانع نہیں البتہ اگر کسی کے پاس اہل وعیال کیلئے نفقہ وغیرہ کا خرچ ہی نہ ہو اور اس کو اندیشہ یہ ہے کہ نکاح کرنے سے حرام کمائی پر مجبور ہوگا تو اس کے لئے نکاح بیشک خدا کی طرف متوجہ ہونے سے مانع ہوگا ایسے شخص کو نکاح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو روزے رکھ کر اپنی شہوت کو قبضہ میں کرنا چاہیے جیسا کہ اوپر ایک حدیث میں یہ مضمون گزر چکا ہے اور دوسرا اشکال بعض لوگوں کو یہ پیش آتا ہے کہ حق تعالیٰ عزوجل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علی نبینا وعلیہما الصلوۃ والسلام کی مدح میں فرمایا ہے سَیِّدًا و حصورً وَنَبِیًّا مِّنَ الصَّالِحِیْنَ (کہ وہ سردار ہونگے اور اپنے نفس کو روکنے والے اور نبی ہونگے شائستہ لوگوں میں سے) اور بعض مفسرین نے

حصورا کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ وہ عورتوں کے پاس جانے سے عاجز ہونگے پس اگر نکاح کوئی فضیلت کی چیز ہے تو یحیٰؑ علیہ السلام کی یہ ثناء وصفت بے موقع ہوئی جاتی ہے۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام نے بھی عورتوں کی طرف مطلق التفات نہیں کیا اگر نکاح کرنا بے نکاح رہنے سے افضل ہوتا تو وہ ضرور نکاح کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حصور کی تفسیر میں جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یحیٰ علیہ السلام عورتوں کے پاس جانے سے عاجز تھے یہ صحیح نہیں کیونکہ ماہر مفسرین اور علماء ناقدین نے اس کو رد کر دیا ہے۔

نامردی ایک بہت بڑا عیب ہے جو کسی انسان کی تعریف میں ذکر نہیں کیا جا سکتا اور نہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسے عیب کی نسبت کی جا سکتی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام تمام قوی بشریہ میں کامل ہوتے ہیں بلکہ حصور کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کو گناہوں سے یا مباح لذتوں سے روکنے والے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ نکاح لذت مستحبہ ہے اس سے نفس کو روکنا مراد نہیں ہوسکتا اور تلمانی نے ذکر کیا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں جب آسمان سے دجال کے قتل کرنے کو اتریں گے۔ اس وقت آپ نکاح بھی کریں گے اور آپ کی نرینہ اولاد بھی ہوگی۔ اور وفات کے بعد سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صدیق اکبرؓ کے درمیان میں دفن ہونگے

اور یحیٰ علیہ السلام نے انتقال سے پہلے ایک عورت سے نکاح کرلیا تھا لیکن آپ کو اس کے پاس جانے کی نوبت نہیں آئی کہ شہید ہو گئے الغرض قوت نکاح کا نہ ہونا بہت بڑا نقص ہے۔ جس سے انبیاء علیہم السلام منزہ ہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ یہ قوت موجود ہو اور پھر اس کا توڑ کیا جاوے خواہ مجاہدات و ریاضات سے جیسا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کیا یا محض حق تعالیٰ کی حفاظت سے جس میں مجاہدہ کی ضرورت ہی نہ ہو جیسا کہ سیدنا یحیٰ علیہ السلام سے ثابت ہے۔ سو اس کی فضیلت کا فی نفسہ ہم کو انکار نہیں کیونکہ نکاح بسا

---

[1] اس حدیث میں بعض لوگوں نے ثلث کا لفظ بڑھا دیا ہے جس سے اشکال وارد ہوتا ہے کہ عورتوں اور خوشبو کا دنیا ہونا تو مسلم مگر نماز کو کیونکر دنیا میں شمار کیا گیا۔ سو ملا علی قاری نے شرح شفاء میں فرمایا ہے ولیس زیادة ثلث فی۔ اصح الروایات کہ لفظ ثلث کی زیادت صحیح روایت میں نہیں ہے فاندفع الاشکال۔

اوقات حق تعالیٰ کے ساتھ یکسوئی میں مخل ہوتا ہے اور دنیا کی طرف مائل کر دیتا ہے لیکن جس شخص کو نکاح کرنے کے بعد حق تعالیٰ سے کسی درجہ میں بھی توجہ کم نہ ہو اور اس کے حقوق کو پوری طرح ادا کر سکے۔ یقیناً یہ مرتبہ پہلے درجہ سے بڑھا ہوا ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی ہم کو تعلیم دی اور عملی طور پر بھی اس کو کر کے دکھا دیا ہے۔ کہ باوجود کثیر التعداد بیبیوں کے پھر بھی آپ کی عبادت الٰہی اور روز مرہ کے دینی معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا اور نہ ان کی محبت نے کسی وقت خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے آپ کو روکا اور نہ آپ نے بیبیوں کی خاطر کبھی دنیا جمع کرنے کی طرف التفات کیا۔ بلکہ جس قدر آپ نے نکاح کئے اسی قدر عبادات الٰہی میں ترقی کرتے گئے کہ راتوں کو اٹھنے اور نماز میں کھڑے رہنے سے آپ کے قدم مبارک ورم کر جاتے تھے اور بعض دفعہ جب کسی بی بی نے اپنے بستر پر آپ کو نہیں پایا اور تلاش کیا تو آپ کو خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہی پایا فصلی اللّٰہ علیہ وعلی الہ وبارک وسلم پھر اس کے ساتھ آپ اپنی بیبیوں کی خواہش کو بھی پورا کرتے اور ان کے حقوق بھی اس طرح ادا کرتے تھے کہ کوئی شخص اس کی نظیر نہیں دکھا سکتا۔

آپ ان کے لئے روز مرہ کی ضروریات بھی بہم پہنچاتے اور دینی ہدایت سے بھی ان کو آراستہ فرماتے تھے کہ بعد میں وہ صدہا مسائل جن کا تعلق طبقہ نسوان سے ہے انہی بابرکت امہات المومنین سے امت نے معلوم کئے۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا ثواب ایک مستقل درجہ رکھتا ہے۔ اور ایک حدیث میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرما دی ہے کہ میرا بکثرت نکاح کرنا دنیوی حظ کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ مجھ کو دنیا سے کوئی بھی علاقہ نہیں آپ کا ارشاد ہے[1] حبب الی من دنیا کم النساء والطیب و قرۃ عینی فی الصلوۃ اھ۔ کہ مجھ کو تمہاری دنیا میں سے دو چیزیں محبوب ہیں ایک عورتیں دوسری خوشبو۔ اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ اس میں تمہاری دنیا کا لفظ جس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان دونوں چیزوں کو دوسروں کے اعتبار سے دنیا فرمایا ہے ورنہ آپ کے اعتبار

سے یہ چیزیں دنیا میں داخل نہ تھیں

کیونکہ آپ حظ نفس اور لذت دنیا کے لئے کوئی کام ہی نہ کرتے تھے آپ نے جو کچھ کیا دین سمجھ کر اور رضاء الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر کیا۔ اور آپ کو حقیقی محبت خدا تعالیٰ کی ذات بے مثل سے تھی اور اسی کا مشاہدہ آپ کی آنکھ کیلئے ٹھنڈک کا سبب تھا اور اس پر کچھ تعجب نہ کیا جائے کیونکہ حضور کے غلامان غلام میں بھی بعض لوگ ایسے ہوئے ہیں جن کو عین جماع کے وقت حظ نفس کی طرف مطلق التفات نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں بعض دفعہ ایک عورت سے نکاح کرتا ہوں اور مجھے اس کی کچھ حاجت نہیں ہوتی اور اس کے پاس جاتا ہوں تو مجھے اس کی طرف شہوت نہیں ہوتی۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر آپ نکاح اور قربت کس لیے کرتے ہیں۔ فرمایا محض اس لئے کہ مجھ سے ایسی نسل پیدا ہو جائے جن کی کثرت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں فخر فرمادیں اور اولیاء اللہ میں بھی بعض لوگ اس درجہ کے گزرے ہیں بلکہ اب بھی موجود ہیں مستعنا اللہ بفیوضہم وتبرکاتہم اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور انشاء اللہ آئندہ نمبر میں عزت و جاہ کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

والحمد للّٰہ وعلی خیر البریة افضل الصلوة والتحیه

تعلیم نبوت (عزت وجاہ)

ناظرین کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ضروریات زندگی میں سے عزت و جاہ بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی زیادت وکثرت ہر شخص کو مطلوب ہے اور جس عزت و جاہ سے انسان کمزور اور ضعیف آدمیوں کو نفع پہنچا سکے وہ بالاتفاق عقلاء وحکماء سب کے نزدیک محمود ہے۔

اب ہم دکھلانا چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے سیدنا رسول اللہ علیہ وسلم کو عزت وجاہ کس قدر عطا فرمائی تھی اور دوستوں کے علاوہ دشمنوں کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس قدر جاگزیں تھی۔ لیکن سب سے پہلے ناظرین کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جاہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو خداداد ہو۔ دوسری وہ جو کہ انسان کی طلب اور کوشش سے حاصل ہو۔ پہلی قسم جاہ محمود ہے اور دوسری قسم جاہ مذموم شریعت اسلامیہ نے طلب جاہ اور اس کیلئے کوشش اور سعی سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ تکبر کا ایک شائبہ ہے اور شرعاً وعقلاً تکبر سے بدتر کوئی عیب نہیں البتہ شریعت نے بدنامی اور ذلت سے بچنے کی ضرور تاکید کی ہے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اتقوا مواضع التھم. تہمت کے مواقع سے بچو نیز آپ کا ارشاد ہے لا ینبغی للمومن ان یذل نفسه. مسلمان کو مناسب نہیں ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے اگر کسی پر کوئی غلط الزام یا تہمت رکھ دی جائے تو اس سے اپنی برات ظاہر کرنا اور براءت کیلئے کوشش کرنا شرعاً مطلوب ومحمود ہے جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے قید خانہ سے رہائی اور خلاصی کا حکم سننے کے بعد قاصد سے فرمایا تھا.

﴿ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴾

''تو اپنے آقا کے پاس واپس جا کر اس سے دریافت کر کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔''

''یعنی ان سے میرے واقعہ کی تحقیق کرنا چاہیے اور جب تک میری براءت ظاہر نہ ہو جائے اس وقت تک میں قید خانہ سے باہر نہ نکلوں

گا۔) بیشک میرا رب اس طبقہ نسواں کے فریب کو خوب جانتا ہے۔''

یوسف علیہ السلام کے اس فعل سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ غلط اور بیجا اتہام سے اپنی برات کر دینا اور اس میں سعی کرنا شرعاً محمود ہے سو یہ امور طلب جاہ میں داخل نہیں ہیں طلب جاہ یہ ہے کہ انسان اپنی عظمت لوگوں کے قلوب میں بٹھانے کے لئے وسائل و ذرائع تلاش کر کے ان میں سعی اور کوشش کرے۔ سو یہ صورت شرعاً مذموم ہے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ محض خدا کو راضی کرنے کیلئے اخلاق حمیدہ و اعمال صالحہ اختیار کرے اور بلاوجہ تہمت و ذلت کے مواقع میں نہ پڑے اس سے خود بخود لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و جاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خداداد عزت ہے جو نعمت الٰہی ہونے کی وجہ سے قابل شکر اور لائق مدح و ثناء ہے۔

پس ہم سب سے پہلے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عزت و جاہ حاصل کرنے کے لئے خود کوئی کوشش نہیں کی بلکہ بذات خود آپ نے ہمیشہ تواضع اور خاکساری کا طریقہ اختیار فرمایا آپ میں ترفع اور تکبر نام کو بھی نہ تھا پھر طلب جاہ کیلئے کوشش تو آپ کیا کرتے مگر بایں ہمہ آپ کی خداداد عظمت و جاہ دشمنوں کے قلوب میں اس درجہ تھی کہ کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع کے واقعات احادیث میں اس قدر مذکور ہیں کہ ان کے لئے ایک دفتر عظیم کی ضرورت ہے مگر بطور نمونہ کے ہم چند واقعات پر اکتفاء کرتے ہیں قاضی عیاض نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاٹھی کا سہارا لئے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم تعظیم کیلئے آپ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے، حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم میرے لئے اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو جیسے اہل عجم اپنے بادشاہوں کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ کھانا کھاتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے بیٹھا کرتے تھے کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے

فرمایا کہ میں تو (اپنے پروردگار کا) غلام ہوں غلاموں ہی کی طرح کھاتا ہوں اور غلاموں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے داہنے ہاتھ میں ککڑی اور بائیں ہاتھ میں تازہ کھجور ہے کبھی آپ اس کو کھاتے تھے کبھی اس کو۔ نیز سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ دراز گوش پر بھی سوار ہو لیتے تھے حالانکہ آپ کے پاس اونٹ اور گھوڑے سب کچھ موجود تھے۔ اور کبھی کبھی سواری پر کسی کو اپنے پیچھے بھی بٹھا لیا کرتے تھے۔

آپ مسکین لوگوں کی عیادت (اور مزاج پرسی) کیلئے بھی تشریف لیجایا کرتے اور اکثر غرباء و مساکین ہی کے پاس بیٹھا اٹھا کرتے تھے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں مل جل کر بیٹھتے تھے کوئی امتیازی جگہ آپ کیلئے مقرر نہ تھی۔ اور جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ خالی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری تعریف میں ایسا مبالغہ مت کرو جیسا کہ نصاری نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے۔ (کہ ان کو خدا کا بیٹا بنا دیا) بس میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔ (رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا وہ ایک بار حضورؐ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بی !تو مدینہ کے راستوں میں سے کسی راستہ پر بیٹھ جا میں وہیں بیٹھ کر بھی تیری بات سنوں گا ۔ چنانچہ وہ کسی راستہ پر بیٹھ گئی اور حضور بھی وہیں بیٹھ گئے۔ اور بات سن کر اس کی حاجت پوری فرما دی (رواہ مسلم) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بنی قریضہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دراز گوش پر سوار تھے۔ جس کے گلے میں کھجور کی رسی اور پیٹھ پر پالان کسا ہوا تھا (رواہ ابوداؤد)۔

حضرت انس کا یہ بھی بیان ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کی

دعوت بھی قبول فرمایا کرتے اور اگر کوئی جو کی روٹی پرانی چربی سے کھانے کیلئے آپ کو بلاتا تو آپؐ اس کو بھی منظور فرما لیتے تھے اور جب حضور حج کیلئے تشریف لے گئے تو آپ ایک پرانی کاٹھی پر سوار تھے۔ جس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا، جو چار درہم سے بھی کم کا تھا۔ حالانکہ اس وقت زمین عرب کا بہت بڑا حصہ آپ فتح کر چکے تھے اور اس حج میں آپؐ نے سو اونٹوں کی قربانی اپنی طرف سے کی تھی۔ اور جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور مسلمانوں کے لشکر کولیکر شہر میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپؐ نے تواضع اور عاجزی کی وجہ سے کجاوے پر اپنا سر جھکا لیا۔ یہاں تک کہ وہ کجاوے کی لکڑی سے مل مل جاتا تھا۔

حضرت عائشہ وابوسعید حذری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں تشریف لاتے تو اپنے گھر والوں کے کاموں میں ان کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ اپنے کپڑوں کی جوئیں پالیتے اور کپڑوں میں خود ہی پیوند لگا لیتے تھے۔

فائدہ: ابن سبعؒ نے فرمایا ہے کہ روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ کے سر یا لباس میں جوئیں کبھی نہ پڑتی تھیں پھر آپ کا جوئیں پانا محض صفائی اور نظافت کے خیال سے تھا) اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتہ بھی گانٹھ لیتے تھے اور گھر میں جھاڑو دے لیا کرتے اور اونٹوں کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے اور جانوروں کو چارہ ڈالتے اور اپنے غلام اور نوکر کے ساتھ کھانا کھا لیتے اور کبھی خادمہ کے ساتھ ملکر آٹا بھی گوندلیتے تھے اور بعض دفعہ بازار سے کھانے پینے کی چیزیں خود لا دیا کرتے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض دفعہ مدینہ کی باندیوں میں سے کوئی باندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی اپنے کام کے واسطے لے جاتی اور حضورؐ اس کے ساتھ ہو لیتے اور اس کا کام کر دیتے تھے۔ اھ۔ مثلاً اس کے آقا سے سفارش کر دیتے کہ اس سے کام بہت نہ لیا کرو جو اس کے تحمل سے زیادہ ہو (رواہ البخاری تعلیقا وابن ماجۃ موصولا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت آپ ایک بوریئے پر لیٹے ہوئے تھے جس کے نشانات آپ کے پہلو پر نمایاں ہو گئے تھے اور آپ کے دائیں بائیں کچھ کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ حضرت

عمراس حالت کو دیکھ کر رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ کسریٰ اور قیصر جو خدا کے دشمن ہیں ریشمی گدوں پر آرام کر رہے ہیں اور آپ محبوب خدا ہو کر اس حالت میں ہیں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ آپ کی امت کو وسعت عطا فرمائیں۔ آپ یہ بات سن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ اے عمر! تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان لوگوں کیلئے دنیا ہی میں راحت ہے اور ہمارے واسطے آخرت میں بے شمار نعمتیں ہیں۔

ناظرین! یہ تھی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع باوجودیکہ آپ صرف پیغمبر ہی نہ تھے بلکہ ایک بہت بڑی سلطنت کا انتظام بھی آپ کے ہاتھ میں تھا۔ سلطان ہو کر جس تواضع کی نظیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائی ہے اس کی مثال دنیا کے پردہ میں نہیں مل سکتی۔ آیئے اب ہم آپ کو اس خداداد عزت و جاہ کا نمونہ دکھلائیں جو اس تواضع اور خاکساری پر حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جاہ نبوت سے پہلے ہی لوگوں کے دلوں پر اپنا سکہ بٹھا چکی تھی۔ آپ کی رحمدلی، اخلاق و فاداری، سچائی، دیانتداری، نیک چلنی، غربا نوازی، قومی ہمدردی اور انصاف پسندی نے ابتداء ہی سے آپ کو ہر دل عزیز بنا دیا اور قوم سے محمد امین کا خطاب دلا دیا تھا۔ آپ کی نبوت سے پہلے جب قریش نے بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کا ارادہ کیا اور اپنی صاف ستھری کمائی سے خدا کے باعظمت گھر کو بنانا شروع کیا تو حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھنے میں قبائل مکہ کے اندر پھوٹ پڑ گئی۔ کیونکہ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ یہ پاک پتھر میرے ہاتھوں اپنے مقام تک پہنچے عرب کی ضد اور جہالت کو سب جانتے ہیں کہ ان میں جھگڑا پڑے پیچھے بات کا سلجھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس لئے خانہ کعبہ کی تعمیر تو یہیں رک گئی اور اب ہر قبیلہ کو لڑ کر اپنی جان کا دیدنا آسان نظر آنے لگا۔ بالآخر پانچ دن مسجد حرام میں کمیٹی ہوئی اور باہمی مشورہ سے منصفانہ فیصلے ہونے لگے۔ بہترین رد بدل کے بعد آخر چند بوڑھے سرداروں اور قوم کے سربرآوردہ تجربہ کاروں نے مشورہ دیا کہ اچھا صبح ہوتے سب سے پہلے جو شخص حرم شریف کے اس دروازہ سے گزرے اس کو منصف قرار دے لو اور جس کو وہ کہے وہی شخص حجر اسود کو

اس کی جگہ رکھ دے۔

چنانچہ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور اگلے دن پر اپنی اپنی تقدیر کا فیصلہ حوالہ کر کے سب اپنے گھر چلے گئے صبح کو اس دروازہ سے گزرنے والے پہلے شخص سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کی سچائی کا سکہ سب کے دلوں میں بیٹھ چکا اور ہمدردی وعزت کی شہرت عام طور پر قبائل عرب کو گرویدہ بنا چکی تھی۔ اس لئے سب نے آپ کو دیکھ کر بالاتفاق کہا **هذا محمد هذا الامين قد رضينا به** یہ محمد ہیں یہ امین ہیں۔ ہم سب ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ جس کو یہ حکم دیں گے وہی حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کی عزت حاصل کریگا۔ چنانچہ آپؐ نے اس طرح فیصلہ کیا کہ حجر اسد کو اپنی مبارک چادر میں رکھا اور ہر قبیلہ کے صاحب عزت سردار کو حکم دیا کہ اس چادر کو تھام لے تا کہ تمام قبائل مکہ کے ہاتھوں پر پتھر اپنی جگہ پہنچے اور کسی قبیلہ کو یہ کہنے کا حق نہ رہے کہ اس عزت میں میرا کوئی شریک نہیں اس عجیب خوش تدبیری پر چاروں طرف سے صدائے آفریں۔ بلند ہوئی اور قبائل کے سرداروں نے اس طرح حجر اسود کو اس کی جگہ پہنچایا اس کے بعد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور بہ نفس نفیس خود اس پتھر کو چادر سے باہر نکال کر اس جگہ رکھ دیا جہاں وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ رواہ احمد والحاکم وصحہ الطبرانی)

ربیع بن خثیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زمانہ جاہلیت میں اسلام سے پہلے ہی قبائل مکہ کے اکثر مقدمات فیصلہ کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وعزت نبوت سے پہلے بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی اور نبوت کے بعد تو جو کچھ عزت وجاہ عام قلوب میں آپ کو حاصل ہوئی اس کے واقعات شمار نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ابوجہل نے ایک تاجر سے اونٹ خرید کیا اور معاملہ طے کر کے قیمت دینے کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا۔ معین وقت پر جب تاجر نے قیمت کا مطالبہ کیا تو اس کو دوسرے دن پر ٹال دیا جب وہ دوبارہ آیا تو کسی اور وقت کا بہانہ کر دیا۔ غرض اسی طرح ٹالتا رہا بالآخر تاجر نے مسجد حرام میں آ کر قریش کی ایک مجلس میں ابوجہل کے

اس ظلم کی شکایت کی اور سرداران قریش سے کہا کہ کیا آپ صاحبوں میں سے کوئی میری مدد کیلئے تیار ہوسکتا ہے کہ ابوجہل سے میری رقم وصول کرادے۔ اہل مجلس نے کہا کہ تم محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ۔ وہ ابوجہل سے تمہاری رقم دلوا سکتے ہیں۔ دوسرا کوئی اس ہمت کا نہیں (حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید ورسالت کی دعوت اعلانیہ شروع کردی تھی اور اس وجہ سے ابوجہل آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مگر پھر بھی قریش کو آپ کی عظمت خداداد کی بنا پر یہ پورا یقین تھا کہ ابوجہل آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتا گو مذہب کے بارہ میں آپ سے کیسی ہی عداوت رکھتا ہو)

چنانچہ تاجر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ سے امداد کا طالب ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ ابوجہل کے گھر پر تشریف لائے اور دروازہ کھٹکھٹا کر اسے باہر بلایا۔ اس نے باہر آکر دریافت کیا کہ اے محمدؐ آپ کیسے تشریف لائے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ تم اس تاجر کی رقم کیوں نہیں دیتے۔ اس کو روز روز کیوں ٹال دیتے ہو

ابوجہل بولا کہ آپ تشریف رکھیں میں ابھی پوری رقم لاتا ہوں۔ چنانچہ آپ کے سامنے ہی اس نے سب روپے گن دیئے اور تاجر آپ کو دعا دیتا ہوا لوٹ گیا۔ قریش کے لوگوں نے ابوجہل پر آوازیں کسیں کہ آج تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے پر تو نے بڑی جلدی عمل کیا حالانکہ رات دن تو ان کی ایذا کے درپے اور عداوت نکالنے کا منتظر رہتا ہے۔

کہنے لگا کہ بس زیادہ نہ بولو بات یہ ہے کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میرے دروازہ پر ہاتھ مار کر مجھے آواز دی ہے۔ اس وقت میرے دل پر ان کی آواز سے کچھ ایسا رعب چھا گیا کہ مجھے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہی کروں۔

ایک اور واقعہ اسی ابوجہل کا یہ ہے کہ ایک شخص قبیلہ بنی زبید کا اپنے تین اونٹ نیلام کرنے لایا۔ ابوجہل نے ان کے خریدنے کا قصد کیا اور بھاؤ تاؤ کرنے لگا ابوجہل کو دیکھ کر دوسرے لوگ بولی بولنے سے رک گئے اور اس نے ان تینوں اونٹوں کے دام بہت

کم لگائے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو آپ تشریف لائے اور قیمت میں (معقول) اضافہ کر کے تینوں اونٹ آپ نے خرید لئے پھر ان میں سے دو اونٹوں کو تو اسی قیمت پر فروخت کر کے اعرابی کے دام ادا کر دیئے اور تیسرے اونٹ کو بیچ کر بنی عبدالمطلب کی بیوہ عورتوں میں اس کی قیمت تقسیم کر دی۔

ابو جہل ذلیل وخوار کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر دم نہ مار سکا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک نظر بھر کر دیکھا اور فرمایا کہ خبردار آئندہ ایسی ظالمانہ حرکت نہ کرنا جیسی آج تو نے اس اعرابی کے ساتھ کی ہے، ورنہ میں بری طرح تیرے ساتھ پیش آؤں گا۔ ابو جہل بولا کہ اے محمدؐ میں پھر ایسی حرکت نہ کرونگا۔ امیہ ابن خلف نے یہ حالت دیکھ کر ابو جہل سے کہا کہ آج تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے تو بہت ہی دب گیا۔ کہنے لگا اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں بائیں بہت سے آدمی نظر آ رہے تھے جو نیزے ہاتھوں میں لئے ہوئے مجھے گھور رہے تھے۔ اگر میں اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرتا تو میری ہلاکت میں دیر نہ لگتی۔ (اخرج القصہ الاولی فی السیرۃ النبویۃ مفصلاً واخرجها والثانیۃ فی شرح الشفاء مجملاً) الغرض نبوت کے بعد ایسے واقعات بکثرت پیش آتے تھے کہ جو لوگ پیٹھ پیچھے عداوت اور ایذارسانی میں کمی نہ کرتے وہی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تو آپ کی خداداد عظمت سے مرعوب ہو کر جو کچھ آپ فرماتے اس کو ہی بجا لاتے اور آپ کو دیکھتے ہی مبہوت وخوف زدہ ہو جاتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم شریف میں تنہا بیٹھے تھے کہ ایک قریشی سردار عتبہ بن ربیعہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے میرے بھائی کے لڑکے بیشک تم شرافت ولیاقت میں مشہور ہو لیکن افسوس تم نے ہم لوگوں میں تفرقہ ڈالدیا ہمارے گھروں میں جھگڑا پھیلا دیا تم ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتے اور ہمارے باپ دادا کو گنہگار بددین مشرک اور جہنمی بتاتے ہو اس لئے ہم لوگ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، تم اس پر غور کرو اور جو کچھ ہم کہیں اسے منظور کر لو آپ نے فرمایا کہ اے ولید کے باپ تم

کہو میں سنتا ہوں، ابو الولید نے کہا کہ اے میرے بھائی کے بیٹے اگر تم اپنی ان باتوں سے دولت پیدا کرنا چاہتے ہو تو ہم چندہ کر کے تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر سکتے ہیں کہ اس قدر ہم میں سے کسی امیر کے پاس بھی نہ ہوگی اور اگر اس سے تم اپنی عزت اور نام چاہتے ہو تو ہم لوگ تمہیں اپنا سردار بنالیں کہ کوئی کام تمہاری رائے کے ہرگز خلاف نہ کریں اور اگر تم ملک چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ قرار دیں اور اگر تم کو آسیب کا خلل ہے اور وہ بھوت جو تم پر سوار ہے تم سے نہ اترے تو ہم لوگ روپیہ خرچ کر کے کسی حکیم کو لائیں اور ہوشیار طبیب سے تمہارا علاج کرائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ مجھ کو تمہارا روپیہ چاہیے نہ تمہاری سلطنت درکار ہے، نہ تمہارا جاہ وحشم میری نظر میں کوئی چیز ہے، میں تو تم کو اللہ کا پیغام پہنچاتا ہوں، اس کے بعد آپ کھڑے ہوئے اور سورہ حٰم سجدہ کی شروع کی آیات تلاوت فرمائیں۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی یہ آیات سنا چکے تو فرمایا کہ اب تم نے سن لیا کہ میرا مقصود کیا ہے۔ میرا مطلب تم پر ظاہر ہو گیا اور میرا منشا تم معلوم کر چکے۔

اب جو مناسب سمجھو کرو۔ عتبہ بن ربیعہ آسمانی وحی سے اس قدر متاثر ہوا کہ آپ کے تلاوت شروع کرتے ہی دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب زمین پر ٹیک کر مبہوت بنا سنتا رہا اور جب تک آپ نے آیات سجدہ تک تلاوت ختم نہ کی۔ اسی طرح بے حس و حرکت بنا رہا۔ آخر اپنے رفقاء قریش کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے قوم آج میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ایسا شیریں کلام سنا ہے کہ واللہ نہ اس کو سحر و کہانت کہہ سکتا ہوں نہ شعر و شاعری۔ اے قوم میرا کہنا مانو محمد کی مخالفت نہ کرو اور جس کام میں وہ لگے ہوئے ہیں، اس میں مزاحمت نہ کرو، یاد رکھو مجھے ان کے کلام سے ان کے مقاصد میں کامیابی کی بو آتی ہے۔ سو اگر کسی دشمن نے ان کا کام تمام کر دیا تو اچھا ہے کہ تمہارا کام دوسرے نے کیا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو غلبہ حاصل ہوا جیسا کہ آثار سے نظر آرہا ہے تو ان کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور ان کا ملک تمہارا ملک ہے۔ بدبخت لوگوں نے عتبہ کی بات نہ مانی اور اس پر آوازے کسنے لگے۔ مگر اس واقعہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و ہیبت قلوب میں ایسا گھر کئے ہوئے تھی کہ آپ کی بات سن کر ہر شخص متاثر ہوتا تھا۔ جس وقت آیت فاصدع بما تؤمر کا نزول ہوا۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاعلان تبلیغ اسلام کا حکم ہے تو آپ حکم خداوندی کی تعمیل کیلئے عرب کے دستور کے موافق کوہ صفا پر جا کھڑے ہوئے اور نام لے لے کر تمام قبائل مکہ کو پکارا جس وقت آپ نے دیکھا کہ صفا پہاڑی کے نیچے کا میدان آنے والی مخلوق سے بھر گیا تو آپ نے سب سے دریافت فرمایا کہ اے باشندگان عرب اور اے سرداران قریش تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو، سب نے بالاتفاق کہا انت فینا محمدٌ الامین. آپ ہمارے درمیان محمد امین کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر تمہارا دشمن لشکر لئے ہوئے چھپا ہوا تمہاری تاک میں بیٹھا ہے کہ موقع پائے تو تم پر حملہ کر دے تو کیا تم میری بات کو سچا سمجھو گے۔ چاروں طرف سے آواز آئی بیشک بیشک، اے محمد ہم تمہاری بات کا یقین کریں گے۔ کیونکہ تمہاری سچائی کا بارہا تجربہ کر چکے ہیں اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم جھوٹ بولنا جانتے ہی نہیں (رواہ اصحاب السنن)۔

قاضی عیاض نے اپنی سند متصل کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے کہ ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے اور نہ آپ ہماری قوم میں کبھی جھٹلائے گئے۔ ہم تو صرف اس کتاب کو جھٹلاتے ہیں جو آپ ہمارے پاس لائے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾

''اے رسول یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔'' اھ

ابن اسحاق اور بیہقی نے زہری سے اور ابن جریر وطبرانی نے سدی سے نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے دن اخنس بن شریک ابوجہل سے تنہائی میں ملا اور اس سے کہا کہ اے

ابوالحکم اس وقت میرے اور تیرے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سن سکے سچ سچ بتلا دے کہ تیرے خیال میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں کہ جھوٹے ابوجہل نے کہا کہ بخدا محمدؐ یقیناً سچے ہیں اور محمدؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن جب بنو ہاشم بیت اللہ کی دربانی اور زمزم پلانے کی تولیت اور قومی جھنڈے اور دارالمشورہ کے اہتمام کے ساتھ نبوت کی عزت کے بھی مالک ہو جائیں گے تو پھر دیگر قریشی خاندانوں کیلئے کونسی بات رہ جائے گی۔

مطلب یہ تھا کہ مجھ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے محض یہ عناد اور حسد مانع ہے کہ آپ کی نبوت کی وجہ سے بنو ہاشم ہی کے اندر تمام عزتیں جمع ہو جائیں گی۔ باقی سارے قبیلے ان کے مطیع و تابعدار بن جائیں گے اور ایک رقیب خاندان کی یہ عزت ان آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی۔

ابوجہل کے اس کلام سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوگئی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وعظمت اور آپ کی سچائی اور امانت کا سکہ دشمنوں کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ گو عناد وحسد کی وجہ سے وہ مخالفت اور ایذا رسانی سے باز نہ آتے تھے۔ وکفی بہ حجۃ والفضل ماشھدت بہ الاعداء

امام بخاریؒ نے ہرقل شاہ روم اور ابوسفیان بن حرب کا مکالمہ نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی صحیح کے شروع ہی میں بیان فرمایا ہے۔ جس کا ابتدائی انتہائی حصہ نقل کر دینا اس وقت ہمارے مقصود کی تائید کیلئے کافی ہوگا۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ سے فراغت پا کر سلاطین عالم کے نام دعوت اسلام کیلئے تبلیغی فرمان ارسال فرمائے تھے جن میں ایک فرمان ہرقل شاہ روم کے نام بھی تھا۔

جس وقت سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ ہرقل کے پاس بیت المقدس میں پہنچا ہے اس وقت ابوسفیان بن حرب بھی (جو رشتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور اس وقت تک اسلام سے مشرف نہ ہوئے تھے۔ تجارتی ضرورت سے

قریشی قافلے کے ساتھ وہاں گئے ہوئے تھے اس لئے ہرقل نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے زیادہ واقف سمجھ کر گفتگو کیلئے بلایا اور ان سے متعدد سوالات حضورؐ کی نسبت کئے، جن میں سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نسب اور ذاتی شرافت کے لحاظ سے تمہاری قوم میں کس پایہ کے ہیں۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ وہ نہایت شریف النسب (ہاشمی و مطلبی نسل کے) شریف زادہ ہیں۔ اس کے بعد (ہرقل) نے دوسرا سوال یہ کیا کہ دعویٰ نبوت سے پہلے تم نے کبھی کسی بات میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھوٹ بولتے پایا ہے۔ (ابوسفیان) نے کہا کہ کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ سے سچائی میں مشہور اور ضرب المثل رہے ہیں۔

ہرقل نے متعدد سوالات اور بھی کئے پھر ان سوالات کی وجہ بتلا کر اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان سے وہ کس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ چنانچہ پہلے سوال کے جواب پر اس نے کہا کہ بیشک نبوت ہمیشہ شریف خاندان ہی میں رہی ہے تاکہ مخلوق نبی کو حقیر نظروں سے نہ دیکھے۔ اور دوسرے سوال کا جواب سن کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ عقل کے نزدیک یہ بات واجب التسلیم ہے کہ جو شخص دنیوی امور میں جھوٹ بولنے سے ڈریگا وہ خدا پر بہتان باندھنے اور غلط بیانی اور نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کی بھی کبھی جرأت نہ کر سکے گا۔

پھر اسی طرح تمام جوابات کے نتائج بیان کر کے اس نے ابوسفیان سے کہا کہ اب مجھے صرف یہ پوچھنا باقی ہے کہ وہ اپنا مطیع بنا کر لوگوں سے کیا چاہتے ہیں، کن باتوں سے منع کرتے اور کیا کام کرنے کو کہتے ہیں؟

ابوسفیان نے جواب دیا کہ وہ کہتے ہیں دیوتاؤں کو خدا نہ سمجھو ان کے سامنے سر نہ جھکاؤ، اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرو پانچ وقت کی نماز پڑھو۔ اپنے مال میں سے شرعی مقدار کے موافق زکوۃ ادا کرو۔ محتاج رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرو اور نیک برتاؤ کرو، زنا مت کرو، چوری مت کرو۔ جھوٹ نہ بولو ایک دوسرے کا ناجائز طور سے مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سن کر ہرقل بے اختیار پکار اٹھا کہ جو باتیں تم نے بیان کی ہیں اگر سچ ہیں تو

بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ اگر مجھ سے ہوسکتا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوکر قدم چومتا اور پاؤں دھوکر پیتا اور یقین جانو کہ جس جگہ آج میرے قدم ہیں کسی دن ان کی حکومت کا جھنڈا یہاں لہراتا ہوگا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ ہرقل کے یہ کلمات سن کر میں حیران تھا اس کے چہرے کو تکتا اور خیال کرتا تھا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف بادشاہ روم کے دل میں بھی موجود ہے اور اس پر اس قدر رعب چھا گیا ہے کہ وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ان کی ہیبت سے ڈرتا اور کانپتا ہے۔

ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اسی وقت یقین ہوگیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عنقریب قریش پر غالب ہوکر رہیں گے۔ اسی طرح جن جن سلاطین کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچا ہے سب نے آپ کے والا نامہ کو نہایت عزت سے پڑھا اور غایت ادب کے ساتھ جواب دیا (جس کی تفصیل کسی موقعہ پر انشاء اللہ ہدیۂ ناظرین ہوگی) صرف ایک شاہ فارس پرویز نے حضورؐ کے والا نامہ کے ساتھ گستاخی کی تھی کہ اس کو غضبناک ہوکر چاک کردیا۔ جس پر حضورؐ نے اس کے حق میں یہ بددعا فرمائی اللھم مزقه کل ممزق اے اللہ اس کو بھی تو اسی طرح پارہ پارہ کردیجیو۔

چنانچہ چند دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کو اس کے بیٹے شیرویہ نے رات کے وقت خنجر سے مار ڈالا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حکومت حصے بخرے ہوکر مسلمانوں کے قبضے میں آگئی۔ ابن اسحٰق اور بیہقی اپنی سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نضر بن حارث نے (جو کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت و عناد رکھتا تھا) ایک مرتبہ سرداران قریش سے کہا کہ اے قریش یہ کیا بات ہے کہ محمدؐ بچپن سے لیکر جوانی تک تو تمہارے اندر نہایت ہر دلعزیز اور بڑے راستگو اور غایت درجہ امانت دار سمجھے جاتے تھے پھر جب تم نے ان کے سر میں کچھ سفید بال دیکھ لئے اور وہ تمہارے پاس ایک شیریں کلام لائے تو تم کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہیں لا واللہ ما ھو بساحر ہرگز نہیں خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں۔

ناظرین دشمنوں کی زبان سے ان باتوں کا نکلنا سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی حقانیت اور آپ کی اعلیٰ عزت و جاہ کیلئے کافی دلیل ہے۔ واللہ العظیم آپ کی مبارک صورت ایسی نہ تھی جسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آپ کی عظمت دل میں گھر نہ کرلے باقی ایمان لانا یا نہ لانا یہ ہر شخص کی تقدیر پر ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے جب پہلی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی تو بے اختیار بول اٹھے ماھذا وجه كذاب یہ تو جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں۔

حضرات صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شمائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ من راه بداهة هابهٗ و من خالطه معرفةً احبه لم ارقبله ولا بعده' مثله'. جو شخص آپ کو اول وہلہ میں دیکھتا تھا مرعوب ہو جاتا اور جو شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا تھا اس کے دل میں آپ کی محبت اپنا گھر کر لیتی تھی۔

ایک روایت میں ہے اذا تکلم اطرق جلساءهٗ كان على رؤسهم الطير. جب آپ گفتگو فرماتے تھے تو آپ کے پاس بیٹھنے والے اس طرح سر جھکا کر بیٹھ جاتے جیسے ان کے سروں پر پرندے آکر بیٹھ گئے ہیں۔ بیہقی اور حاکم ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوا تو معاً کانپنے لگا آپ نے (تسلی کے طور پر) فرمایا کہ گھبراؤ نہیں میں کوئی (جابر) بادشاہ نہیں ہوں (صححہ الحاکم)

ابو داؤد اور ترمذی عبداللہ بن حسان سے روایت کرتے ہیں کہ ایک بار قیلہ بنت مخرمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں دیکھا کہ آپ گھٹنے کھڑے کئے ہوئے نہایت عاجزی سے بیٹھے ہیں۔ اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر قیلہ کے بدن پر مارے خوف کے لرزہ پڑ گیا۔ اس قسم کے واقعات احادیث میں بکثرت ہیں۔ مگر مضمون کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور انہی معدودے چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جن سے بحمد اللہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عزت و جاہ عطا فرمائی تھی کہ موافقین سے گزر کر مخالفین کو بھی اس کا اقرار تھا اور بڑے

بڑے مخالفین حتیٰ کہ سلاطین بھی محض آپ کے نام سے مرعوب ہو جاتے تھے۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی فرمائی ہے کہ ایک مہینہ کی مسافت تک میرا رعب دشمنوں پر چھایا ہوا ہے۔ ناظرین کرام! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہیبت وعظمت جاہ اور رعب خداداد تھا۔

ہیبت حق است و ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہم کو ایسی شریعت عطا کی گئی ہے کہ جس پر پوری طرح عمل کرنے سے ہم کو بھی خداداد عزت وعظمت جاہ اور رعب کا نہایت کافی حصہ نصیب ہوسکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اہل اسلام اپنے نبی پر نازل ہونے والی کتاب اور محبوب خدا کے ارشادات پر کامل طور سے عمل پیرا رہے اس وقت تک سلاطین دنیا مسلمانوں کی ہیبت سے کانپتے ہی رہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ مسلمانوں کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکے لیکن جب سے ہم نے خود ہی اپنے دین کی عزت اپنے دلوں سے کم کر دی تو خدا تعالیٰ نے یہی ہماری عزت وعظمت لوگوں کے دل سے نکال دی حتیٰ کہ افسوس ہے آج مسلمان اسلام کی حرمت و آبرو سنبھالنے کیلئے اپنے کو دیگر اقوام کی امداد کا محتاج سمجھتے ہیں اور تقریروں اور تحریروں میں ایک کافر و مشرک کا نام لیکر کہتے ہیں کہ وہ اسلام کو آزادی دلوائیگا انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ارے غافل مسلمان! تیری عزت وعظمت خود تیرے ہاتھ میں ہے خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تیرے لئے اور تیری عزت وعظمت کے باقی رکھنے کیلئے کافی ہیں۔ واللہ تو کسی کی امداد کا محتاج نہیں صرف اپنے خدا کی حمایت کا محتاج ہے۔ پس وہ کام کر جس پر خدا راضی ہو اور اس کی نصرت وحمایت تیرے ساتھ ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو بخدا تجھ کو دنیا میں کبھی عزت حاصل نہیں ہوسکتی۔

عزیز یکہ از در گہش سر بتاخت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد
مع ضمیمہ

الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد

سوال

السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اما بعد

دریافت طلب یہ امر ہے کہ خیر القرون سے استمداد و استعانت بارواح الانبیاو الاولیاء آج تک معمول اسلام رہا اور سب صلحا و مشائخ اپنے مہماتوں میں استعانت بالغیر کرتے رہے اور کامیاب بھی ہوئے لیکن آجکل بعض حضرات اس کو منع کرتے ہیں اور اس کو شرک و بدعت فرماتے ہیں۔ اتنا خلجان ہے کہ اگر عوام پر شرک کا حکم لگادیں جن میں حضرات مشائخ نے اس امر کو کیا دوسروں کو بھی اس امر کا تجویز فرمایا تو ان کو کس طرح اس حکم سے نکالیں۔ فی الحال محض اپنے تصحیح اعتقاد کیلئے یہ عبارات پیش کرتا ہوں ان کا جواب تحت عنوان دعوت عامہ النور میں تحریر فرمادیں واللہ ثم باللہ مجھے سوائے تصحیح اعتقاد اپنے کے کچھ غرض نہیں ہے نہ مجادلہ وعناد کا خیال ہے اور نہ کسی شے کا واللہ العظیم ثم باللہ العظیم محض لوجہ اللہ تعالیٰ۔ ذرا عبارت آتیہ پر غور امعان فرما کر تفصیل جواب دیویں دو چار مہینہ میں بھی ہو تو کچھ ڈر نہیں والسلام۔

عن ربیعۃ بن کعب قال کنت مع رسول اللّٰہ فاتیتہ بوضوئہ وحاجتہ فقال لی سل فقلت اسالک مرافقتک فی الجنۃ الخ رواہ مسلم مشکوۃ ص ۸۴ مجتبائی از طلاق سوا کہ فرمود سل بخواہ و تخصیص نکرد بمطلوبے خاص معلوم میشود کہ ہمہ بدست ہمت و کرامت اوست ہرچہ خواہد ہر کرا خواہد بان پروردگار خود بدہد اگر خیریت دنیا و عقبیٰ آرزو داری بدرگاہش بیا و ہرچہ میخواہی تمنا کن مرقات میں بھی

اسی مضمون کے مطابق ہے۔ عن ابی حنیف ان اعمراتی النبیؐ فقال یا رسول اللّٰہ ادع اللّٰہ ان یعا فینی قال ان شئیت صبرت فھو خیرلک قال فادعہ فامران یتوضأ فحسن وضوءہ ویدعو بھذ الدعاء اللھم انی اسالک واتوجہ الیک غییک الخ رواہ ترمذی والنسائی و ابن ماجہ والحاکم حرز ثمین حاشیہ حصن حصین مطبوعہ لکھنؤ جوہر منظم میں لکھا ہے استعمل السلف ہذا الدعاء فی حاجاتہم بعد موتہؐ علامہ خفاجی شرح شفا میں لکھتے ہیں و کان بن حنیف ونبوہ یعلمو بہ الناس وقد حکی فیہ حکایات فیھا اجابۃ دعاء من دعابہ من غیر تاخیر۔ عن یدبن علی عن عقبۃ بن عزوان عن النبی انہ قال اذا ضل احدکم شیئاًاو ارادعوناً وھو بارض لیس بھا افلیس فلیقل یاعباد اللّٰہ اعینونی (۳) فان للّٰہ عباد الا لرلھم رواہ البطرانی حرزا الثمین مطبوعہ لکھنئو صفحہ ۱۲۷ حکی لی بعض شیوخنا الکبار فی العلم انفلتت لہ دابۃ اظنھا بغلۃ و کان یعرف ھذا لحدیث فقال لہ حبسبھا اللّٰہ علیھم فی الحال و کنت انا مرۃ مع جماعۃ فانفلتت بھیمۃ وعجزوا عنھا فوقفت فی الحال بغیر سبب من ھذا الکلام ذکرہ النوری فی الاذکار الحرز الثمین صفحہ ۱۲۷ اور آنحضرتؐ کی پھوپھی صفیہؓ سے ثابت ہے انہوں نے بعد وفات آنحضرت کہا ہے الایام رسول اللّٰہ انت رجائنا و کنت بنا براً ولم تک جافیاً و قد قال رسول اللّٰہ اذتم تم فی الامور فاستعینوا من اھل القبور مرقاۃ الوصول صفحہ ۱۵۔ روی عن محمد بن الحسن الشیابی عن ابی یوسف و وکیع ان ابا حنیفہ کان یزورقبر محمد، الجعفر الصادق و یکنس علی بابہ ویعطی المجاورین فتوحاً و یطلب الاستعانہ منہ فی الامور قال الشیخ عبدالقادر من استغاث بی فی کربہ کشفت عنہ و من نادانی باسمی فی شدۃ فرجت عنہ ومن توسل بی الی اللّٰہ تعالیٰ فی حاجۃ قضیت لہ زبدۃ الاثار للشیخ الدھلوی ایسا ہی اخبار الاخیار میں ہے عن بعض اصحاب الشیخ

محی الدین نزلنا فی بریة و لا یقف الاخ علی اخیه من الخوف فلما حملنا الا جمال من اوائل اللیل فقدت اربعه اجمال فلم اجدها فلما نشق الفجر ذکرت قول الشیخ (الذکور قبل) فقلت یا شیخ عبدالقادر جمالی فقدت (۳) ثم التفت الی مطلع الفجر فرایت فی ضوع الفجر من اول مالشق رجلاً شدیدة بیاض الثیاب علی رابیة وهو یشیر الی حکمه ای تعال فلما صعدنا علی الرابیة لم نراحداً ثم رایت الا ربعة الاجمال لحب الرابیة انتهی ملخصاً خلاصة المفاخر للسافعی سیدی احمد بن رزوق که از اعاظم علماء وفقہا ومشائخ مغرب ست گفت روزے شیخ ابوالعباس حضرمی از من پرسید که امداد حی قوی است یا امداد میت من بگفتم که قوی میگونید که امداد حی قویست ومن میگویم امداد میت اقوی ست لیس شیخ گفت نعم زیرا که او در بساط حق ست و در حضرت اوست اشعۃ اللمعات للشیخ الدہلوی حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں وقد تواتر عن کثیر من الاولیئک یعنے ارواحهم انهم ینصرون اولیائهم ویدمرون اعداهم مجدد الف ثانی بعض مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ ہم چنیں ارباب حاجات از اعزہ احیا و اموات در مخادف ومہا لک مدد ہا می طلبیند و می مینیند کہ صورا عزہ حاضر شدہ رفع بلیر ازینہا نمایند فتوی علمای امرتسر صفحہ ۳۷ منہیہ ردالمختار میں ہے قرر الزیادی ان الانسان اذا ضاع له شی وا رادی دالنه علیه فنیقف علی مکان عال مستقبل التربة ویقول یا سیدی احمد بن علوان ان ترد علی ضالتی والانز عتک من دیوان الاولیاء انتهی ملحصاً اما قولهم یا شیخ عبدالقادر فهو نداء واذا اضیف شیا للّٰه فهو طلب شی اکراما للّٰه فما الموجب لحرمته خیر الدین الملی استاد در مختار حضرت محبوب العالم مریدان خود را بعد نماز اجازت خواندن شیئا اللہ یا حضرت سلان...... یکصد و سیزدہ بار دادہ اند کہ برائے ہر حاجت کفایت کنہ خواجہ میرم یہ سب نقول نداء غائبانہ واستغاثت مذکورہ پر صراحۃ اجازت دے رہے ہیں بلکہ احادیث سے اس کا مندوب مستحسن ہونا صریحاً مستفاد ہے اب ان کو

کس طرح کفر وشرک کہا جائے تفصیلاً اس کا جواب رسالہ النّور میں بھیج دیویں والسلام لوجہ اللہ تعالیٰ جواب باصواب مشکور فرماویں اور الزامی اور اسکاتی جواب چونکہ شفا بخش نہیں ہوتے ہیں اس لئے ان سے معاف رکھیں۔

والسلام علیکم

الجواب

واللہ الموفق للصواب۔ سائل کو جزئیات مذکورہ سے جو خلجان پیش آیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ وہ استمداد و استعانت بالغیر کی انواع واقسام سے غالباً واقف نہیں ہے یا واقف ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ علماء اہل سنت تمام صورتوں کو شرک و کفر یا حرام و ناجائز بتلاتے ہیں حالانکہ یہ خیال غلط ہے پس سب سے پہلے اس کو استعانت و نداء بالغیر کی اقسام اور ہر ایک کے احکام سمجھنے چاہئیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ استمداد و استعانت بالغیر یا تو غیر خدا کو مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر ہے یعنی نعوذ باللہ یہ سمجھ کر کسی بشر سے استعانت چاہے کہ اس کے اندر خانہ زاد قدرت ہے کہ وہ جو چاہے خود کر سکتا ہے اور یہ قدرت خدا کی دی ہوئی نہیں ہے یا یہ کہ اس کی قدرت کو خانہ زاد اور مستقل تو نہیں سمجھتا بلکہ خدا کی دی ہوئی سمجھتا ہے مگر اس کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے قدرت حاصل کر لینے کے بعد اب یہ مستقل ہو گیا ہے۔ جس وقت جو چاہے کر سکتا ہے جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے اور جب خداوند کریم نے اس کو یہ قدرت کاملہ عطا فرما دی تو اب سوال کرنا اور دعا مانگنا اور مرادیں چاہنا اسی کے ساتھ مخصوص ہو گیا یا مخصوص نہ ہو مگر خدا سے بھی سوال کرو جب بھی دینے والا وہی غیر ہوگا کیونکہ یہ کام اس کے سپرد ہو چکا ہے۔

پہلے اعتقاد کے صریح کفر ہونے میں تو کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا اعتقاد تو کفار و مشرکین بھی اپنے معبودوں کے ساتھ نہیں رکھتے وہ بھی قادر بالذات اور مستقل قدرت والا خدا تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں چنانچہ زمانہ جاہلیت میں کفار مکہ تلبیہ اس طرح کہتے تھے

﴿لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک الا شریکا ھو لک تملکه وما ملک﴾

''حاضر ہیں اے اللہ ہم حاضر ہیں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے مگر وہ شریک جو کہ آپ ہی کے ہیں آپ اُن کے اور ان کی سب مملوکات کے مالک ہیں۔''

اور قرآن میں بھی جہاں جہاں ان کے اقوال مذکور ہیں سب سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو قادر بالذات ہرگز نہ سمجھتے تھے۔ یَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ، مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ (اصنام) خدا کے یہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں ان کی عبادت ہم صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

دوسری صورت پہلی صورت سے گو بظاہر کم ہے مگر شریعت اسلامیہ نے اس کو بھی شرک وکفر قرار دیا ہے کیونکہ یہ وہی اعتقاد ہے جو کفار ومشرکین اپنے معبودوں کی نسبت رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہی تھا کہ خدا تعالیٰ قادر بالذات ہے مگر اس نے ان اصنام کو اپنی طرف سے قدرت عطا کر دی ہے، جس کے حاصل کر لینے کے بعد اب یہ مستقل ہو گئے جو چاہیں کر سکتے ہیں، جس کو چاہیں نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں اور چونکہ یہ کام ان کے سپرد ہے اس لئے خدا سے بھی دعا کی جائے گی تو وہ بھی اس درخواست کو انہی کے پاس بھیج دے گا جیسے سلاطین دنیا بعض کاموں کو اپنے ماتحت حکام کے سپرد کر دیتے ہیں کہ ان کاموں کے لئے ماتحت حکام ہی سے عرض معروض کی جاتی ہے۔

اور اگر کوئی شخص بلاواسطہ بادشاہ کے پاس اس کام کی درخواست بھیج دے تو بادشاہ اس کو ماتحت حاکم ہی کے یہاں واپس کر دیتا ہے کہ یہ کام ہم نے اس کے متعلق کر دیا ہے وہیں سے اس کا فیصلہ ہوگا۔ شریعت اسلامیہ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ایسے نائب اور ماتحت حکام بالکل نہیں ہیں جو خدا تعالیٰ سے اختیارات حاصل کر لینے کے بعد خود مستقل ہو گئے ہوں۔ سلاطین دنیا کو اپنی کمزوری کی وجہ سے ایسے

نائبوں کی ضرورت ہوتی ہے، خدا کو اس کی ضرورت نہیں۔ تمام امور اسی کے ہاتھ میں ہیں کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز مستقل طور پر نہیں ہے۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ. اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا. لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا. وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَ هُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ. مَنْ ذَالَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ. وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ قَالُوْا وَ لَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ رَحْمَةٍ اه. وَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يابنی عبدمناف انقذوا انفسکم من النار لا اغنی عنکم من اللّٰه شيئا يا بنی عبدالمطلب انقذوا انفسکم من النار لا اغنی عنکم من اللّٰه شيئا يا فاطمه بنت محمد انقذی نفسک من النار لا اغنی عنکَ من اللّٰه شيئا ويا صفية عمة رسول اللّٰه انقذی نفسک من النار لا اغنی عنک من اللّٰه شيئا الحديث وقال صلى اللّٰه عليه وسلم اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطی لما منعت ولا رادلما قضيت ولا ينفع ذا الجد منک الجد. وقال صلى اللّٰه عليه وسلم. انما انا قاسم واللّٰه يعطی وقال تعالیٰ ما يفتح اللّٰه للناس من رحمة فلا ممسک لها وما يمسک فلا مرسل له من احدٍ من بعده. وقال تعالیٰ اِنَّکَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ. وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ

بِمُؤْمِنِيْنَ. اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ الاية وَ مَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ۝﴾

ترجمہ :- ''نہیں ہے حکم مگر اللہ ہی کا اُس نے اس کا حکم کیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ زمین و آسمان میں کوئی نہیں ہے مگر سب کے سب خدائے رحمٰن کے سامنے غلام بن کر حاضر ہوں گے اُس نے سب کو احاطہ کر لیا اور شمار کر لیا ہے۔ اور سب کے سب قیامت کے دن تنہا تنہا آئیں گے۔ اُسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے وہی پناہ دے سکتا ہے اُس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اللہ ہی روزی دینے والا زبردست قوت والا ہے۔ وہ کون ہے جو خدا کے سامنے بدون اس کی اجازت کے شفاعت کر سکے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو اُس کا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کو بھی (آپ کا عمل داخل نہ کرے گا) فرمایا مجھ کو بھی نہیں مگر یہ کہ حق تعالیٰ مجھے مغفرت و رحمت کے ساتھ ڈھانپ لیں۔'' (رواہ البخاری کذا فی تیسیر الوصول (صفحہ ۱۴)

ابن جریر نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آیت و انذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش (کے آدمیوں) کو عام اور خاص طور پر پکارا اور فرمایا کہ اے جماعت قریش تم اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ سے خرید لو (یعنی اُس کے عذاب سے بچا لو) اے کعب بن لوی کی اولاد اے عبد مناف کی اولاد اے جماعت بنی ہاشم اے جماعت بنی عبد المطلب سب کے سب اپنی جانوں کو دوزخ کی آگ سے بچا لو۔ اے فاطمہؓ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی اپنی

جان کو آگ سے بچا لے کیونکہ میں خدا کی قسم اللہ کی طرف سے تمہارے لیے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہاں البتہ تمہارے لیے قرابت کا ایک تعلق ہے جس کے حقوق کو میں پورا کرتا رہوں گا۔

اور ایک روایت میں حضرت عباس اور حضرت صفیہ کا نام بھی ہے۔

اور ایک روایت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کے ساتھ اتنا اور زیادہ ہے سلینی من مالی ماشئت لا اغنی عنک من اللہ شیئا. میرے مال میں سے تم جو چاہو مجھ سے مانگ لو لیکن خدا تعالیٰ (کے عذاب) سے بچانے میں میں تم کو کچھ نفع نہیں دے سکتا اھ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپ شفاعت بھی نہ کریں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ میرے قبضہ میں کوئی چیز نہیں ہے شفاعت وغیرہ بھی حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے اور اُسی کے حکم سے ہو سکتی ہے واللہ اعلم اخرجہ ابن جریر فی تفسیرہ بطریق مختلفہ یشید بعضہا بعضا صفحہ ۷۲، ۷۳ جلد ۱۹۔ ۱۲ مولف۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ جو کچھ آپ دیں اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور جو آپ روک دیں اس کو دینے والا وئی نہیں اور نہ آپ کی قضا و قدر کو کوئی رد کرنے والا ہے اور نہ کسی اقبال والے کو آپ کے مقابلہ میں اُس کا اقبال نفع دے سکتا ہے۔

میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور دینے والا خدا ہی ہے۔ حق تعالیٰ لوگوں کے لیے جس رحمت (کے دروزہ) کھول دے اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں اور جس کو بند کر دیا اس کو چھڑانے والا کوئی نہیں خدا کے سوا۔

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت کر دیتے ہیں۔ اور بہت سے آدمی گو آپ کتنا بھی چاہیں

ایمان والے نہیں۔ کیا یہ لوگ خدا کی رحمت کو خود بانٹنا چاہتے ہیں
ہم نے ہی ان کے درمیان اُن کی معاش کو تقسیم کر دیا ہے (وہ خود
کچھ نہیں کر سکتے)۔

غرض بکثرت نصوص و آیات اس پر دال ہیں کہ کارخانہ الٰہی میں کوئی نبی یا ولی خود مستقل اور مختار کار نہیں ہے البتہ جس طرح حق تعالیٰ نے عام انسانوں کو بعض افعال کی کچھ قدرت عطا کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ افعال شرعاً بندوں کی طرف منسوب ہوتے اور انہی کے افعال شمار ہوتے ہیں۔ جن میں قدرت حاصل کرنے کے بعد بھی وہ سراسر خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ جیسے کھانا پینا چلنا پھرنا، تجارت و حرفت وغیرہ اسی طرح انبیاء و اولیا کو ان کا اعجاز یا کرامت ظاہر کرنے کے لئے عام لوگوں سے کچھ زیادہ قدرت دی ہے۔ جس میں وہ محض آلہ اور سفیر ہوتے ہیں۔ مستقل اور مختار کار نہیں ہوتے۔ پس ایک صورت استمداد و استعانت کی یہ ہوئی کہ غیر خدا سے ایسے امور میں استعانت چاہی جائے جو بظاہر عادۃً انسان کی قدرت میں ہیں مگر اس کو محض آلہ اور ذریعہ اور سفیر سمجھا جائے۔ یہ صورت استمداد زندہ انسان سے بالاتفاق جائز ہے۔ اور چونکہ مرنے کے بعد انسان کو ان امور عادیہ کی قدرت نہیں رہتی جن کی زندگی میں قدرت حاصل تھی۔ اس لئے مرنے کے بعد امور عادیہ میں بھی کسی سے امداد چاہنا خواہ آلہ اور ذریعہ ہی سمجھ کر ہو جائز نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں کسی قدر اس کے استقلال اور با اختیار ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے اور شریعت نے استقلال کے شبہ سے بھی روکا ہے۔ البتہ مرنے کے بعد فیضان روحانی حاصل کرنے میں انبیاء و اولیاء سے استعانت جائز ہے کیونکہ یہ قوت ان کو وفات کے بعد بھی بدلیل کشفی اسی طرح حاصل رہتی ہے۔ جیسے امور عادیہ جسمانیہ کی قوت زمانہ حیات میں ہوتی ہے۔

اور ایک صورت استعانت کی یہ ہے کہ کسی نبی یا ولی سے زندگی میں یا وفات کے بعد ایسے امور میں استعانت و استمداد کی جائے جو عادۃً قدرت بشری سے خارج ہیں مثلاً ان سے اولاد مانگنا بارش وغیرہ طلب کرنا یا شفاء چاہنا یہ بالکل ناجائز ہے۔ کیونکہ ایسی استعانت سے بہت قوی شبہ ان کے استقلال و خود اختیاری کا ہوتا ہے گو استعانت کرنے

والے کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر شریعت اسلامیہ نے ایہام کفر و شرک سے بھی روکا ہے۔ چنانچہ غیر اللہ کی قسم کھانا یا کسی جاندار کی تصویر گھر میں رکھنا اسی لئے حرام ہے کہ اس میں ایہام شرک ہے۔ گو اعتقاد شرک نہ ہو البتہ امور عادیہ و غیر عادیہ میں انبیاء و اولیاء کے ساتھ توسل کرنا جائز ہے۔ یعنی حق تعالیٰ سے دعا کرنا کہ الٰہی فلاں نبی یا ولی کی برکت سے یہ حاجت پوری کر دے۔ محققین کے نزدیک اس کا کچھ مضائقہ نہیں خواہ توسل زندہ کا ہو یا میت کا۔

اور ایک صورت استعانت کی یہ ہے کہ کوئی نبی یا ولی کسی خاص وقت میں باذن الٰہی اپنا اعجاز یا کرامت ظاہر کرنے کے لئے کسی خاص شخص یا جماعت سے یہ فرمادیں کہ فلاں وقت جو شخص یا خاص شخص ہم سے جو حاجت مانگے گا۔ وہ اس کو مل جائیگی۔ یا ہم دیں گے۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ہمارا معجزہ یا کرامت ظاہر کرنے کیلئے اس کی حاجت کو پورا کر دینگے۔ اس صورت میں اگر وہ خاص شخص یا خاص جماعت جس کی نسبت یہ ارشاد ہوا ہے ان سے اپنی حاجت میں امداد چاہی اور اس نبی یا ولی کو محض ذریعہ اور سفیر سمجھے اور حقیقی حاجت روا خدا تعالیٰ کو خیال کرے تو یہ صورت بھی جائز ہے۔ اور چونکہ کرامت و اعجاز میں خلاف عادت امور ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ان میں طاقت بشریہ کو کچھ دخل نہیں ہوتا وہ فعل محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزۃً یا کرامۃً صادر ہوتا ہے۔ نبی یا ولی کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ البتہ اس سے نبی یا ولی کی صداقت اور ان کا مقرب الٰہی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ خارق عادت کا استمرار ضروری نہیں اس لئے ایسی استعانت مستمراً جائز نہ ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ استعانت و استمداد بالغیر کی آٹھ صورتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ ماسوائے خدا کو خواہ کوئی ہو قادر بالذات سمجھ کر اس سے مدد چاہنا

(۲) یہ کہ قادر بالذات تو نہ سمجھے بلکہ اس کی قدرت کو خدا کی دی ہوئی جانے مگر یہ اعتقاد رکھے کہ خدا سے قدرت حاصل کر کے یہ مستقل اور خود مختار ہو گیا ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

(۳) یہ کہ اس کو محض آلہ اور ذریعہ سمجھے اور حاجت روا حق تعالیٰ کو سمجھے اس کی

چند صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس اعتقاد کے ساتھ کسی زندہ سے امور عادیہ میں (جو عادۃً و شرعاً انسان کا فعل شمار ہوتے ہیں) امداد چاہے اور یوں کہے کہ اے فلاں تم میرا یہ کام کر دو یا مجھے روپیہ پیسہ دیدو۔

(۴) کسی زندہ سے امور غیر عادیہ میں (جو عادۃً و شرعاً انسان کی قدرت سے خارج ہیں اور اس کا فعل شمار نہیں ہوتے، اعانت طلب کرے مثلاً یوں کہے کہ اے مرشد مجھ کو اولاد دیدو۔

(۵) کسی نبی یا ولی سے بعد وفات کے روحانی فیض حاصل کرنے میں مدد چاہے۔

(۶) ان سے بعد وفات کے امور غیر عادیہ میں یا ایسے امور عادیہ میں جو مرنے کے بعد انسان کی طاقت سے باہر ہو جاتے ہیں مدد چاہے۔ مثلاً یوں کہے کہ اے نبی یا ولی میرے مقدمہ میں تم میری امداد کرو یا مجھ کو مرض سے شفا دو یا مجھے اولاد دیدو وغیرہ وغیرہ۔

(۷) امور عادیہ و غیر عادیہ میں کسی نبی یا ولی حی و میت کے توسل سے دعا کرے یا ان سے دعا و شفاعت کی درخواست کرے۔

(۸) جب کوئی نبی یا ولی اعجاز یا کرامت کے طور پر کسی سے کہے کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اس وقت ان سے اپنی حاجت مانگے خواہ وہ امور عادیہ سے ہو یا غیر عادیہ سے۔ ان کا حکم یہ ہے کہ صورت اول و دوم تو شرک ہے اور تیسری صورت باتفاق اہل تحقیق جائز ہے اور چوتھی صورت ناجائز ہے۔ مگر اعجاز و کرامت کے اظہار کا وقت اس سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ نمبر ۸ میں آتا ہے اور پانچویں صورت باتفاق جائز ہے اور چھٹی صورت ناجائز ہے اور ساتویں ایک محقق کے نزدیک اور آٹھویں صورت بھی جائز ہے الغرض چار صورتیں جائز اور چار ناجائز ہیں اور جو صورتیں جائز ہیں وہ اسی شرط کے ساتھ جائز ہیں کہ حاجت روا خدا تعالیٰ کو سمجھے اور نبی یا ولی کو ذریعہ اور وسیلہ خیال کرے۔ اسی طرح نداء بالغیر میں بھی تفصیل ہے۔

(۱) یہ کہ زندہ کو قریب سے پکارے۔

(۲) زندہ کو غائبانہ پکارے پھر اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ محض شوق اور محبت میں ایسا کرے۔ پکارنا مقصود نہ ہو۔

(۳) یہ کہ اعتقاد یہ ہو کہ وہ دور سے بھی سنتے ہیں پہلی دو صورتیں جائز اور تیسری حرام ہے یہی تفصیل وفات کے بعد پکارنے میں ہے۔

(۱) یہ کہ نبی یا ولی کے مزار پر جا کر ان کو پکارے۔

(۲) یہ کہ دور سے ان کو پکارے مگر مقصود پکارنا نہ ہو بلکہ محض محبت وشوق کے غلبہ میں ایسا ہو جائے۔

(۳) یہ کہ اعتقاد ہو کہ وہ دور سے بھی سنتے ہیں۔

(۴) یہ کہ غائبانہ ندا کرے مگر مقصود نہ پکارنا ہے نہ غلبہ شوق ومحبت ہے بلکہ کسی دعا میں ان کا نام بصیغہ ندا مذکور ہے اس کو دعا سمجھ کر ویسے ہی پڑھتا ہے۔

ان میں صورت اول باتفاق محققین جائز ہے۔ بشرطیکہ مزار کے پاس جا کر ندا میں استعانت محرمہ کا قصد نہ ہو۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ بلکہ محض سلام وغیرہ کے طور پر ندا ہو اور دوسری صورت بھی باتفاق جائز ہے اور تیسری صورت ناجائز ہے کہ عقیدہ شرک ہے چوتھی صورت اس شرط سے جائز ہے کہ وہ صیغہ ندا کسی آیت یا حدیث میں وارد ہوا ہو جیسا کہ تشہد میں السلام علیک ایہا النبی بصیغہ ندا مذکور ہے۔

اس تفصیل سے امید ہے کہ سائل کے شبہات زائل ہو گئے ہونگے۔ مزید اطمینان کیلئے ہم ان تمام جزئیات پر بھی کلام کرتے ہیں جن سے اس کو خلجان پیش آیا ہے مگر مقدمہ کے طور پر سائل کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ استمداد واستعانت بالغیر جس کو ہم منع کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نبی یا ولی سے یوں کہا جائے کہ تم میری یہ حاجت پوری کردو، تم میرا یہ کام بنا دو اور اگر ان سے اس طرح نہ کہے بلکہ خدا تعالیٰ سے ان کے توسل سے دعا کرے یا ان سے یہ کہے کہ تم میرے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرو، جبکہ ان کا دعا کرسکنا مشاہدہ یا نص سے ثابت ہو۔ یہ استمداد ہمارے نزدیک ناجائز نہیں اور

درحقیقت اس کو استمداد کہنا ہی مجاز ہے۔ دراصل یہ صورت توسل کے نام سے موسوم ہے۔ جس کو کوئی ناجائز نہیں کہتا۔

پس سائل نے سب سے پہلے جو حدیث ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ کی پیش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وضو کیلئے پانی اور ضروریات کی چیزیں حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن حضورؐ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ جنت میں آپ کی رفاقت مجھے نصیب ہو قال او غیر ذلک قال هو ذالک قال فاعنّی علی نفسک بکثرة السجود . اھ۔ مسلم (ج ا ص ۱۹۳) آپؐ نے فرمایا کہ اس کے سوا اور کچھ مانگو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو بس یہی مانگتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اپنے نفس کے حق میں کثرت سجود سے تم میری مدد کرو۔ اھ۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی چیز کی درخواست کی جو عادۃً قدرت بشری سے خارج ہے یعنی جنت میں رفاقت مگر تفصیل گزشتہ میں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جو صورت استمداد اس حدیث میں مذکور ہے وہ آٹھویں قسم میں داخل ہے۔ جس کو ہم جائز کہتے ہیں۔ ناجائز نہیں کہتے علاوہ ازیں ربیعہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے آپ کا یہ فرمانا کہ مانگو اس کا مطلب محاورہ کے موافق تو یہی ہے کہ جو چیز ہم دے سکتے ہیں وہ مانگو چنانچہ بعض دفعہ سلاطین دنیا بھی اپنے خدام سے ایسا کہہ دیا کرتے ہیں کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ جس کا مطلب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جو چیز ہمارے قبضہ قدرت میں ہے، وہ مانگو یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ جو چاہو مانگو سب ہمارے قبضہ میں ہے۔

پس اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ حضورؐ کے قبضہ میں سب کچھ ہے آپ جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ رہا یہ کہ پھر ربیعہ اسلمی نے ایسی درخواست کیوں کی اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو قرینہ حال سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس وقت سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص وقت ہے کہ آپ نے بدون کسی قید کے یہ ارشاد فرما دیا

کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس وقت میں جو کچھ مانگ لوں گا حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مجھے ضرور عطا فرما دینگے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی درخواست کی جو حضور کے اختیار سے باہر اور محض خدا تعالیٰ کی قدرت میں داخل تھی۔ کیونکہ صحابی جانتے تھے کہ میرا سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محض ظاہری طور پر ہے۔ ورنہ حقیقت میں میرا سوال حق تعالیٰ سے ہے اور اس کی قدرت میں سب کچھ ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ذریعہ اور وسیلہ اور دعا و شفاعت فرمانے والے ہیں۔

چنانچہ یہ حقیقت حضورؐ کے آئندہ کلام سے اچھی طرح واضح ہوگئی۔

﴿قال فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود﴾

''کہ تم کثرت سجود سے اپنے نفس کے حق میں میری مدد کرو۔''

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ درخواست میرے قبضہ سے باہر ہے ہاں میں اس کے لئے دعا و شفاعت سے کوشش کرونگا اور تم کثرت سجود کے ساتھ کوشش کرتے رہنا۔ اس حدیث سے یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے کہ جس کو چاہیں داخل کر دیں۔ اگر آپ کو اختیار تام ہوتا اور کوئی حالت منتظرہ باقی نہ ہوتی تو اس قید کی کیا ضرورت تھی۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اختیار تام حاصل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو مومن اور جنتی کیوں نہ بنا دیا۔ بلکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو جنتی بنانے کی بہت ہی کوشش کی مگر ان کی قسمت میں جنت نہ تھی۔ اس لئے آپؐ کی کوشش کارگر نہ ہوئی اور آپ کو اس کے خاتمہ کفر سے رنج بھی ہوا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ﴾

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾

''تو شاید آپ اپنے آپ کو اس وجہ سے ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

پس اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ نصوص قرآنیہ کے بالکل خلاف ہے وہاں تو صاف تصریح ہے۔

﴿قُلْ لاَّ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعاً وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ﴾

''اے رسول فرما دیجئے کہ میں اپنے لئے (بھی) کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں ہاں مگر جو خدا چاہے''

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی جنت میں اپنے عمل سے نہ جائیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی اپنے عمل سے نہ جاؤں گا۔ ہاں مگر یہ کہ خدا کا فضل و رحم مجھے ڈھانپ لے۔ غرض بکثرت نصوص موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت و دوزخ میں بھیجنے کا اختیار بجز خدا کے کسی کو نہیں۔ ہاں انبیاء و اولیاء باذن الٰہی شفاعت و دعا مومنین کے واسطے کریں گے۔ جو دربارِ الٰہی میں قبول ہو کر ان حضرات کے اعزاز و تقرب کی دلیل ہوگی۔

پس ربیعہ اسلمی کے سوال سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض اوقات ایسی حالت ہوتی تھی کہ اس وقت آپ جس کے لئے جو دعا فرما دیتے تھے وہ بطور اعجاز کے قبول ہو جاتی تھی۔ جس کا دوام و استمرار نہ ضروری ہے نہ اس پر کوئی دلیل ہے۔ بلکہ اس کے خلاف پر دلائل قائم ہیں کہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض دعائیں قبول نہیں ہوئیں اور حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ و علی قاریؒ کا بھی یہی مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاقید جو یہ فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ خاص حالت نصیب تھی کہ جس کے لئے آپ جو دعا

فرماویں گے قبول ہو جائے گی۔ باقی دعا و شفاعت کے سوا اختیار تام حاصل ہونا یہ مطلب شیخ کا ہرگز نہیں۔ چنانچہ اسی جگہ باذن پروردگار خود کے لفظ سے اس کی نفی ہوگئی ہے۔

اور کتاب الجہاد اشعۃ اللمعات میں تو حضرت شیخ نے اس مطلب کو بخوبی واضح کر دیا ہے ونصہ ہذا چہ میخواہند ایشاں باستمداد وامداد کہ ایں فرقہ منکر اند آنرا آنچہ با می فہمیم ازاں ایں است کہ داعی محتاج فقیر الی اللہ دعا میکند خدارا وطلب می کند حاجت خود را از جناب عزت وغنائے وے وتوسل می کند بروحانیت ایں بندۂ مکرم ومقرب در درگاہ عزت ومیگوید خداوندا بہ برکت ایں بندہ کہ رحمت کردۂ بروئے واکرام کردۂ اور ابلطف وکرمی کہ بوے داری۔ برآوردہ گردان حاجت مرا کہ تو معطی نہ کریمی۔ یا ندای کند ایں بندۂ مکرم و مقرب را کہ اے بندہ اے ولی وے شفاعت کن مرا بخواہ از خدا کہ بدہد مسئول ومطلوب مرا و قضا کند حاجت مرا پس معطی ومسئول پروردگار ست تعالیٰ وتقدس ونیست ایں بندہ درمیان مگر وسیلہ ونیست قادرہ فاعل ومتصرف در وجود مگر حق سبحانہ و اولیائے خدا فانی و ہالک اند در فعل الٰہی وقدرت وسطوت دے ونیست ایشاں را فعل وقدرت تصرف نہ اکنوں کہ در قبور اند نہ در ہنگام کہ زندہ بوند در دنیا واگر ایں معنی کہ در امداد واستمداد ذکر کردہ ایم موجب شرک وتوجہ بما سوائے حق باشند چنانکہ منکر زعم می کند پس باید کہ منع کردہ شود توسل وطلب دعا از صالحان و دوستان خدا در حالت حیات نیز وایں ممنوع نیست بلکہ مستحسن ومستحب است باتفاق وشائع است در دین۔ اھ

اس میں صاف تصریح ہے کہ قادر ومختار و فاعل ومتصرف حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور انبیاء واولیا و دوستانِ خدا فعل وسطوت وقدرت الٰہی میں ہالک اور فانی ہیں ان کا کچھ بھی فعل وتصرف نہیں ہوتا بلکہ وہ محض دعا وشفاعت کرتے ہیں نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت شیخ جس استمداد کو جائز فرماتے ہیں وہ وہی ہے۔ جس کو توسل کہا جاتا ہے اور اس کو علماء اہل سنت منع نہیں کرتے بلکہ اس کے منکر غیر مقلدین فرقہ وہابیہ ہیں۔

اس کے بعد سائل نے حضرت عثمان بن حنیف کی روایت نقل کی ہے کہ ایک

نابینا شخص نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے حق تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ مجھ کو شفا عطا فرمائے آپ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو صبر کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر چاہو تو میں دعا کر دوں۔ اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا ہی فرما دیجئے چنانچہ آپ نے اس کو حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کر کے دو رکعتیں پڑھے اور اس دعا کو پڑھ کر حق تعالیٰ سے درخواست کرے۔

﴿اللهم انی اسئلک و اتوجه الیک بمحمد نبی الرحمة یا محمد انی قد توجهت بک الی ربی فی حاجتی هذه لتقضی. اللهم فیشفعه فی قال ابو اسحق هذا حدیث صحیح رواه ابن ماجة و اللفظ له و الترمذی وقال حسن صحیح و صححه البیهقی وزاد فقام و قد ابصرا﴾ (ابن ماجه مع انجاح الحاجة (ص. ۱)

اس حدیث سے استمداد متعارف پر استدلال کرنا تو کسی طرح ممکن نہیں تفصیل گزشتہ میں غور کر لینے کے بعد ہر عاقل اقرار کرے گا کہ اس میں درخواست دعا اور توسل سے زیادہ کوئی بات نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں الفاظ حدیث (الٰہی میں تجھ سے سوال کرتا اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ بوسیلہ تیرے نبی محمد نبی الرحمۃ کے صلی اللہ علیہ وسلم) یہ تو خدا سے سوال ہے بوسیلہ سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اگلا لفظ اللّٰهم فیشفعه فیّ الٰهی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما) طلب شفاعت میں بالکل ہی صاف اور ظاہر ہے اور توسل یا طلب دعا و شفاعت کو ہم ہرگز منع نہیں کرتے اس کو استعانت و استمداد متعارف سے کیا واسطہ استعانت تو جب ہوتی کہ آپ سے سوال ہوتا یہاں تو خدا سے سوال ہے وہی دینے الا ہے پس یہ تو صاف توسل کی صورت ہوگئی پھر آگے اور بھی صاف ہے۔

﴿یا محمد انی اتوجه بک الی ربی فی حاجتی هذه لتقضی﴾

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے ذریعہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری حاجت پوری ہو جائے۔''

رہا یہ کہ اس حدیث میں آپ کو ندا ہے اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ ندائے بعید نہیں بلکہ ندائے قریب ہے کیونکہ وہ نابینا مسجد نبوی میں یہ دعا کر رہا تھا اور حضور صلی للہ علیہ وسلم بھی قریب ہی وہاں تشریف فرما تھے تو جس وقت اس نے حضور کا نام بصیغۂ ندا لیا ہوگا اس وقت آپ نے بھی بطور شفاعت کے دعا فرما دی ہوگی لہٰذا اس میں تو کچھ بھی اشکال نہیں ہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ طبرانی وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف نے بعد وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک شخص کو یہ دعا صیغہ ندا ہی کے ساتھ تعلیم فرمائی ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ندا کی چوتھی قسم میں داخل ہے جس کو جائز کہتے ہیں کہ ندا غائبانہ ہو مگر ندا کا قصد نہ ہو بلکہ کسی دعا میں آیت یا حدیث سے ندا کا صیغہ ثابت تھا اس کو اسی طرح دعا سمجھ کر پڑھ دیا دوسرے یہ ایک صحابی کا فعل ہے اور فعل صحابی اگر اصول شرعیہ کے خلاف ہو تو اس سے احتجاج نہیں ہوسکتا بلکہ خود اسی میں تاویل کی جائے گی کیونکہ صحابی سے غلطی اجتہادی ہو جانا ممکن ہے اور وصال نبوی کے بعد آپ کو ندا کرنا اصول شرعیہ کے خلاف ہے چنانچہ اسی لئے بعض صحابہ وصال نبوی کے بعد تشہد میں بجائے **السلام علیک ایھا النبی** کے صرف **السلام علی النبی** بحذف ندا کہتے تھے۔

﴿قال عبدالرزاق اخبرنا ابن جریج اخبر نی عطاء ان الصحابةؓ کانوا یقولون والنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حی السلام علیک ایھا النبی فلما مات قالوا السلام علی النبی وھذا اسناد صحیح . اھ (فتح الباری، صفحہ ۲۶ ج ۲)

عبدالرزاق کو ابن جریج نے خبر دی کہ ان سے عطاء بن ابی رباح نے فرمایا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سید نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو **السلام علیک ایھا النبی** (تشہد میں) کہتے تھے (کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام نازل

ہو) پھر جب آپ کا وصال ہو گیا تو وہ السلام علی النبی کہنے لگے (کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام نازل ہو یعنی حرف ندا کو حذف کر دیا) یہ سند صحیح ہے۔ اور درحقیقت اصول شرعیہ کے موافق قیاس کا مقتضی یہی تھا جو ان بعض صحابہ نے کیا لیکن علماء مذہب نے تشہد میں اس قیاس کو اس لئے ترک کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ فرمائی ہے جیسا کہ آپ قرآن کی سورت تعلیم فرمایا کرتے تھے تو جس طرح آیات قرانیہ میں جا بجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصیغۂ ندا یاد کیا گیا ہے مثلاً يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط و امثالها اور آیات میں تغیر و تبدل جائز نہیں اسی طرح تشہد میں بھی تغیر کو پسند نہیں کیا گیا چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس کے جواب میں اسی امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

﴿روی سعید بن منصور من طریق ابی عبیدة بن عبداللہ بن مسعود عن ابیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم علمھم التشھد فذکرہ قال فقال ابن عباس انما کنا نقول السلام علیک ایھا النبی اذ کان حیًّا فقال ابن مسعود ھکذا علّمنا وھکذا نعلم اھ (ذکرہ الحافظ فی الفتح ایضاً ص ۲۶، ج ۲ و اعلّہ بان ابا عبیدة لم یسمع من ابیک قلت قد صحح الدارقطنی احادیثہ عن ابیہ فاما ان ثبت عندہ سماعہ منہ او عرف ان الواسطة بینھما ثقة﴾

''سعید بن منصور نے ابوعبیدہ کے واسطے سے روایت کی ہے کہ وہ اپنے والد بزرگ عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تشہد (اس طرح) تعلیم فرمائی پھر اس کو بیان کیا ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ اس پر عبداللہ بن عباس نے یہ کہا کہ ہم تشہد میں السلام علیک ایھا النبی اس وقت کہتے

تھے جبکہ حضور زندہ تھے۔''

(مطلب یہ تھا کہ اب صیغۂ ندا حذف کردینا چاہیے) عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ ہم کو اسی طرح تعلیم دی گئی ہے اور اس طرح ہم تعلیم دیں گے۔ اھ۔

مگر ظاہر ہے کہ جو دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا صحابی کو تعلیم فرمائی تھی اس میں تشہد کے برابر اہتمام تعلیم نہ تھا لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس میں سے حرف ندا کو حذف نہ کیا جائے۔ نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد کی عام تعلیم فرمائی تھی جہاں بعض مصلین یقیناً بعید و غائب تھے اس سے اس ندا کا جواز نص سے ثابت ہوتا ہے بخلاف حدیث اعمیٰ کے کہ آپ کی تعلیم عام نہ تھی۔ یہاں قیاس پر عمل کیا جاوے گا علاوہ ازیں یہ کہ طبرانی و بیہقی کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس شخص کو یہ دعا تعلیم فرمائی تھی اس سے یہ بھی فرمایا تھا کہ میضاۃ پر جا کر وضو کرو پھر مسجد میں جا کر دو رکعتیں پڑھو پھر اس دعا کے ذریعہ سے اپنی حاجت خدا سے مانگو۔ جس سے متبادر یہی ہے کہ آپ نے اس کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا اور وہاں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اسی طرح تشریف فرما ہیں جس طرح بزمانۂ حیات تھے تو اس صورت میں ندا غائب بھی لازم نہیں آتی۔

﴿روی الطبرانی فی الکبیر الحدیث بطوله وفیه فقال له ان حنیف ائت المیضأة فتوضأ ثم ائت المسجد فصل رکعتین ثم قل اللهم انی اسئلک الخ و رواه البیهقی من طریقین نحوه و اخرج الطبرانی فی الکبیر والاوسط بسند فیه روح بن صلاح و ثقه ابن حبان و الحاکم و فیه ضعف وبقیة رجاله رجال الصحیح اھ ملخصا بجاح الحاجة (ص ۱۰۰) قلت والاختلاف فی التوثیق لایضر﴾

اور اگر کسی نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی قید بھی نہ لگائی ہو تو ممکن ہے کہ اس نے لفظ ندا کو باتباع لفظ وارد استعمال کیا ہو اور ندا کا قصد نہ ہو جیسا کہ تشہد میں بھی محض اتباع لفظ وارد کی وجہ سے ندا کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور ندا کا قصد نہیں ہوتا۔ پس یہاں چونکہ حدیث میں بصیغۂ ندا تعلیم واقع ہوئی ہے اس میں تو گنجائش ہے دوسری جگہ استعمال ندا کی کیا دلیل ہے اگر کوئی یہ کہے کہ ہم سب کو عثمان بن حنیف کے فعل پر قیاس کر لیں گے اس کا جواب ظاہر ہے کہ ان کا فعل خود خلاف قیاس ہے جس پر قیاس صحیح نہیں پھر انہوں نے محض لفظ حدیث کی اتباع کی بناء پر خاص ایسی دعا میں ایسا کیا ہے اور تم جو دوسرے اقوال میں ندا کرتے ہو اس میں تعلیم نبوی کا کون سا اتباع ہے پھر سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں امت کا سلام و پیام پہنچانے کے لئے فرشتے مامور ہیں ممکن ہے کہ سلف نے صیغۂ ندا کو اسی خیال سے اس دعا میں استعمال کیا ہو کہ فرشتے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیں گے اور ان کا قصد ندا کا نہ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو ندا کرنے میں یہ تاویل بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ خصوصیت کسی اور کے لئے ثابت نہیں اس کے بعد سائل نے تیسری حدیث زین بن علی کی پیش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی راستہ بھول جائے یا جنگل بیابان میں جہاں کوئی آدمی نہ ہو اسے کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو تو وہ **یا عباد اللّٰہ اعینونی** کہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے بندے ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے وہ اس کی امداد کر دیں گے۔

اس سے بعض لوگوں نے ندا غائب کے جواز پر استدلال کیا ہے مگر اولاً گزارش یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے جس سے احتجاج نہیں ہو سکتا کیونکہ حدیث ضعیف پر اس وقت عمل جائز ہے جبکہ وہ اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس حدیث میں ندا غائب مذکور ہے تو اصول حدیث وفقہ کے مطابق ہم کو یہ عرض کرنے کا حق ہے کہ حدیث ضعیف سے احکام ثابت نہیں ہو سکتے بالخصوص جبکہ وہ اصول شرع کے خلاف وارد ہوں۔ عزیزی شرح جامع صغیر میں اس حدیث کو عبداللہ بن مسعود کی روایت سے نقل

کر کے کہا ہے **قال الشیخ حدیث ضعیف** اھ (صفحہ ۵ جلد ۱)

اور حاشیہ حصن حصین میں جو لکھا ہے **قال بعض العلماء الثقات حدیث حسن یحتاج الیه المسافرون** اھ (صفحہ ۱۲۷)

سو اس سے تحسین بقاعدۂ محدثین مراد نہیں بلکہ مجرب ہونے کے اعتبار سے تحسین مراد ہے یہ حدیث مسافروں کے لئے کارآمد ہونے کے اعتبار سے عمدہ ہے اور اگر بقاعدۂ روایت ہی تحسین مراد ہو تو چونکہ ان بعض علماء ثقات کا نام معلوم نہیں اس لئے ایسی مجہول تحسین اثبات احکام کے لئے کافی نہیں۔ پھر بعد تسلیم صحت اس حدیث سے نداء غائب کا جواز کسی طرح نہیں نکل سکتا کیونکہ حدیث سے یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ وہ عباد اللہ کہاں ہیں اس کے قریب ہیں یا بعید ہاں اتنا معلوم ہوا کہ یہ ان کو دیکھتا نہیں مگر ظاہر ہے کہ متکلم کا نہ دیکھنا مخاطب کے قرب و بعد یا سماع و عدم سماع کی دلیل نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ عبداللہ بن مسعود کی روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ وہ عباد اللہ جنگل ہی میں حاضر ہوتے ہیں۔

﴿کما فی الجامع الصغیر مع العزیزی اذا انفلتت دابة احدکم بارض فلاةٍ فلیناد یا عباد اللّٰه احبسوا علیَّ فان للّٰه فی الارض حاضراً سیحبسه علیکم ع و ابن السنی طب عن ابن مسعود قال الشیخ حدیث ضعیف اھ ای رواه ابو یعلی و ابن السنی والطبرانی عن عبدالله.﴾

شارح عزیزی لفظ حاضراً کی شرح میں لکھتے ہیں۔

﴿خلقا من خلقه انسیا او جنیا او ملکاً لا یغیب﴾ اھ (ص ۱۰۵ جلد ۱)

''یعنی زمین میں اللہ کی بعض مخلوق ایسی ہے جو غائب نہیں ہوتی خواہ وہ انسان ہوں یا جن یا فرشتے۔''

پس اب تو کسی طرح اس کو ندا غائب نہیں کہا جا سکتا رہا یہ کہ اس میں مخلوق سے

طلب اعانت ہے اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ استعانت زندہ مخلوق سے امور عادیہ میں ہے (جو عادۃً قدرت بشری یا جنی یا ملکی میں داخل ہیں مثلاً بھاگے ہوئے جانور کو روک دینا یا گم شدہ چیز کو تلاش کر دینا یا رستہ بتلا دینا وغیرہ) اور ایسی استعانت ہمارے نزدیک جائز ہے جیسا کہ تفصیل گزشتہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ اس حدیث سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ غائبین سے یا مردوں سے بھی دنیوی حاجات میں بالخصوص امور غیر عادیہ میں استعانت جائز ہے۔ اس کے بعد سائل نے یہ اشکال پیش کیا ہے کہ حضرت صفیہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی نے آنحضرت سے بعد وفات کے کہا الا یا رسول اللّٰہ کنت رجاء نا الخ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو انہوں نے یہ اشعار روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر کہے تھے جس میں ندا غائب کا احتمال ہی نہیں اور اگر غائبانہ بھی ہو تو اشعار میں محبوب کو خطاب ہمیشہ اظہار شوق ومحبت وغیرہ کے لئے کیا جاتا ہے اس سے ندا مقصود نہیں ہوتی پھر اس جواب کی ضرورت بھی اس وقت ہے جبکہ حضرت صفیہ سے ان اشعار کا ثبوت بقاعدہ محدثین ہو جائے ورنہ محض اہل سیر کی روایت سے احکام کا ثبوت یا رد نہیں ہو سکتا اس کے بعد سائل نے یہ حدیث جواز استعانۃ من اہل القبور کی دلیل میں پیش کی ہے۔

﴿قال رسول الله صلی اللّٰه علیه وسلم اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا من اهل القبور.﴾

مگر سائل نے اس کے ثبوت وصحت کی کوئی دلیل نہیں لکھی لہٰذا سب سے پہلے اس کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ یہ حدیث بقاعدۂ محدثین صحیح ہے اور محض شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کا بلا سند نقل کر دینا صحت کی دلیل نہیں کیونکہ حضرت شیخ قدس سرہ اس باب میں بہت متساہل ہیں۔ پھر بتقدیر تسلیم ثبوت اس پر کیا دلیل ہے کہ اس حدیث میں استعانت کے یہ معنے ہیں کہ مردوں سے اپنی حاجات مانگا کرو۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے توسل مراد ہے کہ اموات کے وسیلہ سے دعا کیا کرو اور تخصیص اموات کی وجہ غالباً یہ ہے جو صحاح میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے۔

﴿ان الحی لایؤمن علیه الفتنة﴾

''کہ زندہ آدمی پر فتنہ کا اندیشہ رہتا ہے''

اور جو لوگ ایمان پر وفات پا چکے ہیں ان پر یہ اندیشہ نہیں نیز یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جب تم کسی امر میں پریشان ہو تو زیارت قبور سے اعانت حاصل کیا کرو کیونکہ زیارت قبور سے تم کو آخرت اور موت کی یاد تازہ ہوگی جس سے اعمال صالحہ کی طرف رغبت بڑھے گی اور یہ رحمت الٰہی کا سبب ہو جائے گا اس صورت میں اس حدیث کا وہی حاصل ہوگا جو آیت واستعینوا بالصبر و الصلوۃ کا حاصل ہے اس کے بعد سائل نے امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ بلا سند نقل کیا ہے کہ آپ امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے مزار پر جاتے اور اس کے دروازہ پر جھاڑو دیتے اور مجاوروں کو بخشش عطا فرماتے اور امام رحمہ اللہ سے اپنے کاموں میں استعانت کرتے تھے۔ اھ۔ اس کے متعلق بھی یہ عرض ہے کہ اس میں کوئی لفظ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان سے یہ عرض کرتے تھے کہ آپ میرا یہ کام کر دیجئے بلکہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق یہاں بھی استعانت سے محض توسل مراد ہے کیونکہ حضرت شیخ نے صاف صاف بیان فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک استعانت اور استمداد چاہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے بوسیلہ بندہ مقرب دعا کی جائے یا اس بندۂ مقرب سے یہ عرض کیا جائے کہ وہ حق تعالیٰ سے دعا کرے سو اس کو ہم بھی منع نہیں کرتے اور یہ جواب اس وقت ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کا یہ واقعہ بسند صحیح ثابت ہو جائے جو کہ تقریباً ناممکن ہے کیونکہ زمانہ تابعین و تبع تابعین تک مزاروں پر مجاوروں کے رہنے اور ان کو بخشش وغیرہ دینے کی بدعت شروع نہ ہوئی تھی لہٰذا غالب گمان یہ ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اسی طرح سائل نے زبدۃ الآثار للشیخ دہلوی سے حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿من استغاث بی فی کربته کشفت عنه و من نادانی باسمی فی شدةٍ فرجت عنه و من توسل بی الی اللّٰہ تعالیٰ فی حاجة قضیت له. اھ۔

ہمارے نزدیک یہ بھی سراسر موضوع ہے اور حضرت شیخ عبدالحقؒ کا بلا سند اس کو

نقل کر دینا حجت نہیں جب تک کہ حضرت شیخ سے غوث اعظمؒ تک سلسلہ روایت پھر ان راویوں کا ثقہ ہونا ثابت نہ ہو کیونکہ فاضل سائل کو یہ بات اوپر معلوم ہو چکی ہے کہ اثبات احکام کیلئے حدیث ضعیف بھی کافی نہیں۔ نیز اگر حدیث ضعیف اصول شرعیہ کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں۔ پھر ائمہ و اولیاء اللہ کے اقوال و افعال سے احکام کا ثبوت کیونکر ہوسکتا ہے جبکہ وہ بلا سند ہوں یا سند ضعیف سے ثابت ہوں۔

پس اب دو صورتیں ہیں اگر اصول سے کام لیا جائے تو ان بلا سند اقوال وافعال کو رد کر دینا چاہیے اور اگر مصنفین کے ساتھ حسن ظن سے کام لیا جائے تو ان اقوال و افعال کو صحیح محمل پر محمول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ بتقدیر تسلیم ہمارے نزدیک حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اپنی مصیبت میں خدا تعالیٰ سے میرے وسیلہ سے فریاد کرے گا۔ اس کی مصیبت دور ہو جائیگی اور جو کوئی میرا نام لیکر خدا تعالیٰ سے اپنی تکلیف میں دعا کرے گا اس کی تکلیف زائل ہو جائے گی۔

چنانچہ اگلا فقرہ **ومن توسل بی الی اللّٰہ تعالیٰ فی حاجۃ قضیت لہ** (جو کوئی اپنی حاجت کیلئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں مجھ سے توسل کرے اس کی حاجت پوری ہو جائے گی)۔ اس مطلب پر قرینہ ظاہرہ ہے اور ہمارے نزدیک اس عبارت میں کشفت وفرجت وقضیت یہ تمام الفاظ بصیغۂ مونث ہیں بصیغہ تکلم نہیں ہیں اور اگر صیغہ تکلم کو بھی صحیح مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں اپنی قدرت وتصرف سے ایسا کروں گا۔ کیونکہ شیخ عبدالحقؒ کی عبارت میں یہ امر صاف طور پر مذکور ہے کہ اولیاء کیلئے نہ اس وقت قدرت تصرف کسی فعل کی ثابت ہے جبکہ وہ قبروں میں ہیں اور نہ اس وقت ثابت تھی جبکہ وہ زندہ تھے بلکہ قادر و فاعل و متصرف ہر فعل میں حق تعالیٰ شانہ ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس مصیبت وکلفت کے زائل ہونے اور حاجت پوری ہونے کے لئے دربار الٰہی میں دعا و سفارش کرونگا۔ جس سے انشاء اللہ وہ مصیبت زائل اور حاجت پوری ہو جائے گی اور ناداني یا سمی سے نداء غائب پر استدلال نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میرا نام لیکر خدا سے دعا کرے۔ جس کا حاصل وہی ہے کہ مجھ سے توسل

کرے اور خدا تعالیٰ سے سوال کرے اور مجھ کو ذریعہ واسطہ وسیلہ قرار دے

چنانچہ دوسری جگہ یہ الفاظ صاف مذکور ہیں۔ ویذکر اسمی ویذکر حاجۃ فانھا تقضی باذن اللّٰہ تعالیٰ[1] یعنی میرا نام لے اور اپنی حاجت کو ذکر کرے تو وہ خدا کے حکم سے پوری ہو جائیگی (برکات الامداد ص ۱۹) رہا یہ کہ حضرت غوث اعظم کے بعض مریدوں نے ایک مرتبہ خوفناک جنگل میں یا شیخ عبدالقادر جمالی فقدت (اے شیخ عبدالقادر میرے اونٹ کھو گئے) کہا تھا سو اس میں اول تو وہی گزارش ہے کہ اس واقعہ کا صحیح ہونا بسند ثابت کیا جائے دوسرے اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ مرید عالم متقی تھے کوئی جاہل نہ تھے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی جاہل مرید کا فعل ہو جو کسی درجہ میں بھی قابل التفات نہیں رہا یہ کہ اس مرید کے ایسا کہنے سے فوراً اس کی امداد کیلئے ایک سفید پوش ظاہر ہو گیا تھا۔ جس نے وہ گمشدہ اونٹ اس کو بتلا دیئے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ وہ کوئی عالم متقی شخص تھا کیونکہ جاہل مشرک لوگ بھی بکثرت اپنے دیوتاؤں سے مرادیں مانگتے ہیں اور حق تعالیٰ ان کی بھی بعض مرادیں پوری کر دیتے ہیں اس سے یہ ہرگز دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مشرک صحیح راستہ پر ہیں اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ وہ مرید عالم و متقی بھی تھے تو ہر عالم کا فعل کب حجت ہو سکتا ہے۔

پھر ممکن ہے کہ اس کا اعتقاد مشرکانہ نہ ہو اس نے غلبہ شوق و محبت سے صیغہ ندا کا استعمال کیا ہو جس کو ہم ناجائز نہیں کہتے۔ مگر چونکہ آجکل عوام کے عقائد مسئلہ ندا میں شرک و کفر کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو اس سے منع کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد سائل نے سیدی احمد مرزوقؒ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان سے شیخ ابو العباس حضرمیؒ نے پوچھا کہ زندہ ولی کی امداد زیادہ قوی ہے یا مردہ کی۔ انہوں نے کہا کہ بعض لوگ تو زندہ کی امداد کو قوی بتلاتے ہیں مگر میرے نزدیک مردہ کی امداد زیادہ قوی ہے۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ ہاں یہی صحیح ہے کیونکہ وہ دربار حق میں پہنچ گیا ہے۔ اھ۔

سو اس کو استعانت سے کوئی بھی واسطہ نہیں کیونکہ اس میں اس کا کچھ بھی ذکر نہیں کہ مردوں سے استعانت کرنا چاہیے اور ان سے یوں کہنا چاہیے کہ تم ہمارا یہ کام کر دو

بلکہ یہاں امداد سے افاضہ روحانی مراد ہے۔ چنانچہ صوفیہ کے کلام میں مدد اور امداد کا لفظ بمعنی فیض وافاضہ روحانی بکثرت مستعمل ہوتا ہے۔

پس حاصل اس کا یہ ہوا کہ ولی میت کا فیض روحانی زیادہ قوی ہوتا ہے اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ سے مرنے کے بعد بھی روحانی فیض حاصل ہوسکتا ہے اور جو لوگ اس کے اہل ہیں ان کے لئے بشرائط مخصوصہ اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر ان سے فیض حاصل کرنا ہمارے نزدیک جائز بھی ہے۔ ہم تو صرف اس کو حرام کہتے ہیں کہ ان کو حاجت روا سمجھا جائے یا خود ان سے مزار پر جا کر یا دور ہی بیٹھے یہ کہا جائے کہ تم ہمارا یہ کام کر دو باقی ان سے توسل کرنے یا ان کی روحانیت سے فیض حاصل کرنے کو ہم منع نہیں کرتے فافہم۔

اس کے بعد سائل نے جناب علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہ کی تفسیر سے یہ عبارت نقل کی ہے. **وقد تواتر عن کثیر من الاولیاء یعنی ارواحھم انھم ینصرون اولیائھم ویدمرون اعدائھم** اھ۔ کہ بہت سے اولیاء یعنی ان کی ارواح سے درجہ تواتر کو یہ بات پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے اور ان کے دشمنوں کو تباہ کر دیتے ہیں ۔ اھ۔ مگر نہ معلوم اس کو استعانت مروجہ سے کیا تعلق ہے کیا تفسیر مظہری میں کہیں بھی یہ ذکر ہے کہ اولیاء اللہ کو دور بیٹھے یا مرنے کے بعد اپنی امداد کیلئے پکارا کرو۔ یا ان کے مزاروں پر جا کر خود ان سے ہی اپنی حاجتیں مانگا کرو۔

جو عبارت فاضل سائل نے نقل کی ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اولیاء اللہ سے وفات کے بعد بھی کرامات کا ظہور ہوتا ہے اس کا کون منکر ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جس طرح زندگی میں جس قدر کرامات ان سے ظاہر ہوتی تھیں۔ ان میں فاعل ومتصرف اور قادر صرف حق تعالیٰ ہے اور وہ محض ذریعہ اور وسیلہ ہوتے تھے۔ اسی طرح مرنے کے بعد بھی وہ خود کچھ نہیں کر سکتے بلکہ حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ان کی ارواح کو ظہور کرامت کا وسیلہ اور ذریعہ بنا دیتے ہیں اور درحقیقت وہ خدا تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔

پس اولیاء سے بعد وفات کے ظہور کرامات کا ہم کو بھی انکار نہیں۔ سائل نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے مکتوبات میں سے بھی ایک عبارت

نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسی طرح اہل حاجات اپنے زندہ اور مردہ عزیزوں سے خطرناک حوادث میں مدد طلب کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان عزیزوں کی روحیں حاضر ہوکران سے بلاؤں کو دفع کر دیتی ہیں۔ اھ۔

اس میں بھی صرف اس کا بیان ہے کہ اولیاء و مشائخ سے حیات میں بھی اور مرنے کے بعد بھی کرامات وخوارق کا ظہور ہوسکتا ہے۔ رہا یہ کہ اہل حاجات ان سے امداد طلب کرتے ہیں اس کا وہی مطلب ہے جو شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے استعانت واستمداد کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے یعنی وہ ان کے توسل سے حق تعالیٰ کی جناب میں امداد کے خواہاں ہوتے ہیں اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود ان سے حاجات مانگتے ہیں اور وہ ارواح خود کچھ کرسکتی ہیں۔ حاشا وکلا قطب وقت شیخ عبدالقدوس قدس سرہ درمکتوبات خود می فرمایند۔ بندہ بیچارہ قادریست کہ درعین قدرت خود عاجز است۔ ومختاریست کہ درعین اختیار خودضعیف است چرا کہ تہمت اختیار بروئے نہادہ اند

ہر نیک و بدے کہ درجھاں می گزرد   خود می کند و بھانہ برعام نہاد

اے عزیز آنکہ اختیار بندہ راقوت می نہد مگر دیدہ اش اینجا نظر نیفتادہ است کہ حق تعالیٰ می فرماید خُلِقَ الانسان ضعیفاً اختیار بندہ صفت بندہ است وصفت از موصوف جدانیست پس لاجرم بندہ با جملہ صفاتِ خودضعیف وعاجز بود اھ ملخصا (ص ۳۰)

سائل فاضل کو سمجھنا چاہیے کہ کرامات اولیاء معجزات انبیاء سے زیادہ تر نہیں ہوسکتیں اور معجزات کے بارہ میں حق تعالیٰ کا صاف ارشاد موجود ہے۔

﴿وما كان لِرَسُولٍ اَنْ يَّاتِىَ بِآيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه﴾

''کسی نبی میں یہ طاقت نہیں کہ وہ بدون خدا تعالیٰ کے حکم کے کوئی معجزہ لا سکے''۔

پھر اولیاء میں کب یہ طاقت ہے کہ وہ خود کوئی کرامت ظاہر کرسکیں یا کسی شخص کی امداد بدون حکم خداوندی کرسکیں۔

﴿يَسْئَلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

''اسی سے تمام زمین و آسمان والے سوال کرتے ہیں''

پس استعانت و استمداد اسی سے ہونی چاہیے ہاں مقربان بارگاہ سے توسل کرنے کا مضائقہ نہیں۔اس کے بعد سائل نے منہیہ ردالمحتار کی عبارت نقل کی ہے۔جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کسی انسان کی کوئی چیز ضائع ہو جائے اور وہ چاہے کہ حق تعالیٰ اسے واپس فرما دیں تو اس کو چاہیے کہ ایک اونچی جگہ پر روضہ (احمد بن علوانؒ) کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور یہ کہے کہ اے سیدی احمد بن علوان میری گم شدہ چیز مجھے واپس کر دو ورنہ میں تمہارے (نام) کو دفتر اولیاء سے نکال دوں گا۔انتہی ملخصا۔نیز علامہ خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یا شیخ عبدالقادر کہنا نداء ہے اور جب اس کے ساتھ شیئاً للہ ملا دیا جائے تو اس میں خداواسطے ایک چیز مانگنا ہے۔اس کی حرمت کا کیا سبب ہے۔اھ۔

امر اول کی نسبت یہ گزارش ہے کہ یہ منہیہ ردالمحتار میں کسی نے غالباً ملحق کر دیا ہے۔علامہ شامی کا اس کو فتوی سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ صورت اولی میں ایک ولی کے ساتھ جس قدر گستاخی اور بے ادبی ہے وہ کسی عاقل پر مخفی نہیں۔بھلا جو شخص ایک ولی سے استعانت کرے اسی کو خود یہ دھمکی بھی دے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو میں تمہارا نام دفتر اولیاء سے نکال دوں گا۔اس گستاخی کی کچھ حد ہے پس یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر علامہ شامی کے نزدیک اولیاء سے استعانت جائز ہے تو وہ اس گستاخی کی کیونکر اجازت دے سکتے ہیں۔علاوہ ازیں یہ کہ اس نداء و استعانت سے یہ امر مفہوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ متصرف ہیں اور جو شخص اس طرح ندا کریگا وہ یقیناً ان کو متصرف سمجھے گا اور علامہ شامی نے ایک مقام پر اس کی تصریح کی ہے کہ اولیاء اللہ کو متصرف سمجھنا کفر ہے۔

﴿ومنها انه ان ظنّ ان الميت يتصرف في الامور دون الله تعالىٰ و اعتقادهٗ ذلك كفر ﴾اھ (ص۲۰۶ ج۲)

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مقصود ان کا اس عمل کی خاصیت بیان کرنا ہے۔قطع نظر جواز و عدم جواز سے جیسا قول جمیل میں مولانا حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک عمل کشف وقائع کا لکھا ہے اور اس میں ایک قرآن پشت کی طرف بھی رکھا جاتا ہے۔تو یہ دلیل جواز

نہیں ہے اور علامہ رملی کے قول کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ یا شیخ عبدالقادر شیئا للہ کی حرمت کا کیا سبب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی سمجھ میں وجہ حرمت نہیں آئی۔ سو ان کی سمجھ میں نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وجہ حرمت واقع میں بھی نہ ہو لان فوق کل ذی علم علیم ○ دوسرے علماء کی سمجھ میں وجہ حرمت آ گئی ہے اور انہوں نے اس کو بیان بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے۔

﴿کذا قول شیئ للّٰہ قیل بکفرہ اھ (ص ۴۷۵ ج ۳) و فی ردالمحتار لعل وجہ انہ طلب شیئا اللّٰہ تعالیٰ واللّٰہ تعالی غنی عن کل شیئ والکل مفتقر و محتاج الیہ و ینبغی ان یرجح عدم التکفیر فانہ یمکن ان یقول اردت اطلب شیئا اکراما للّٰہ اھ شرح الوھبانیہ قلت فینبغی او یجب التباعد عن ھذہ العبارۃ و قد مران مافیہ خلاف یؤمر بالتوبۃ والاستغفار و تجدید النکاح لکن ھذا ان کان لایدری ما یقولُ اما ان قصد المعنی الصحیح فالظاھر انہ لابأس بہ﴾ اھ (ص ۴۷۵، ج ۳)

ترجمہ:- "اسی طرح شیئا للہ کہنے سے بعض کے نزدیک کفر ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کیلئے ایک چیز مانگی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور سب اسی کے محتاج ہیں اور مناسب یہ ہے کہ عدم تکفیر کو ترجیح دی جائے کیونکہ قائل یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا مقصود خدا کی عظمت کے صدقہ سے سوال کرنا تھا شارح کہتے ہیں۔"

کہ پس مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے الفاظ سے احتراز کیا جاوے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ جن الفاظ سے کفر ہونے میں اختلاف ہے ان میں توبہ واستغفار وتجدید نکاح کا حکم کیا جاویگا لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ کہنے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ میں کیا کہہ رہا

ہوں (اور اس کا مطلب کیا ہے) اور اگر صحیح معنی (کو جانتا ہو اور اسی) کا قصد کرتا ہو تو بظاہر اس میں کہنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی ہے جو کہ صحیح معنے اور غلط میں فرق نہیں سمجھتے بالخصوص اگر اس کے ساتھ یا شیخ عبدالقادر بھی ملا دیا جائے۔ جب تو کفر کا قوی اندیشہ ہے کیونکہ عوام حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ و دیگر اولیاء کو اس اعتقاد کے ساتھ ندا کرتے ہیں کہ وہ متصرف ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں اور جو کوئی ان کو پکارتا ہے اس کی بات کو سنتے ہیں اور اوپر علامہ شامی کا قول گزر چکا ہے جس میں وہ صاف فرماتے ہیں کہ اولیاء کو متصرف سمجھنا اعتقاد کفر ہے۔

مولانا عبدالحی قدس سرہٗ اپنے فتاوی میں یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کے وظیفہ کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں ثانیاً ازیں جہت کہ ایں وظیفہ متضمن است ندائے اموات راز مکنہ بعیدہ و شرعاً ثابت نیست کہ اولیاء را قدرتے حاصل است کہ از مکنہ بعیدہ ندارا بشنو ندا البتہ سماع اموات سلام زائر قبر را ثابت ست بلکہ اعتقاد اینکہ کسی غیر حق سبحانہ حاضر و عالم و حالم خفی و جلی در ہر وقت و ہر آں است اعتقاد شرک ست در فتاوی بزازیہ می نویسد۔ تزوّج بلا شہود و قال خدائے و رسول خدا و فرشتگاں را گواہ کردم۔ **یکفر لانہ اعتقد ان الرسول و الملک یعلمان الغیب و قال علمائنا من قال ان ارواح المشائخ حاضرة تعلم یکفر انتھی** وحضرت شیخ عبدالقادر اگر چہ از اجلئہ اولیائے امت محمدیہ ہستند و مناقب و فضائل شاں **لا تعد ولا تحصی** اند لیکن چنیں قدرت شاں کہ فریاد را از امکنہ بعیدہ بشنوند و بفریا درسند ثابت نیست۔ و اعتقاد اینکہ آنجناب ہر وقت حال مریدان خود میدانند و ندائے شاں می شنوند از عقائد شرک است واللہ اعلم۔ (ص ۳۳۱ ج ۴ مع الخلاصۃ)

فتاوی بزازیہ کی عبارت سے یہ امر صاف طور پر واضح ہو گیا کہ ارواح مشائخ کو حاضر سمجھنا کہ وہ سب کچھ جانتے سنتے ہیں۔ عقیدہ کفر ہے اسی لئے ہم یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کے وظیفہ سے منع کرتے اور اس کی حرمت کا فتوی دیتے ہیں۔ فاضل سائل نے کسی کتاب سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت محبوب عالم اپنے مریدوں کو بعد نماز کے شیئاً للہ یا حضرت سلطان سنجرہ ایک سو تیرہ مرتبہ پڑھنے کی اجازت دیا کرتے تھے اھ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی بزرگ کا فعل شریعت میں حجت نہیں ہے۔ اس سے احکام کا ثبوت نہیں ہوسکتا بلکہ اگر کسی بزرگ سے کوئی فعل خلاف شرع صادر ہوا ہے تو حسن ظن کی بنا پر اس میں تاویل کر لینی چاہیے اور حکم شرعی کو نہ بدلنا چاہیے۔ پس اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعہ صحیح ہے تو ممکن ہے۔ حضرت محبوب عالم رحمہ اللہ نے اس نداء کو غلبہ شوق و محبت پر محمول کر کے جائز سمجھا ہو اور جن مریدوں کو اس کی اجازت دی ہو وہ ان کے نزدیک خوش عقیدہ اور خوش فہم ہوں۔ جن کی نسبت ان کو یہ شبہ نہ ہو کہ وہ۔

لوگ اس نداء میں حضرت سلطان کے متصرف اور حاضر و ناظر ہونے کا اعتقاد کریں گے۔ باقی ان کے قول سے یہ استدلال کرنا کہ نداء غائب مطلقاً جائز ہے اور اولیاء اللہ ندا کو دور سے سنتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی جو کوئی ان کو پکارتا ہے اس کی ان کو خبر ہوتی ہے۔ غلط استدلال ہے کیونکہ اولیاء اللہ اتباع شریعت کے مامور ہیں۔ شریعت ان کے افعال کے تابع نہیں ہے۔ پس اگر کسی ولی سے کوئی کام خلاف شریعت ثابت ہو تو اگر وہ امت کے نزدیک مسلم ولی نہیں ہے تب تو اس کے فعل میں تاویل کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس کی ولایت تسلیم شدہ ہے تو اس کے فعل میں تاویل کر کے اس کے ساتھ بدگمانی سے روکا جائے گا۔ لیکن احکام شرعیہ کو کسی حال میں اس کے فعل کے تابع نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت شیخ ابن عربی رضی اللہ عنہ نے فصوص میں ایمان فرعون کا مسئلہ لکھا ہے یا حضرت بایزید بسطامیؒ سے سبحانی ما اعظم شانی فرمانا اور حضرت حسین بن منصور سے انا الحق کہنا منقول ہے۔

علماء شریعت نے ان سب میں مناسب تاویل کر کے ان حضرات کو کفر سے بچالیا ہے کیونکہ ان کی ولایت مسلم تھی لیکن اس تاویل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ الفاظ حقیقت میں کفر کو مستلزم بھی نہیں ہیں یقیناً اگر تاویل نہ کی جائے تو یہ الفاظ بہت سنگین ہیں۔ جن کی اجازت ہرگز کسی کو نہیں دی جاسکتی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بزرگ سے یہ منقول ہو کہ انہوں نے ایک تولہ سنکھیا کھالیا تھا۔ سو اس سے کوئی شخص یہ فتویٰ نہیں دے سکتا کہ سنکھیا کھالینا جائز ہے بلکہ ہر عاقل یہی کہے گا کہ سنکھیا کھانا حرام ہے مگر ان بزرگ کے پاس کوئی ظاہری یا باطنی تریاق ہوگا۔ جس کی وجہ سے ان کو یقین تھا کہ مجھ کو سنکھیا

نقصان نہ دے گا۔اس لئے انہوں نے ایسا کیا دوسروں کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔

اسی طرح یا شیخ عبدالقادر شیاء للہ کا وظیفہ شرعاً حرام ہے کیونکہ اس میں غیر اللہ کو مکان بعید سے نداء اور ان کے حاضر و ناظر ومتصرف ہونے کا ایہام ہے۔ جو کہ موجب شرک ہے اور اگر کسی ولی نے ایسا کیا ہے تو اس نے اس عقیدہ شرک وکفر سے بچنے کیلئے کوئی تاویل کر لی ہوگی ان کے فعل سے حکم شرعی نہیں بدل سکتا۔

درمختار میں ہے کہ دعا میں بمقعد العزمن عرشک کہنا ممنوع ہے۔ علامہ شامی اس کے تحت میں لکھتے ہیں لان مجرد الایھام کاف فی المنع من التکلم بھذا الکلام و ان احتمل معنی صحیحاً اھ (فتاوی مولانا عبدالحی ص ۳۳۱ ج ۴ مع الخلاصة) کہ ایسے کلمات کے ممنوع ہونے کے لئے معنی کفر کا ایہام بھی کافی ہے اگر چہ اس کے صحیح معنی بھی بن سکتے ہوں۔اھ فاضل سائل غالباً اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ آج کل عام لوگ استعانت و استمداد و نداء غیر میں کیسے کیسے شرک وکفر تک پہنچانے والے عقیدوں میں مبتلا ہیں اس صورت میں ایسے کلمات کی ان کو کیونکر اجازت دی جاسکتی ہے۔جن میں ظاہری الفاظ ہی سے ایہام کفر ہوتا ہے۔ پس ہمارا مسلک یہ ہے کہ ہم استعانت واستمداد ونداء مروجہ زمانہ حال سے عام وخاص سب کو منع کرتے ہیں البتہ توسل کو جائز کہتے ہیں اور اگر بزرگوں سے کوئی بات اس قسم کی ثابت ہوتی ہے تو اگر ان کی ولایت تسلیم شدہ ہے۔ان کے فعل میں تاویل کر کے بدگمانی کو ان سے رفع کر دیتے ہیں اور حکم شرعی میں کسی طرح تبدیلی وتغیر نہیں کرتے۔

ھذا واللہ المسئول لان یثبتنا وایاکم علی الصراط المستقیم و یرزقنا و جمیع المسلمین حبه و حب نبیه الکریم و حب اصحابه و اولیاء امته ویجمعنا معھم فی دار النعیم والحمد للہ وحده و علی خیر البریة افضل الصلوة والتسلیم و علی آله و اصحابه و اولیاء امته اجمعین دائما ابدا آمین آمین۔

ضمیمہ رسالۂ الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد

بعد الحمد والصلوۃ۔ مسئلہ استمداد کے متعلق بعض سوالات کے جوابات امداد الفتاویٰ مؤلفہ حضرت مجدد الملۃ والدین حکیم الامت فاضت انہاء فیوضہم میں بہت نفیس و قابل قدر مذکور ہیں۔ جی چاہا کہ ان کو بھی اپنے رسالہ کے اخیر میں منضم کردوں تا کہ ان مضامین عالیہ کی برکت سے رسالہ مذکورہ مکمل و مدلل ہو جاوے واللہ الموفق والمعین وھا ھوذا واللہ خیر رفیق۔

سوال

صلی اللہ علیک یا محمدؐ یہ درود شریف پڑھنا کیسا ہے۔ یاد آتا ہے کہ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا کی تفسیر میں جامع البیان میں لکھا ہے کہ جس طرح عام لوگوں کو نام لیکر پکارتے ہو نہ پکارو اس سے اس درود کی ممانعت کا ثبوت ہوتا ہے۔

الجواب

اس آیت میں اس خطاب کی ممانعت ہے جو خلاف ادب واحترام ہو اور اگر ادب وحرمت کے ساتھ ہو جیسا کہ اقتران صیغہ صلوۃ یہاں اس کا قرینہ ہے گو اسم علم کے ساتھ ہو وہ اس آیت سے ممنوع نہیں چنانچہ حدیث ضریر میں خود یہ خطاب حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے۔ حصن حصین میں کسی حدیث کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ البتہ حالت غیبت میں یہ نداء گو بعنوان رسول و نبی ہی کیوں نہ ہو موہم ہے اعتقاد سماع عن البعید کو جو کہ عوام کے لئے منجر بمفسدہ ہے۔ اس بنا پر اس سے ممانعت کی جاوے گی۔ ۱۳ ذ الحجہ ۲۷ھ

سوال

(اول) دلائل الخیرات کی حزب ششم یوم شنبہ میں جو یہ عبارت واقع ہے یــا حبیبنــا یــا سیــدنا محمد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انا نتوسل بک

الی ربک فاشفع لنا عند اللّٰہ المولی العظیم یا نعم الرسول الطاھر اس کا پڑھنا جبکہ قاری روضۂ مبارک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر نہ ہو یا نسبت حضوری اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قوی نہ ہو تو کیسا ہے۔ تتمہ قربات عند اللہ وصلوٰت الرسول نے دعائے حاجت کے ضمن میں حاشیہ پر یہ تحریر فرمایا ہے۔ اختصرته لان النداء الوارد له لادليل عليه على بقائه بعد حياته عليه السلام (سوال دویم) قریب قریب اسی کے وہ شبہ ہے جو تشہد میں وقت پڑھنے فقرہ السلام علیک ایہا النبی الخ اکثر اوقات دل میں پڑ جاتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم (گروہ صحابہؓ) حالت حیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بوقت تشہد السلام علیک ایہا النبی الخ کہا کرتے تھے اور جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا یوں کہنے لگے السلام علی النبی الخ۔ تو اب یہ کلمہ تشہد میں کیوں بحال رکھا گیا حالانکہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اکثر فتاوی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کے پیرو ہوا کرتے تھے فقط۔

الجواب

جواب سوال اول۔ ایسے صیغے بہ نیت تبلیغ ملائکہ جائز ہیں مگر میں نے احتیاط کی ہے کیونکہ عوام میں مفاسد زیادہ ہو گئے ہیں۔ (جواب سوال دوم) یہ ابن مسعودؓ کا اجتہاد تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم تشہد کی بصیغہ خطاب بلاتخصیص منصوص ہے نص کے سامنے اجتہاد کو چھوڑ دیا جاویگا۔ بخلاف تعلیم اس دعا کے اعمیٰ کو کہ اس وقت میں وہ حاضر تھا اس دعا کے پڑھنے کو فرمایا تھا تو تعلیم تعمیم ثابت نہیں اور تشہد تو نماز میں پڑھنے کو سکھلایا گیا اور آپ خود جانتے تھے کہ سب نمازی قریب نہیں ہوں گے اور جو قریب بھی ہیں وہ اسماع نہ کریں گے۔ فافترقا۔ ۲۹ ذیقعدہ ۲۸ھ

سوال

فخر اقران یادگار بزرگان جناب مولانا اشرف علی صاحب مدت فیوضکم۔

کمترین بعد سلام مسنون گزارش پرداز ہے جناب کی ہمت باصلاح امت بھرنوع قابل شکر گزاری ہے۔ بندہ کو اپنی کم فہمی اور قلت اعتناء بامور دینی سے آپ کے بعض مضامین پر کچھ شبہے ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر بوجہ مذکورہ باشتغال مشاغل فاسدہ دنیویہ وقت کے ساتھ ہی رفت وگزشت ہو جاتے ہیں۔ بعض دفع استفہاماً واستفادۃً کچھ عرض بھی کرنا چاہتا ہوں مگر وجوہ مسطورہ کے ساتھ میری علمی بے بضاعتی اور اخلاصی فرومائیگی دست کشی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ ان دنوں شعبان کے القاسم کے ص ۱۴ و ص ۱۶ کے دیکھنے سے پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی وجوہ مذکورہ تو اب بھی مانع عرض حال ہیں۔ مگر ۲۹ رجب گزشتہ کو چند منٹ کی حصول نیاز مقام اس دفعہ معروض کی تقریب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لہٰذا نہایت ادب سے مختصراً گزارش ہے بندہ آپ کے مضمون ص ۱۴ القاسم کے اس جملہ کو نہیں سمجھ سکا اور اگر مقصود اس عمل سے حق تعالیٰ ہے اور ان بزرگ کو محض ثواب بخشنا ہے تو وہ اس حد تک (یعنی شرک تک) تو نہیں پہنچا اور ظاہراً جائز بھی ہے۔ مولانا آپ مضمون شرط کو لفظ مقصود اور لفظ محض سے اتنا مضبوط ومحفوظ فرما چکے ہیں کہ یہ عمل وعقیدہ ہر حد اساءت سے دور اور ظاہراً باطناً جائز اور مستحسن ہو گیا۔ پس یہی جواب شرط ہونا چاہیے تھا۔ اور نہ اس محفوظ ومضبوط مقدم سے کوئی استدراک ہو سکتا ہے اور جناب اپنی تفتیش اور معلوم خیالی کے واسطے جدا مسئلہ قائم فرما سکتے تھے۔ حاشا وکلا کہ مجھے آپ کے بیان سے کوئی مزاحمت یا سیاق سے کوئی مناقشہ مدنظر ہو مگر آپ کے اس بیان سے اس مسئلہ کا مفہوم جو میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ جس صدقہ نافلہ میں مقصود فقط حق تعالیٰ ہو اور بزرگوں کو محض ثواب بخشنا ہو وہ بھی برا اور گناہ ہے اور ظاہراً جائز اور باطناً منع ہے۔ مولانا مجھے اپنے کان لم یکن معلومات میں ایسا کوئی مسئلہ معلوم نہیں ہوتا جس کو ظاہر شرع نے جائز قرار دیا ہو اور وہ بغیر عرض کسی فاسد خارجی کے ناجائز ہو سکے اور مبحوث عنہ میں آپ کی لفظی اور معنوی حد بست حملہ خوارج کا سدباب کر چکی ہے۔ لہٰذا یہ عمل مطلقاً جائز اور مستحسن ہونا چاہیے۔

عقیدہ مدد از بزرگان کی جناب نے دو صورتیں نکالی ہیں ایک عقیدہ مدد بتصرف باطنی جس کو ص ۴ میں قریب شرک اور ص ۱۶ میں عین شرک فرمایا ہے دوسری صورت عقیدہ

مدد از دعاء تصرف باطنی کہ اس ہیبتناک مفہوم کی تصریح سے پہلے (جس کا عقیدہ کرنے سے ایک کلمہ خوان نماز گزار روزہ دار مومن باللہ و بالرسول و بالیوم الآخر غرض عامل ارکان اسلام کو اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ کی سخت ترین وعید کے تحت میں خلود فی النار کا مستوجب بنادے) یہ حکم تصرف باطنی کے ظاہری مفہوم پر جو بحالت غلو بھی کسی مسلمان کی سمجھ یا عمل میں آسکتا ہے نہایت شدید بلکہ متجاوز عن الحق معلوم ہوتا ہے اگر صفحہ ۱۶ کے اس جملہ کو (وہ خوش ہوکر ہمارے کام کر دیں گے) تصرف باطنی کے مفہوم شرک کی تصریح بھی مان لی جائے تو یہ تصریح خود محل توجیہ تاویل ہے کام کر دیں گے یعنی دعاء کریں گے۔ شفاعت کردیں گے اوران کی دعاء خدا تعالیٰ قبول فرمالے گا تو ہمارا کام ہو جاوے گا۔

گویا انہوں نے ہی ہمارا کام کیا وسایط ست افعال کی نسبت مجازا ہر زبان میں رات دن کا روزمرہ ہے قرآن و حدیث میں بھی ایسی نسبتیں بکثرت موجود ہیں غایۃ مافی الباب یہ کہ احتیاط اگر کسی مدبر و مصلح قوم کو دور اندیشی سے لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی ضرورت ہو تو وہ مشرک اور کافر قرار دینے کے سوا بھی اور ترہیبی و ترغیبی طریقوں سے ہوسکتی ہے۔ اور زیادہ کیا عرض کروں۔ قرآن و حدیث و تعامل صحابہ و قرون خیر و اتفاق صلحاء سلف و خلف ایسی سخت گیری سے کس قدر مانع ہے۔ وہ جناب کے خدام مجلس کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں۔ اس وقت اس حکم کی شدت ہی میری گھبراہٹ کا باعث ہوئی ورنہ من خراب کجا وصلاح کار کجا۔

عقیدہ مدد از دعاء میں بعد جواز عقیدۂ احتمال دعاء دو عقیدے فاسد آپ نے ظاہر فرمائے ہیں ایک عقیدہ وقوع احتمال دعاء دوسرا بغرض وضوع عقیدہ اجابت دعا ان عقیدوں کے فساد پر عدم ثبوت آپ نے دلیل پیش کی ہے۔ بغیر اس کے کہ اندریں مسئلہ عدم ثبوت دلیل فساد ہونے پر کچھ عرض کروں۔ عقیدہ اول کی صحت و ثبوت میں یہ حدیث پیش کرتا ہوں جس کو علامہ ابن القیم نے کتاب الروح میں نقل کیا ہے۔ قال ابو عبد اللّٰه بن مندة وروى موسىٰ بن عبدة عن عبداللّٰه بن يزيد عن ام كبشة بنت المعرور قالت دخل علينا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فسألناه عن

هذه الارواح فو صفها صفةً ابکی اهل البیت فقال ان ارواح المومنیں فی حواصل طیر خضر تسرح فی الجنة و تاکل من ثمارھا و تشرب من مائھا وتاوی الی قنادیل من ذھب تحت العرش یقولون ربنا الحق بنا اخواننا و آتنا ما وعدتنا فتلک دعوتھم قدو قعت لاخوانھم الاحیاء و تدوم الی مادامت المسوات. الارض . اسی عقیدہ اول کی صحت وثبوت میں قرآن شریف کی یہ آیت بھی پیش کرتا ہوں اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ مَنْ حَوْلَهٗ کے مفہوم میں اگرچہ مفسرین نے ان بزرگوں کو شامل نہ کیا ہو جن کو میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض تفریحات اندریں باب اس احقر کائنات کے مدد و معاون ہیں چنانچہ ام کبشہ کی حدیث مذکور میں تاوی الی قنادیل من ذھب تحت العرش آیا ہے اور بعض حدیثوں میں الی قنادیل معلقة بالعرش مدلیة تحت العرش آیا ہے نہ معلوم ان تحت العرش داخل فی حول العرش و المعلقات بالعرش ھی من حول العرش تیسرا ثبوت قال ابن عبدالبر ثبت عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم انه قال مامن مسلم یمر علی قبر اخیه کان یعرفه فی الدینا فیسلم علیه الاو اللّٰہ تعالی علیه روحه حتی یرد علیه السلام اور سلامتی بہترین دعا ہے اور

ل وہ پورا مضمون یہ ہے۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی جو صدقہ نافلہ نکالتے ہیں ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ محض حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کریں بلکہ وہ ہر چیز کو کسی پیر فقیر شہید ولی کے نامزد کر دیتے ہیں سو اگر خود وہ بزرگ ہی اُس سے مقصود ہے۔ تب تو وہ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ میں داخل ہو کر بڑی دور یعنی حد شرک تک پہنچ گیا اور بعض غلاۃ جہلا کا واقعی یہی عقیدہ ہے سو ایسی چیز کا تناول بھی درست نہیں اور اگر مقصود اس عمل سے حق تعالیٰ ہو اور اُن بزرگ کو محض ثواب ہی بخشنا ہے وہ اس حد تک تو نہیں پہنچا اور ظاہراً جائز بھی ہے۔ لیکن عوام بلکہ بعض خواص کالعوام کے حالات وخیالات کی تفتیش سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ محض ثواب ہی پہنچانے کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ ان کی یہ نیت ہوتی ہے کہ فلاں ولی کو ثواب پہنچے گا تو وہ خوش ہوں گے اور ہماری اس حاجت میں مدد کریں گے تصرف باطن سے اور زیادہ عقیدہ یہی

مامن والا کی نفی و اثبات سے اس کی ضروری الوقوع اور ہر گونہ احتمالات سے بالاتر ہونے پر ایک تجلی پڑتی ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں (رضی اللہ عنہ) عرفہ اولا یعرفہ ردعلیہ السلام بھی ہے فتلک دعواتهم لنا بغير احسان مناوالمعاوضة فكيف اذا احسنا اليهم ووصلنا هم وارسلنا اليهم الهدايا وهم متنعمون مكرمون عند ربهم فرحون بما آتاهم الله من فضله وهو تعالیٰ يطلع اليهم فيقول هل تشتهون شيئاً فكيف يدعو ننا في مثل هذا الوقت من الدعاء لنا وهدايا نا تصل اليهم و ربنا القدير يسئلهم تشتهون شيئًا والحمد لله رب العالمين.

عقیدہ ثانیہ یعنی بعد فرض وقوع دعاء کے اس دعاء بالقطع قبول ہونے کا عقیدہ کرنا اس کا ثبوت عقیدہ اولیٰ کے ثبوت میں تقریباً آ ہی چکا ہے مگر علیحدہ بھی اس کے ثبوت میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث پیش کرتا ہوں۔ عن ابی هريره رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اُدعوا الله وانتم موقنون بالا جابة (رواه الترمذی) اس میں شک نہیں کہ دعاء تو بعض اوقات انبیاء علیہم السلام کی بھی قبول نہیں ہوتی۔

ہے اور اُس کا بھی قریب شرک ہونا ظاہر ہے اور خواہ دعاء سے سو احتمال دعاء کا عقیدہ تو ناجائز نہیں لیکن دو عقیدے اس میں بھی فاسد ہیں ایک اس احتمال کے وقوع کا اعتقاد کرنا کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل عقیدہ کرنا کذب نفس اور مخالفت ہے آیت وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کی دوسرے بعد فرض وقوع دعا کے اس دعا کی بالقطع قبول ہو جانے کا عقیدہ کرنا دعا تو بعض اوقات انبیاء علیہم السلام کی بھی کسی مصلحت سے قبول نہیں ہوتی تا بغیر انبیاء چہ رسد اس ہے مصلحت بھی ہو وہ محب بزرگوں کو کچھ بخشنا ہو اپنی حاجت کا خیال اُن میں ملایا کریں کہ توحید کے خلاف ہی کما ذکر اور اگر بہت ہی احتیاط کی تو اخلاص کے تو خلاف ہے ایسی مثال ہوگئی کہ کسی زندہ کو ہدیہ دیا وہ سمجھا کہ محبت سے دیا اور خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کسی مطلب کو دیا فوراً وہ مکدر ہو گیا ص ۱۴ مسئلہ: بعضے لوگ بزرگوں کے لیے ثواب پہنچاتے ہیں کہ وہ خوش ہوکر ہمارا کام کر دیں گے سو یہ شرک ہے اور اگر یہ سمجھیں کہ دعا کریں گے اور وہ دعا ضرور قبول ہوگی تو یہ دونوں مقدمات بھی غلط ہیں نہ تو کہیں یہ ثابت ہے کہ وہ ضرور دعا کریں گے اور نہ یہ ثابت ہے کہ دعا ضرور قبول ہوگی پس ایسی مشکوک بات کا پختہ یقین کر لینا بھی گناہ ہے۔

مگر ہم کو بصراحت دعاء کے بالقطع قبول ہونے کا عقیدہ رکھنے کا حکم ہے۔ ادعوا اللّٰہ و انتم موقنون بالا جابة والسلام اب میں زیادہ جناب کی تضییع اوقات نہیں کرتا چونکہ بندہ کو فقط تحقیق حق مقصود ہے اگر جواب عنایت ہو تو تحقیقی اور مختصر دوم بالعافیۃ۔

الجواب

مخدومی معظمی دامت فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ میں آجکل سفر میں ہوں سفر ہی میں مکرمت نامہ نے مشرف فرمایا خیر خواہی سے ممنون ہوں اگر جواب لکھنے کا حکم نہ ہوتا تو جواب کو سوءادب سمجھ کر اس کی جرأت نہ کرتا۔ مگر حکم ہونے کے بعد جواب عرض نہ کرنا سوأدب تھا اس لئے کچھ عرض کرتا ہوں میں نے صاف دل سے خلو ذہن کے ساتھ پورا مضمون القاسم[1] میں مکرر بغور دیکھا کوئی خدشہ نہیں معلوم ہوا۔ اور والا نامہ کو مکرر دیکھا تب بھی کوئی خدشہ پیدا نہیں ہوا۔ غالباً آپ کو جملہ ظاہراً جائز بھی ہے کے بعد استدراک سے خلجان ہوا ہے۔ سو بقرینہ سیاق اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہراً علی الاطلاق جائز بھی ہے۔ پس باعتبار قید علی الاطلاق کے یہ استدراک کیا گیا ہے اور گو علی الاطلاق کا لفظ اس مقام پر مصرح نہیں مگر سیاق کو ملا کر دیکھنے سے مطلب واضح ہے۔ پس میں بزرگوں کے نفس ثواب بخشنے کو منع نہیں کرتا۔ جس پر یہ شبہ مذکور والا نامہ متوجہ ہو سکے کہ جس میں صدقہ نافلہ میں مقصود فقط حق تعالیٰ ہو اور بزرگ کو محض ثواب بخشا ہو وہ بھی برا اور گناہ ہے اور یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آٹھ نو سطر بعد ہی اس میں یہ مصرح ہے کہ جب بزرگوں کو کچھ بخشا ہو اپنی حاجت کا خیال اس میں نہ ملایا کریں۔ الخ

بلکہ مطلب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ گو ظاہراً علی الاطلاق جائز معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعد تامل و تفتیش حال عوام اس میں باطنی مفسدہ ہے جو بعد استدراک مذکور ہے اور واقعی یہ عدم جواز بغیر عروض کسی قبیح خارجی کے نہیں ہوا۔ بلکہ قبیح کے عروض ہی سے ہوا اور وہ قبیح دو عقیدے ہیں۔ ایک اعتقاد وقوع دعا دوسرا اس کا بالقطع مقبول ہونا اور جس امر کو میں نے شرک یا قریب شرک کہا ہے۔ وہ ایسا ہی شرک ہے جیسے من حلف بغیر اللہ فقد

اشرک چنانچہ اس کا لفظ قریب بہ شرک ہی تعبیر کرنا اس کا مؤید ہے باقی اس تصرف باطنی کے عقیدہ کی جو تاویل کی گئی ہے۔ جولوگ ان امور میں منہمک ہیں۔ ان کی تصریحات اس تاویل کو رد کرتی ہیں اور تشدد جو سلف کے خلاف ہے وہ تشدد ہے جو محل عدم تشدد میں ہو اور یہ عقیدہ خود محل تشدد ہے۔ چنانچہ اس سے ان امور پر حدیثوں میں شرک کا اطلاق آیا ہے اور وقوع دعاء میں جو حدیث نقل فرمائی ہے اس میں جو دعاء منقول ہے وہ خود اس استدلال کا جواب ہے۔ یعنی اس سے صرف ایک معین دعاء کا وقوع ثابت ہے۔ ربنا الحق بنا اخواننا اور دعویٰ عدم ثبوت دوسری دعاء کا ہے یعنی جس حاجت کے لئے یہ شخص ایصال ثواب کرتا ہے مثلاً ترقی معاش وصحت اولاد ونحو ذلک تو اس کا ثبوت اس حدیث سے کیسے ہوا اسی طرح قرآن مجید کی آیت میں اگر من حولہ کو بلا دلیل عام بھی لے لیا جائے تب بھی اس سے خاص دعاء کا ثبوت ہوتا ہے۔ نہ کہ دعاء متکلم فیہ کا اسی طرح سلامتی کی دعاء خاص ہے اس سے ہر دعاء کا وقوع اور خاص کر ایصال ثواب کے بعد اس کا وقوع جیسا کہ عقیدہ عوام کا ہے۔ یہ کیسے ثابت ہوا باقی اس پر جو دوسری ادعیہ کو قیاس کیا ہے۔ وہ مع الفارق ہے اور وہ فارق اذن ہے ممکن ہے کہ یہ دعاء ماذون فیہ ہو اور دوسری دعائیں غیر ماذون فیہ جب تک کہ نقل صحیح سے ثابت نہ ہو اور جب دعاء ہی ثابت نہیں تو اجابت کے یقین کا کیا ذکر اور انتم موقنون بالا جابة سے مراد خاص قبول متعارف نہیں اسی کی قطع کی نفی کی گئی ہے۔ ورنہ جب اجابت واقع نہ ہو لازم آتا ہے کہ ہم کو ایک غیر واقعی امر کا یقین دلایا گیا۔ اس کا کوئی متدین قائل ہوسکتا ہے بلکہ مراد اجابت سے عام ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اور عوام اجابہ متعارفہ کا قطع کرتے ہیں بہت غور درکار ہے اور اصل بات جو بناء ہے میرے منع کی وہ یہ ہے کہ عوام الناس یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس طریق سے گویا وہ کام ان بزرگوں کے سپرد ہوگیا اور وہ ذمہ دار ہو گئے۔ وہ جس طرح بن پڑے گا، خواہ تصرف سے یا دعاء سے ضروری ہے اس کو پورا کرالیں گے۔ اور ان کا ایسا دخل ہے کہ ان کی سپردگی کے بعد اب اندیشہ تخلف نہیں رہا اور اگر تخلف ہوگا تو یہ احتمال نہیں ہوگا کہ ان کی قوت میں کچھ عجز ہے بلکہ اپنے

عمل میں کمی سمجھیں گے۔ بعینہٖ جیسا خدا تعالیٰ کے ساتھ یہی اعتقاد ہوتا ہے بس یہ اگر شرک نہیں تو کیا ہے حسب الحکم مختصر لکھا ہے۔ اس سے زیادہ میں عرض کرنا نہیں چاہتا نہ اب نہ پھر اس سے فیصلہ نہ ہوا ہو تو بہتر یہ ہے کہ اپنی تحقیق القاسم میں یا اور کسی پرچہ میں طبع کرا دیجئے تا کہ مسلمانوں کی اصلاح ہو جاوے میں بھی اگر سمجھ لوں گا تو رجوع کا اعلان کر دوں گا ورنہ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ اس کا رد نہ لکھوں گا باقی خود اپنا عقیدہ اپنی تحقیق کے موافق رکھنے میں معذور ہونگا۔ ۲۱ محرم ۱۳۳۱ھ

سوال

کلمہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کے ورد کے متعلق جناب کی رائے مبارک کیا ہے؟ قرآن کریم کی صدہا آیات ظاہری طور پر تو اس کے مخالف نظر آتی ہیں اور نیز حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب جیسے متبحر عالم اور صوفی بھی اس سے منع کرتے ہیں۔ گو دوسری طرف شاہ غلام علی شاہ صاحب اور حضرت مرزا جان جاناں صاحب جیسے اعلیٰ درجہ کے صوفی اس کے عامل نظر آتے ہیں۔ خود اعلیٰ درجہ کے علماء اور فضلاء اور صوفیاء میں ایسے اہم مسائل کے متعلق اختلاف دیکھ کر ہمارے جیسے کم علم جن کو دینی بصیرۃ کما حقہ حاصل نہیں ہے حیران اور سرگرداں رہ جاتے ہیں۔ اور یہ اختلاف حنفی شافعی مالکی حنبلی یا مقلدین اور غیر مقلدین کے خفیف اختلافات سے کوئی تشابہ نہیں رکھتا۔ اس کا ایک فریق تو زبردست دلائل سے اس کو شرک ٹھہراتا ہے اور دوسرا فریق ایک لائق پلیڈر کا پارٹ لے کر اس کی حمایت کے واسطے ویسے ہی زبردست دلائل پیش کرتا ہے۔ امید ہے کہ جناب بندہ نوازی فرما کر اس کے متعلق رائے مبارک کا اظہار فرماویں گے۔

الجواب

ایسے امور و معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ صحیح العقیدہ سلیم الفہم کے لئے جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ تاویل مناسب کر کے اور سقیم الفہیم کے لئے بوجہ مفاسد اعتقادیہ و عملیہ کے اجازت نہیں دی جاتی۔ چونکہ اکثر عوام بدفہم اور کج طبع ہوتے ہیں ان کو علی

الاطلاق منع کیا جاتا ہے اور منع کرنے کے وقت اس کی علۃ اور مدار نہی کو اس لئے بیان نہیں کیا جاتا ہے کہ قیاس فاسد کر کے ناجائز امور کو جائز قرار دے لیں گے۔ جیسے عوام کی عادت ہے کہ دو امروں کو جن میں واقع میں تفاوت ہے مساوی ٹھہرا کر ایک کے جواز سے دوسرے پر بھی جواز کا حکم لگا لیتے ہیں۔ اس لئے ان کو مطلقا منع کیا جاتا ہے۔ اس قاعدے کے دریافت کر لینے کے بعد ہزارہا اختلاف جو ان امور میں واقع ہیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہو جاوے گی اس کی ایسی مثال ہے کہ بوجہ ردائت اکثر مزاجوں کے کوئی ڈاکٹر کسی فصلی چیز کے کھانے سے عام طور پر منع کر دے مگر خلوۃ میں کسی خاص صحیح المزاج آدمی کو بعض طریق وشرائط کے ساتھ اسی چیز کی اجازت دیدیں۔ اس تقریر سے مانعین و مجوزین کے اقوال میں تعارض نہ رہا مگر یہ اجازت عوام کے حق میں سم قاتل ہے۔

سوال

طریق اربعین یعنی چلہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ضیاء القلوب صفحہ ۵۵ میں تحریر فرماتے ہیں استعانت واستمداد ازاروں مشائخ طریقت بواسطہ مرشد خود کردہ الخ استعانت و استمداد کے الفاظ ذرا کھٹکتے ہیں غیر اللہ سے استعانت و استمداد بطریق جائز کس طرح کرتے ہیں۔ خالی الذہن ہونے کی تاویل وتوجیہ وبالکل جی کو نہیں لگتی ایسی بات ارشاد ہو جس سے قلب کو تشویش نہ رہے۔

الجواب

(۱) جو استعانت و استمداد بالمخلوق باعتقاد علم وقدرت مستقل مستمد منہ ہو شرک ہے اور جو

(۲) باعتقاد علم وقدرۃ غیر مستقل ہو مگر وہ علم وقدرۃ کسی دلیل صحیح سے ثابت نہ ہو معصیت ہے۔ اور

(۳) جو باعتقاد علم وقدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم وقدرۃ کسی دلیل سے ثابت ہو جائز ہے۔ خواہ وہ مستمد منہ حی ہو یا میت۔ اور

(۴) جو استمد اد بلا اعتقاد علم و قدرۃ ہو نہ مستقل نہ غیر مستقل پس اگر طریق استمداد مفید ہو تب بھی جائز ہے جیسے استمد اد بالنار والماء والواقعات

(۵) التاریخیہ ورنہ لغو ہے۔ یہ کل پانچ قسمیں ہیں۔

پس استعداد ارون مشائخ سے صاحب کشف الارواح کے لئے قسم ثالث ہے اور غیر صاحب کشف کے لئے محض ان حضرات کے تصور اور تذکر سے قسم رابع ہے کیونکہ اچھے لوگوں کے خیال کرنے سے ان کو اتباع کی ہمت ہوتی ہے اور طریق مفید بھی ہے اور غیر صاحب کشف کے لئے قسم خامس ہے۔ ۱۸۔ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ

سوال

اس مسئلہ کی تحقیق تحریر فرمادیں وہ یہ کہ بعض کتب میں نداء غیر اللہ کے متعلق یہ تحریر موجود ہے کہ اگر تصفیہ باطن سے منادی کا مشاہدہ کر رہا ہے تو بھی جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد تصفیہ باطن اولیاء اللہ کو پکار سکتا ہے جو لوگ اولیاء اللہ سے غائبانہ مدد طلب کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مثنوی شریف میں مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

بانگ مظلوماں زہر جابشنوند سوئے اوچوں رحمت حق میدوند

مصائب کے وقت اولیاء اللہ سے مدد مانگنا اور پھر اس کی طرف ان حضرات کا توجہ فرمانا اس سے ثابت ہے اور یہ دلیل کافی ہے اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ اولیاء اللہ میں سے دو بزرگ صاحب تصرف ہیں اس کارخانہ عالم کا نظام حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے متعلق کیا ہے وہ مدد کیا کرتے ہیں اور انتظام فرمایا کرتے ہیں۔ اس خادم کو نام مبارک یاد نہیں رہا مگر غالباً ایک بزرگ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ دوسرے بزرگ کا نام یاد نہیں ہے۔ اس کے متعلق جو تحقیق ہو آنحضور اس سے مطلع فرما دیں بسا اوقات خلجان رہا کرتا ہے کہ آیا دور سے سنتے ہیں یا نہیں اور مدد فرماتے ہیں یا نہیں اہل تحقیق صوفیہ کرام کا کیا مذہب ہے اور حقیقت میں یہ معاملہ کیا ہے۔

الجواب

صرف تصفیہ کو تو کافی نہیں لکھا بلکہ تصفیہ باطن کے بعد مشاہدہ منادی کو شرط کہا ہے۔ سو مشاہدہ کے بعد جواز ہوا لیکن اس سے نداء متعارف میں کوئی گنجائش نہ نکلی رہا مولنا کا شعر یہ قضیہ بوجہ موجود نہ ہونے کسی حرف استغراق وکلیت کے اور کافی نہ ہونے صیغہ جمع کے مہملہ ہے۔ جو قوت میں جزئیہ کے ہے جس کا تحقق بدلالت دوسرے ادلہ کے باعتبار بعض ازمنہ غیر معینہ کے ہوتا ہے۔ یعنی کبھی بطور خرق عادت کے ایسا بھی ہو جاتا ہے اور خرق عادت میں دوام اور اختیار ضروری نہیں بلکہ نفی ان کی اکثری ہے پھر نداء متنازع فیہ سے اس کو کیا مس ہوا اور جن بزرگوں کی نسبت سنا ہے اگر بطور دوام کے مراد ہے تو یہ سنا ہوا محض غلط ہے اس پر کوئی دلیل قائم نہیں اور اگر احیاناً ہے تو مستدلین حال کو مفید نہیں۔ صوفیہ کرام کا وہی مذہب ہے جو شریعت سے ثابت ہے۔ فقط۔ ۸ جمادی الاول ۱۳۲۲ھ

سوال

خادم کا عقیدہ یہ ہے کہ درود شریف کو فرشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں اس بنا پر الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ اگر پڑھا جاوے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فرشتے پہنچا دیں گے۔ خود سماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا واسطہ نہیں ہوتا مگر استاذ مولانا مولوی...... صاحب مدظلہ چند روز ہوئے آرہ تشریف لے گئے تھے ایک بزرگ نے ایک کتاب ابن قیم جوزی کی جس کا نام جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام ہے دیکھنے کو دی۔ اس میں یہ حدیث موجود ہے جس کو مولانا نے نقل فرمایا ہے۔

﴿حدثنا سعید بن ابی مریم حدثنا یحییٰ بن ایوب عن خالد بن زید عن سعید بن هلال عن ابی الدرداء قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اکثروا الصلوٰة علی یوم الجمعة فانه یوم مشهود تشهده الملئکة لیس من عبد یصلی علی الا بلغنی صوته حیث کان قلنا و بعد وفاتک قال و بعد وفاتی. ان اللّٰه حرم علی الارض

ان تاکل اجساد الانبیاء۔

اس حدیث میں کوئی کلام بھی نہیں کیا کہ ضعیف ہے یا موضوع اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کی آواز کو سماع فرماتے ہیں بلاواسطہ ملائکہ اس کے معنے بیان فرمادیں تاکہ تردد رفع ہو یا ایسا ہی عقیدہ رکھنا چاہیے آنحضور کا کیا ارشاد ہے۔

الجواب

اس سند میں ایک راوی یحییٰ بن ایوب بلانسب مذکور ہیں جو کئی راویوں کا نام ہے جن میں سے ایک غافقی ہیں جن کے باب میں ربما اخطاء لکھا ہے یہاں احتمال ہے کہ وہ ہوں دوسرے ایک راوی خالد بن زید ہیں، یہ بھی غیر منسوب ہیں اس نام کے رواۃ میں سے ایک کی عادت ارسال کی ہے اور یہاں عنعنہ سے ہے جس میں راوی کے متروک ہونے کا اور اس متروک کے غیر ثقہ ہونے کا احتمال ہے۔ تیسرے ایک راوی سعید بن ابی ہلال ہیں جن کو ابن حزم نے ضعیف اور امام احمد نے مختلط کہا ہے۔ وھذا کله من التقریب.

پھر کئی جگہ اس میں عنعنہ ہے جس کے حکم بالاتصال کے لئے ثبوت تلاقی کی حاجت ہے۔ یہ تو مختصر کلام ہے سند میں باقی رہا متن سواولاً معارض ہے دوسری احادیث صحیحہ کے ساتھ چنانچہ مشکوۃ میں نسائی اور دارمی سے بروایت ابن مسعود یہ حدیث ہے قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لله ملئکة سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام اور یہی حدیث حصن حصین میں بحوالہ مستدرک حاکم وابن حبان بھی مذکور ہے اور نیز مشکوۃ میں بیہقی سے بروایت حضرت ابوہریرہؓ حدیث ہے قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعته و من صلی علی نائیا بلغته اور نسائی کی کتاب الجمعہ میں بروایت اوس بن اوس یہ حدیث مرفوع ہے۔ فان صلوٰتکم معروضة علیّ الحدیث یہ سب حدیثیں صریح ہیں۔ عدم السماع عن بعید میں اور ظاہر ہے کہ جلاء الافہام ان کتب کی برابر قوت میں نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اقوی کو ترجیح ہوگی۔ ثالثاً لفظ بلغنی صوتہ محتمل تاویل ناشی عن دلیل کو ہے واذا جاء الاحتمال

بطل الاستدلال اور وہ دلیل جو منشاء تاویل کا ہے دوسری احادیث مذکورہ ہیں پس بضرورت جمع بین الاحادیث اس لفظ کی یہ توجیہ ہوگی کہ صوت سے مراد جملہ صلوٰتیہ ہے کیونکہ کلام اور کلمہ قسم ہے لفظ کی اور وہ قسم ہے صوت کی پس درود شریف بھی ایک صوت ہے اور بلاغ عام ہے بلاغ بالواسطہ و بلاواسطہ کو اور بقرینہ (دوسری احادیث کے بلاغ بالواسطہ متعین ہے پس معنے بلغنی صوتہ کے یہ ہونگے۔ بلغنی صلوٰتہ بواسطۃ الملائکۃ رابعًا اگر حدیث کے ضعف سند اور متن کے معارض و محتمل تاویل ہونے سے قطع نظر کر لی جاوے اور کل از منہ و امکنہ و احوال اور جمیع مصلین میں عام لیا جاوے تب بھی اہل حق کے کسی دعوے مقصودہ کو مضر نہیں اور نہ ان کے غیر کے کسی دعوے مقصودہ کو مفید۔ اگر اس اجمال پر قناعت نہ ہو تو اس ضرر یا نفع کو متعین کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ جواب میں بھی تفصیل ہوگی۔ واللہ اعلم، بعد تحریر جواب ہذا بلا توسط فکر قلب پر وارد ہوا کہ اصل حدیث میں صوتہ نہیں ہے بلکہ صلوٰتہ ہے کاتب کی غلطی ہے لام رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ اگر نسخ متعددہ دیکھے جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ کسی نسخہ میں ضرور اسی طرح نکل آوے گا والغیب عند اللہ تعالیٰ فقط۔ ۱۶۔ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ

سوال

(۱) نداء غیر اللہ بدون صیغہ صلوٰۃ کلام اکابر میں لاتعدولاتحصی موجود ہے۔ صرف ندا ہی نہیں اس کے ساتھ استشفاءً استشفاع استعانت استمداد بحوائج مختلفہ موجود ہے۔ اس میں اور یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاء للہ یا شیخ شمس الدین ترک پانی پتی مشکل کشا حاجت روا وغیرہ وغیرہ میں کیا فرق ہے۔ یہ فرمانا کہ وہ ندا حالت ذوق شوق میں ہوتی ہے اور منادی کا مقصود ندا نہیں اور نہ وہ منادی کو حاضر ناظر سمجھتا ہے۔ سو اس قسم کا عذر یہاں بھی ہوسکتا ہے۔ عوام کالانعام کا ذکر نہیں لیکن بہتیرے سمجھ والے خوش عقیدہ ہیں جو اس بات کو سمجھتے ہیں کہ شیخ حاضر و ناظر نہیں متصرف حقیقی نہیں کسی وجہ سے ہو ان الفاظ میں کوئی اثر و برکت سمجھتے ہونگے۔ مثلاً یہی سہی کہ خود حضرت شیخ نے فرمایا ہے کسیکہ دو

رکعت نماز بگذارد و بخواند در ہر رکعت بعد از فاتحہ سورۂ اخلاص یا زدہ بار بعد ازان درود بفرستد بہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد از سلام و بخواند آن سرور را صلی اللہ علیہ وسلم بعد ازان یازدہ گام بجانب عراق برود و نام مرا گیرد و حاجت خود را از درگاہ خداوندی بخواہد حق تعالیٰ آن حاجت او قضا. کذا اخبار الاخیار نام مرا گیرد سے نداہی مفہوم ہوتی ہے گوتاویلات ممکن ہیں اور بخواند آن سرور را صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نداء ہی مترشح ہے۔

پھراس کے جواز میں ایسے شخص کے لئے جو شیخ کو حاضر ناظر متصرف حقیقی نہ جانتا ہو کیا مضائقہ ہے اور ذوق شوق کوئی حالت سکر (نشہ) نہیں جو مغلوب الحال ہو کہ شرعاً معذور سمجھا جاوے علاوہ ازیں ابتداء جبکہ ذوق شوق نہ ہو اس نداء کی اجازت کیسے ہوگی۔ اس کی بابت شفاء قلب مطلوب ہے اور یہ بھی ارشاد ہو کہ صلوٰۃ مذکورہ مختص بحیات شیخ ہے یا مؤثر دوامی ہے اور اس کی اباحت میں تو کوئی شبہہ نہیں ہے جانب عراق چلنے میں کیا سر ہے۔ اگر یہ وجہ ہے کہ شاید قیامگاہ شیخ عراق ہو اور اس جانب چلنے سے شیخ کے ساتھ قربت و مناسبت و رغبت پیدا کرنا مقصود ہو تو اس بناء پر چاہیے کہ مختص بحیات شیخ ہو
(۲) دافع البلا دافع القحط والوباء کاشف الکرب مشکل کشا۔ حاجت روا وغیرہ وغیرہ الفاظ کسی پیغمبر ولی کے نام کے ساتھ ملانا ایسے شخص کے لئے جو اس ولی پیغمبر کو حاضر ناظر متصرف حقیقی نہ جانتا ہو۔ محض ذوق شوق میں کہتا ہو جائز ہے یا نہیں۔ اس قسم کے الفاظ بھی کلام اکابر میں بکثرت پائے جاتے ہیں، خصوصاً کلام منظوم میں۔

اولیا را ہست قدرت ازاکہ تیر جستہ باز گرد اند زراہ

تصرفات کشف بلایا حل مشکلات انجاح، حاجات وغیرہ خدا تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ہے بعد الممات اگر یہ تصرفات مسلوب مان لئے جاویں تو بطور القاب ان الفاظ کے برتنے میں کیا مضائقہ ہوسکتا ہے درحالیکہ قائل خوش عقیدہ ہو اور اندیشہ ضرر متعدی بھی نہ ہو۔

الجواب

قال اللّٰہ تعالیٰ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

لایقولن احد کم عبدی و امتی و لایقل العبد ربی رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ کذا فی المشکوٰۃ وقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاتقولوا ماشاء اللّٰہ و شاء فلاں رواہ احمد ابوداؤد و فی روایۃ لاتقولوا ماشاء اللّٰہ و شاء محمدؐ رواہ فی شرح السنۃ کذا فی المشکوۃ. الفاظ مذکورہ ہر دوسوال بالیقین ایہام شرک میں ان الفاظ منہی عنہا فی الکتاب والسنۃ سے بدرجہا زائد ہیں۔ خواہ انہی کا کوئی درجہ ہو اس کی تعیین مجتہد کا کام ہے۔ لیکن ہر حال میں ناپسندیدہ ہے۔

حضرت شارع علیہ السلام کے نزدیک جب اخف ممنوع ہے تو اشد بدرجہ اولی ممنوع ہوگا بلکہ ممنوعیت میں اشد ہوگا۔ ایک وجہ اشدیت کی تو یہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الفاظ منہی عنہا فی الحدیث محض محاورہ کے طور سے بولے جاتے ہیں۔ جس میں کسی طرح معنے تعبد کے نہیں ہیں۔ بخلاف الفاظ مذکورہ فی السوالین کے کہ باعتقاد برکت وتقرب الی اللہ یا الی الاولیاء حسب اختلاف اعتقاد الناس پڑھے جاتے ہیں۔ جو ایک گونہ تعبد ہے اور ممنوع اور غیر مشروع ہونا ایسے الفاظ کا خواہ کسی درجہ میں ہو اول معلوم ہو چکا اور ظاہر ہے کہ امر ممنوع کو ذریعہ تعبد بنانا جس کا حاصل ہے معصیت کو طاعت سمجھنا یہ بہت زیادہ اقبح و اشنع ہے۔ اس سے کہ ممنوع کو غیر تعبد میں استعمال کرنا کہ ثانی میں معصیت کو سبب رضاء حق تو نہیں سمجھتا اور اول میں معصیت کو سبب رضائے حق سمجھا اور جب ممنوع ہونا ان کا ثابت ہو چکا تو اگر کسی ایسے شخص سے منقول ہو جس کے ساتھ حسن ظن کے ہم مامور یا ملتزم ہیں تو اس نقل سے حکم شرعی میں تغیر یا دوسروں کو استدلال و استعمال نہ کیا جاوے گا بلکہ قصاری امر یہ ہوگا کہ منقول عنہ کی شان کے مناسب کچھ تاویل کر لیں گے اور مقصود اس تاویل سے اس کی حفاظت ہوگی نہ کہ دوسروں کو مبتلا ہونے کی اجازت کیونکہ ممنوع ہونا حجت شرعیہ سے ثابت ہے اور قول وفعل مشائخ حجت شرعیہ نہیں بالخصوص نص کے مقابل اور تاویل محض ضرورت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اور ارتکاب کی خود کوئی ضرورت نہیں۔

لہٰذا تجویز تاویل سے تجویز ارتکاب لازم نہیں اور اگر وہ تاویل ضعیف ہوگی تو دوسری تاویل مناسب ڈھونڈے گی یہ نہ ہوگا کہ کسی تاویل کے ضعف سے بلا تاویل جائز

کہہ دیں گے۔ رہی تقریر ضرر متعدی کے نہ ہونے کی سو اول تو جب ضرر لازمی ہی ثابت ہوگیا تو ضرر متعدی کا انتفا نافع نہیں اور دوسرے یہ تقدیر ہی غیر واقعی ہے ان اکابر کا فعل ہم تک منقول ہوکر آیا ہے ہمارا دوسروں تک جاوے گا پھر ضرر متعدی کے انتفاء کا دعوے کب ہوسکتا ہے رہ گئے۔ تصرفات سو بر تقدیر بقاء بعد الموت کے بھی اس کو مسئلہ مجوث عنہا سے مس نہیں کیونکہ اول تو امکان مستلزم وقوع نہیں اور وقوع مطلق مستلزم دوام نہیں دوسرے وہ تصرفات اختیاری نہیں۔ تیسرے ان تصرفات سے منتفع ہونے کا یہ طریقہ شرعاً ماذون فیہ نہیں، ممکن ہے کہ سلطان کسی امیر و وزیر کو کسی کام کا حکم کر دے اور رعایا کو منع کر دے کہ خبردار اس کام کیلئے اس سے ہرگز نہ کہنا جو کچھ کہنا ہو ہم سے کہنا غرض بقاء تصرفات مستلزم اذن سوال نہیں اور القاب کے طور پر برتنا اول تو برتنے والے بالیقین اس سے متجاوز ہوتے ہیں۔ دوسرے اس کا بھی ممنوع ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے۔ یہ تو استدلالاً کلام تھا۔ اب ذوقاً اتنا قسم کھا کر لکھتا ہوں کہ جس کے قلب میں نور سنت ہوگا وہ ان الفاظ کے بولتے ہی بلکہ سنتے ہی قلب کے اندر ظلمت و کدورت پائے گا کہ بغرض اذن بھی مثل تے...... کے اس سے نفرت کرے گا۔ واللہ اعلم نیز جو لوگ اس وقت خواص کہے جاتے ہیں۔ یقیناً ان کا قلب مرض خفی سے ان امور میں خالی نہیں۔ واللہ اعلم۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ

سوال

ایک شاعر نے عاشقانہ مذاق وفرط محبت میں اشعار مندرجہ ذیل کہے۔

کرم دستگیری کر بچا رنج و مصیبت سے
جو ہوں درحالت مضطر معین الدین اجمیری

غمزدہ ہوں کہ مصیبت نے ہے گھیرا مجھ کو۔ غم کے ہاتھوں سے چھڑا چاند سے مکھڑے والے۔

شاعر کی نیت صرف مجاز پر ہے۔ حقیقی معنے پر محمول نہیں کرتا بلکہ حقیقی معنے پر محمول کرنے کو شرک سمجھتا ہے اور قادر بالذات اور متصرف بالاستقلال سوائے ذات وحدہ لاشریک کے کسی کو نہیں جانتا تو اس کے ایسے شعروں کے سبب جو اس کو مشرک و خارج از

اسلام کہے تو اس کی نسبت شریعت کا کیا حکم ہے کیا واقعی دائرہ اسلام سے مشرک و خارج ہے یا اس کو مشرک کہنے والا خود خطا وار ہے اور مجازی استمداد اہل اللہ سے جائز ہے یا نہیں اور شیخ عبدالحقؒ نے جو شرح مشکوۃ و زبدۃ الاسرار وغیرہ میں مجازی استمداد کو جائز لکھا ہے تو وہ کیا خارج از اسلام تھے ایسا ہی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ جو تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ مدفونین) سے استفاضہ جاری ہے اور وہ زبان حال سے مترنم اس مقال کے ہیں۔ من آیم بجان گرتو آئی بتن۔ وغیرہ وغیرہ اکابر مشائخ جو ایسے عقیدے پر گزرے ہیں وہ مشرک تھے یا مسلمان۔

الجواب

ایسے خطابات میں تین مرتبے ہیں۔

اول ان کو متصرف بالاستقلال سمجھنا یہ تو صریح شرک ہے۔

دوم متصرف بالاذن اور ان خطبات پر مطلع بالمشیۃ سمجھنا یہ شرک تو کسی حال میں نہیں لیکن یہ کہ اس کا وقوع ہوتا ہے یا نہیں اس میں اکابر امت مختلف ہیں۔ فمنھم المثبت و منھم النافی لیکن جو مثبت بھی ہیں وہ یہ اجازت نہیں دیتے کہ بعید سے ندا کرو اور نہ بعید سے دعاء سننے کی کوئی دلیل ہے اور بلا دلیل شرعی ایسا اعتقاد رکھنا گو حقیقۃً شرک نہ ہو مگر معصیت اور کذب حقیقۃً اور شرک صورۃً ہے۔ معصیت ہونے کی دلیل ہے **ولا تقف مالیس لک بہ علم** اور کذب ہونا اس کی تعریف صادق آنے سے ظاہر ہے اور شرک صورۃً اس لئے کہ اول اعتقاد والوں کے ساتھ عادت میں تشبہ ہے اور اگر کسی بزرگ کی حکایت میں بطور کرامت کے ایسا امر منقول ہو تو خرق عادت دوام عادت سے ثابت نہیں ہوتا البتہ قبر پر جا کر مجاز کے مرتبہ سے ان سے استمداد مثبتین کے نزدیک جائز ہے۔ جبکہ اور کوئی مفسدہ عارض نہ ہو جاوے۔

والا فلا سوم نہ تصرف کا اعتقاد ہے نہ سماع کا محض ذوق شوق میں مثل خطاب بادصبا کے خطاب کرتا ہے یہ نہ شرک ہے نہ معصیت فی نفسہ جائز ہے۔

جبکہ الفاظ خطاب کے حد شرعی کے اندر ہوں اور کسی عامی کا اعتقاد فاسد نہ ہو جاوے کیونکہ جس طرح خود معصیت سے بچنا فرض ہے اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو خصوصاً عوام کو بچانا فرض ہے۔ پس جہاں عوام کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو وہاں اجازت نہ ہوگی جب یہ تفصیل سمجھ میں آگئی تو اس سے اکابر کے اقوال کے معنے بھی متعین ہو گئے اور قائل کا حکم بھی معلوم ہو گیا اور جو شخص شرک کہتا ہے اگر وہ مرتبہ جائز کو کہتا ہے تو غلطی ہے توبہ واجب ہے اور اگر ناجائز مرتبہ کو کہتا ہے تو تاویل سے جائز ہے۔ جیسا حدیثوں میں بعض معاصی کو شرک فرمایا ہے واللہ تعالیٰ اعلم ۔۲۶۔ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ

دعوت عامہ

دعوت عامہ

سوال

السلام علیکم۔ گزارش آنکہ ایک سوال میرے ذہن میں بہت زمانہ سے موجزن ہے مگر بوجہ شرم کسی سے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ کہ مسلمان ہو کر ایسا سوال کروں مگر وہ وسوسہ پریشان کئے ہوئے تھا اسی درمیان اشتہار النور نظر سے گزرا۔ جس میں ایک مضمون دعوت عامہ تھا جسے دیکھ کر دعائی بدرگاہ خدا ہوا کہ جلد اس رسالہ کا اجراء ہو۔ خدا نے اس دعا کو درجہ قبولیت تک پہنچایا اب میں صرف سوال لکھتا ہوں۔ امید کہ بذریعہ النور مطلع کیا جاؤں اور اپنا نام نہیں لکھتا مبادا آپ رسالہ میں نام لکھ دیں تو میں رسوا ہوں۔

(۱) ابو طالب کا دوزخ میں معذب ہونا حالانکہ حدیث کے ایک مضمون سے تصدیق بالقلب و اقرار باللسان دونوں معلوم ہوتے ہیں۔ جس وقت کفار مکہ نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے مذہب کو برا بتاتا ہے، ہمارے معبودوں کی بے عزتی کرتا ہے، ہم تمہارے لحاظ سے اسے کچھ نہیں کہتے، غور سے سمجھا دو کہ وہ ان باتوں کو چھوڑے ورنہ ہم بری طرح پیش آئیں گے۔ اس پر ابو طالب نے آپ کو بلا کر جو ان لوگوں نے کہا تھا کہہ سنایا۔

آپؐ نے جواب دیا کہ اے میرے پیارے چچا خواہ تم میری مدد کرو خواہ نہ کرو، میں اپنے فرض منصبی کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ اور جس نے مجھے پیدا کیا اور پیغمبر بنایا اس کے حکم کو سناؤں گا اور جن کو یہ ناحق پوجتے ہیں، میں ان کو کبھی نہ مانوں گا۔ الخ ابو طالب نے کہا اے میرے پیارے بھائی کے بیٹے کچھ خوف نہ کر تو اپنا کام کئے جا کسی کی مجال نہیں کہ تجھے

جھڑک سکے یا کچھ زیادتی کر سکے، تو اپنے کلام میں سچا ہے سب سے بڑھ کر امین ہے۔ تیرا دین سارے دینوں سے اچھا ہے۔ یہ قول ہے ایسا کہ ایسے منہ سے نہیں نکل سکتا جو دل میں یقین نہ رکھتا ہوا اگر ابو طالب کو آپ کی رسالت کا یقین نہ ہوتا تو ابولہب کی طرح وہ بھی الگ ہو گئے ہوتے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے پیر میں آگ کا جوتا کس سزا میں ہوگا۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق چند شبہے ہیں۔

(الف) آپ باوجود پیغمبر و محتاط ہونے کے نو شادیاں کیں۔

(ب) اگر کوئی عورت چاہتی تو بغیر مہر بھی آپ کے نکاح میں آسکتی حالانکہ کسی امتی کو ایسا حکم نہیں، یہ دونوں باتیں خود غرضی پر محمول معلوم ہوتی ہیں۔

(ج) شریعت میں ممانعت کے بغیر بھی اگر آپ چاہتے تو وہ کام کر سکتے جیسے آپ نے ایک شخص کو سونے کا کڑا پہنایا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے واسطے مخصوص نہیں، اسی طرح اور چند باتیں ہیں جو اس کے جواب شائع ہونے کے بعد لکھوں گا۔ امید ہے کہ جواب ضرور شائع کیا جائیگا۔ راقم ایک مسلمان

جواب

ابو طالب کے متعلق سائل نے جو شبہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سائل نے اس تصدیق کی حقیقت نہیں سمجھی جس کا ایمان کے لئے ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ تصدیق دو قسم کی ہوتی ہے، ایک اضطراری، دوسری اختیاری۔

تصدیق اضطراری کے معنی ہیں صرف جاننا اور تصدیق اختیاری کے معنی ہیں "جاننا اور ماننا" ایمان کے لئے تصدیق اضطراری کافی نہیں بلکہ تصدیق اختیاری کا ہونا لازم ہے۔ تصدیق اضطراری کفار کو بھی ہو سکتی ہے اور کبھی کبھی اس کا ظہور زبان سے بھی ہو جاتا ہے مگر اس سے وہ مومن نہیں کہلا سکتے چنانچہ اہل کتاب کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ﴾

''وہ لوگ رسولؐ اللہ کو ایسا (یقینی طور پر) پہچانتے ہیں جیسا اپنے
بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

نیز مشکوۃ کتاب الکبائر میں صفوان بن عسالؓ کی روایت درج ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دو یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات بینات کی تفصیل دریافت کی تو آپ نے اس کا صحیح جواب دیدیا۔ اس پر ان یہودیوں نے آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔ اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ پھر تم میرا اتباع کیوں نہیں کرتے۔ اس کا انہوں نے جواب دیا کہ داؤد علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ میری اولاد میں ہمیشہ نبی رہے اور ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم آپ کا اتباع کریں تو یہود ہم کو مار ڈالیں گے۔

نیز روح المعانی میں ابن اسحٰق و ابن جریر و ابن المنذر اور بیہقی کے حوالہ سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہودیوں میں ایک مرد و عورت نے زنا کیا اور مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے دریافت فرمایا کہ توراۃ میں رجم کے بارہ میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ (توراۃ میں تو رجم کا حکم نہیں) ہم تو زنا کرنے والوں کو رسوا کر کے کوڑے مار دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، پھر آپ ان کے علماء سے مناظرہ کرنے کے لئے ان کے مدرسہ میں تشریف لے گئے اور علماء کو جمع کیا اور سب نے یہ کہا کہ ہم میں سب سے بڑا عالم توراۃ کا عبداللہ بن صوریا ہے، تو آپ نے تنہائی میں اس سے گفتگو کی اس نے کہا **اللھم نعم اما واللہ یا ابا القسام انھم لیعرفون انک نبی مرسل ولکنھم یحسدونک** اھ۔ کہ بیشک آپ سچے ہیں اور خدا کی قسم اے ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہودی خوب جانتے ہیں کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں لیکن وہ آپ سے حسد کرتے ہیں اھ کذا فی البیان۔

ان واقعات و روایات سے معلوم ہوا کہ یہودی کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار زبان سے بھی کر لیتے تھے اور دل میں تو ان کے یقین تھا ہی (جیسا کہ

قرآن کی آیت سے معلوم ہوا) مگر اس سے وہ لوگ مومن نہیں قرار دیئے گئے۔

پس معلوم ہوا کہ ایمان کے لئے تصدیق اضطراری اور اس کا کسی موقعہ پر ظاہر کر دینا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے تصدیق اختیاری کی ضرورت ہے یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی جان کر نبی مان بھی لینا اور اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حلقہ بگوشی میں داخل کر دینا جب یہ بات ہوگی اس وقت آدمی مسلمان ہوگا اور اگر صرف نبی جان لیا مگر مانا نہیں تو اگرچہ اپنے علم کا اظہار کسی وقت زبان سے بھی کر دے اس کو مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ سو ابو طالب گو آپ کو نبی جانتے ہوں اور زبان سے کسی وقت اس کا اظہار بھی کر دیا ہو مگر چونکہ آپ کو نبی مانتے نہ تھے اور اپنے آپ کو حضورؐ کا متبع اور مسلمان نہ کہتے تھے اس لئے ان کے ایمان کا حکم نہیں کیا جاسکتا اور ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی جاننا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ یہود جانتے تھے۔ مگر حسد کی وجہ سے ایمان نہ لاتے تھے اسی طرح ابو طالب نے بھی باوجود نبی جان لینے کے ننگ وعار کے خیال سے اسلام قبول نہیں کیا۔

چنانچہ مشکوۃ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث وارد ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں قال رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم من قبل منی الکلمة التی عرضتُ علی عمی فردها فهی له نجاةٌ رواہ احمد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے اس بات کو قبول کرلے جس کو میں نے اپنے چچا (ابو طالب) کے سامنے پیش کیا تھا تو اس نے اس کو رد کر دیا (یعنی توحید ورسالت) تو وہ اس کے لئے (باعث) نجات ہے۔ اھ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابو طالب نے حضورؐ کی بات کو باوجود آپ کے پیش کرنے کے بھی رد کر دیا تھا پس جو سزا ان کے لئے حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ بیقاعدہ ہرگز نہیں۔ یہ تو سائل کے پہلے شبہ کا جواب تھا۔

(۲) رہے وہ شبہے جو سائل نے خود آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر کئے ہیں۔ سو ان کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں آپ کی نبوت میں کوئی شبہ پیدا کرسکتیں تو سب سے اول اس زمانہ کے کفار کو ایسے شبہات کا حق تھا مگر اس وقت کے کفار تو

اس قسم کے شبہات نہیں کرتے تھے اور آج کے مسلمان ایسے شبہات پیدا کرتے ہیں یہ کس قدر افسوس کی بات ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے۔ (الف۔ ب) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک وقت میں نو بیویاں رکھنے یا کسی عورت سے بلا مہر نکاح کر سکنے سے خود غرضی کا شبہ کرنا اس لئے صحیح نہیں کہ احکام کا مقرر کرنا آپ کے اختیار میں نہ تھا۔ بلکہ ہر حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تھا پس خدا ہی نے آپ کو نو بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ اسی نے آپ کو بلا مہر نکاح کرنے کی اجازت دی اور آپ نے ان احکام پر عمل کیا۔ اس میں خود غرضی کیا ہوئی۔

خود غرضی تو جب ہوتی کہ آپ خود اپنے لئے کوئی خاص رعایت کسی نفسانی غرض سے مقرر کرتے اور جب کہ ایسا نہیں تو خود غرضی کا شبہ فضول ہے آپ کی خود غرضی (نعوذ باللہ) اس وقت ثابت ہو سکتی ہے جب دو باتیں ثابت کر دی جائیں اول یہ کہ یہ احکام خدا کے مقرر کئے ہوئے نہیں بلکہ خود آپ نے اپنے لئے یہ احکام بنائے۔ دوم یہ کہ ان میں محض نفسانی خواہش کا پورا کرنا مدنظر تھا۔ اور کوئی مصلحت نہ تھی، جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں تو اس وقت خود غرضی ثابت ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

پس سائل کو چاہیے کہ وہ ان دونوں باتوں کو ثابت کرے۔ سائل کو اپنا شبہ دفع کرنے کے لئے ان باتوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوانی کا سارا زمانہ صرف ایک بی بی پر قناعت کر کے گزارا اور وہ بھی بیوہ صاحب اولاد کہ نکاح کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۲۵ سال اور ان کی چالیس سال کی تھی حضور نے متعدد نکاح حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد کئے ہیں جب کہ آپ کی عمر مبارک ترپین سال سے گزر گئی تھی اگر آپ معاذ اللہ خود غرض شہوت پرست ہوتے تو جوانی اور شباب کا زمانہ اس کے لئے زیادہ موزوں تھا نہ کہ بڑھاپے کا وقت پس جس شخص کی پاکیزگی اور نظافت پر جوانی میں کوئی انگلی نہ رکھ سکا ہو بڑھاپے میں اسے کون خود غرض اور شہوت پرست کہہ سکتا ہے پس یقیناً متعدد نکاح کرنے میں حضور کو کوئی بڑی شرعی مصلحت مدنظر تھی۔

(۲) حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عبادات و معاملات کے متعلق بعض

فرائض امت سے زیادہ لازم کئے تھے۔ مثلاً تہجد کی نماز آپ کے اوپر فرض تھی حالانکہ دوسروں کے لئے مستحب ہے۔ سنن موکدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بمنزلہ واجبات کی تھیں اگر کسی ایک وقت کی سنت بھی آپ سے قضا ہوئی ہے تو آپ نے عمر بھر اس کی قضا کی ہے آپ کے لئے کتابی عورتوں سے نکاح کرنا ناجائز تھا حالانکہ دوسروں کو اس کی اجازت ہے اسی طرح آپ کے اہل قرابت میں سے جن مسلمان عورتوں نے ہجرت نہ کی ہو ان سے نکاح کرنا آپ کو جائز نہ تھا حالانکہ اوروں کو اس کی اجازت تھی۔ نیز آپ کو اس کی بھی اجازت نہ تھی کہ اپنی بیبیوں میں سے کسی ایک کو طلاق دیکر اس کی جگہ اور کسی سے نکاح کرلیں حالانکہ مسلمانوں کو اس کی اجازت ہے کہ جس کے چار بیبیاں ہوں وہ ان میں سے ایک کو طلاق دیکر اس کی جگہ دوسری کرسکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پس اگر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ سہولتیں بھی امت سے زیادہ کردی ہوں تو اس میں کیا اشکال ہے۔

(۳) جو شخص خود غرضی اور نفس پرستی اور شہوت رانی کرے گا اس کو نو عورتوں پر بس کرنے کی کیا وجہ ہے وہ تو یہ چاہے گا کہ جتنی ملیں تھوڑی ہیں پھر آپ نے نو پر کیوں اکتفا کیا۔

(۴) مہر کی مقدار شریعت میں کچھ زیادہ نہیں جس کا ادا کرنا آپ کو دشوار ہوتا پھر آپ نے بلا مہر کے نکاح کرنے میں کیا نفع سوچا تھا جو اپنے لئے یہ خاص رعایت رکھی۔

(۵) جو عورت بلا مہر آپ سے نکاح کرنے پر راضی ہوگی وہ یہ بھی کرسکتی ہے کہ نکاح کے وقت مہر مقرر کرلے اور بعد نکاح کے معاف کردے کہ آپ کو کوڑی بھی نہ دینی پڑے پھر اس خاص حکم سے آپ نے کیا فائدہ مدنظر رکھنا تھا۔

(۶) آپ نے بلا مہر کے کتنی عورتوں سے نکاح کیا بعض محدثین کا قول تو یہ ہے کہ آپ نے بلا مہر کے کسی سے بھی نکاح نہیں کیا اور بعض نے دو تین نام ان عورتوں کے بیان کئے ہیں۔ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے آپ کو ہبہ کیا تھا، جن میں سے ایک کی نسبت یہ بھی آیا ہے کہ اس کو آپ نے قبول کیا مگر پہلی جماعت ان روایات کو ثابت نہیں بتلاتی۔ اھ۔ جب سائل ان باتوں پر انصاف سے غور کرے گا تو

انشاء اللہ اس کا شبہ بالکل دور ہو جاوے گا۔

(ج) سائل نے تیسرا شبہ آپ کی نبوت پر یہ کیا ہے کہ شریعت میں ممانعت کے باوجود بھی آپ فعل ممنوع کر سکتے تھے چنانچہ آپ نے ایک شخص کو سونے کا کڑا پہننے کی اجازت دی حالانکہ سونے کا کڑا پہننا شرعاً ممنوع ہے مگر اول تو سائل کو یہ بتانا چاہیے کہ سونے کے کڑے کی روایت اس نے کس کتاب میں دیکھی ہے ہماری نظر سے یہ روایت نہیں گزری۔ دوسرے یہ بتانا چاہیے کہ سونا چاندی پہننے کی حرمت سے پہلے آپ نے اس کو اجازت دی یا حرمت کے بعد۔ کیونکہ اگر وہ روایت ثابت بھی ہو جائے تو یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ آپ نے حرمت سے پہلے اجازت دی ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کچھ بھی اشکال نہیں واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

عذاب ابو طالب کے متعلق جو جواب دیا گیا ہے وہ جمہور اہل سنت کے مذہب محقق کی بناء پر ہے جو کہ اس کے قائل ہیں کہ ابو طالب مومن نہ تھے رہے وہ شاذ حضرات جنہوں نے غلط فہمی کی بناء پر یا کسی نفسانی غرض سے ان کے مومن ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ اس شبہ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ عذاب کفر کی بناء پر نہیں ہے بلکہ کسی اور معصیت کی بنا پر ہے پس یہ شبہ وارد نہیں ہوسکتا کہ باوجود مومن ہونے کے ان کو عذاب کیوں ہوا۔ الحاصل خواہ ایمان ابو طالب کا دعویٰ کیا جاوے یا عدم ایمان کا بہر تقدیر سائل کا شبہ دفع ہوگیا۔

اب ہم سوال و جواب سے قطع نظر کر کے تحقیق مستانف کے طور پر کہتے ہیں کہ ابو طالب کے بارہ میں جمہور علماء اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ وہ مومن نہ تھے اور گو وہ مذہب اسلام کو حق جانتے اور زبان سے بھی کبھی کبھی اس کا اقرار کرتے تھے مگر انہوں نے علی الاعلان یا خفیہ کسی طور پر اور کسی وقت بھی مذہب اسلام کو قبول نہیں کیا بلکہ وہ برابر یہی کہتے رہے کہ میں اپنے مذہب سابق پر قائم ہوں مگر بعض شاذ افراد نے اقوال ائمہ کو غلط معنی پر محمول کر کے یا روایات غیر صحیحہ پر اعتماد کر کے یا اپنے یا کسی دوسرے بزرگ کے کشف پر بھروسہ کر کے یا ابو طالب کی اولاد میں ہونے کے سبب اپنے جد کی حمایت کے لئے یا ایسے حکام کی خوشامد کے لئے جو ابو طالب سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ ایمان ابو طالب

کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں نہایت کمزور دلائل اور رکیک تاویلات سے کام لیا سو یہ ان حضرات کا تجاوز عن الحد ہے اور حق وہی ہے جو جمہور کہتے ہیں کہ ابو طالب مومن نہ تھے بلکہ وہ اپنے سابق دین پر قائم رہے اور باوجود مذہب اسلام کو حق جاننے کے انہوں نے اس مذہب کو قبول نہ کیا جس کا سبب عناد نہ تھا بلکہ محض دفع عار اس کا سبب تھا۔

پھر جمہور میں سے بعض شاذ افراد ایسے نکلے کہ انہوں نے ابو طالب کی شان میں گستاخیوں کو جائز رکھا اور ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ سو یہ بھی اعتدال سے گزر گئے اور حد سے متجاوز ہو گئے کیونکہ گو ابو طالب نے مذہب اسلام کو قبول نہیں کیا مگر باوجود اس کے وہ تاحین حیات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت واعانت فرماتے رہے اور خواہ اس کا منشاء محبت طبعی ہو یا نصرت حق۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بیحد تعلق رہا اور آپ ہمیشہ ان کی تعظیم وتکریم کرتے رہے اور کبھی ان کو برا نہیں کہا اور نہ کبھی کوئی توہین کی۔ پس ایسی حالت میں کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ان کی شان میں گستاخی یا ان کی توہین وتحقیر کرے کیونکہ یہ برتاؤ اس برتاؤ کے خلاف ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے ساتھ تھا۔ نیز اس میں احتمال ہے تأذی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور احتمال ایذاء رسول سے بچنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ الحاصل حضرت ابو طالب کے بارہ میں معتدل مسلک یہ ہے کہ احادیث صحیحہ وثابتہ کی بناء پر ان کے ایمان کا اعتقاد نہ رکھا جاوے مگر اس کے ساتھ ہی ان احسانات کی بناء پر جو انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دین پر کئے ہیں ان کی شان میں گستاخی اور ان کی تحقیر نہ کی جاوے۔

اللّٰھم ثبتنا علی الصراط المستقیم و جنبنا من الحب المفرط والبغض المفرط امین!

ظفر احمد عثمانی (رجب ۱۳۳۹ھ)

راہ اعتدال

راہ اعتدال

(از عبدالجلیل انصاری)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب سے مندرجہ ذیل سوالات دریافت کئے گئے جو بمعہ جواب ارسال خدمت ہیں۔ شائع کر دیں۔

سوال: جناب والا کا تعلق جماعت اسلامی سے کلیتاً ہے؟

جواب: نہیں

۲۔ یا صرف مطالبہ دستور اسلامی میں ہے؟

جواب: ہاں۔

۳۔ کیا جماعت اسلامی کے لٹریچر میں سلف صالحین کے مسلک کے خلاف بھی کچھ باتیں ہیں یا مطابق ہیں؟

جواب: بعض مسائل میں غلطی کی گئی ہے جس کی غلطی ان کو معلوم بھی ہوگئی مگر رجوع کا اعلان نہیں کیا۔

۴۔ زید کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مع جسد عنصری آسمان پر تشریف لے جانا قرآن سے ثابت نہیں۔ البتہ نزول پر اجماع ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔

جواب: غلط ہے ان کا آسمان پر جسد عنصری سے مرفوع ہونا بھی تواتر اور نزول بھی تواتر سے ثابت ہے۔

۵۔ عصمت نبوت لوازم ذاتیہ ہے یا نہیں؟

جواب: نبوت کے لئے شرعاً عصمت لازم ہے۔

۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل از نبوت ایک بڑا گناہ ہوگیا تھا کیا یہ درست ہے؟

جواب: غلط ہے موسیٰ علیہ السلام سے خطأ ایک کافر کے قتل کا صدور ہوا۔ اس کو گناہ یا خلاف عصمت نہیں کہا جا سکتا۔

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۸۲ھ

ظفر احمد عثمانی

پوتے کا حق وراثت

بعد الحمد والصلوۃ جنوری ۱۹۵۴ء کے طلوع اسلام میں یہ بحث دیکھ کر میں نے چند صفحات کا مضمون لکھ کر اپنے ایک عزیز کو دیدیا تھا کہ نقل کر کے اخبار میں بھیج دیں۔ مگر اس نے اصل ہی بھیج دی۔ اخبار والے نے اس کو شائع نہ کیا تو مجھے دوبارہ اس پر قلم اٹھانا پڑا۔

یہ مسئلہ ایسا نہیں جس پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہوتی کیونکہ چودہ سو برس سے امت کا اس پر اتفاق چلا آ رہا ہے کسی نے بھی آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا قرآن کے خلاف ہے۔ اس کو تو کوئی بیوقوف سے بیوقوف مسلمان بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ چودہ سو برس سے امت اسلامیہ قرآن کے خلاف کسی مسئلہ پر متفق چلی آ رہی ہے۔ یہ جسارت و جرأت مدیر طلوع اسلام جیسے منکرین حدیث ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ ایسے بدیہی اور اجماعی مسئلہ کو بھی قرآن کے خلاف بتلا رہے ہیں۔ اب ذرا ان کے دلائل ملاحظہ ہوں۔ اسی طرح **لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ** میں **الْوَالِدَانِ** باپ دادا، پردادا سب کو عام ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالیا گیا کہ جیسے چچا کی موجودگی میں بیٹا اپنے باپ کا وارث ہے۔ اسی طرح چچا کی موجودگی میں پوتا بھی اپنے دادا کا وارث ہونا چاہیے۔ کیونکہ اولاد میں پوتا بھی داخل ہے اور الوالدان میں دادا بھی شامل ہے۔ مگر ان کو اتنی خبر نہیں کہ اولاد میں پوتوں پر پوتوں کا داخل ہونا اور الوالدان کا دادا۔ پردادا کو شامل ہونا حقیقت نہیں۔ بلکہ مجاز ہے۔ اسی طرح اب اور لفظ ابن باپ بیٹے کے لئے حقیقت ہے۔ دادا اور پوتے کے لئے مجاز ہے آیت میراث میں **يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ** کے بعد ہی **آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا** مذکور ہے جس نے ظاہر کر دیا کہ الوالدان سے مراد آباء ہیں اور اولاد سے مراد ابناء ہیں۔ لغت عرب میں دادا کے لئے لفظ جد اور پوتوں کے لئے لفظ حفدۃ مستقل موجود ہے۔ قرآن میں بھی دوسری جگہ اس کا استعمال ہوا ہے۔ **وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً** (سورہ النحل) اللہ نے تمہارے واسطے تمہاری بیبیوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔'' اب ان کو اس پر دلیل قائم کرنا چاہیے کہ آیت میراث میں الوالدان اور اولاد کو حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں

استعمال کیا گیا ہے۔ ائمہ تفسیر وفقہ کے اجماع سے استدلال کرنے کا ان کوحق نہیں۔ کیونکہ ان کا تو اس پر بھی اجماع ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا وارث نہیں ہوتا۔ ایک جگہ اجماع کو ماننا دوسری جگہ ٹھکرا دینا ناحق کی زبردستی ہے۔

پھر اگر قرآن سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث ہونا ثابت ہے تو اسے ہر حال میں وارث ہونا چاہیے خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مر چکا ہو۔ اس کی کیا دلیل ہے کہ یتیم پوتا تو دادا کا وارث ہوگا۔ غیر یتیم وارث نہ ہوگا؟ اور جو دلیل طلوع اسلام نے بیان کی ہے وہ اس کی من گھڑت ہے۔ قرآن کی طرف اس کو منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس سوال کے حل کے لئے دوسرا اصول سامنے آتا ہے۔ قرآن نے اقربون کا لفظ استعمال کیا ہے، اقرب کے معنی ہیں وہ میت جس کے اور وارث کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو'' یہ کس قدر بیبا کی اور جسارت ہے کہ قرآن نے تو وَالْاَقْرَبُوْنَ کو الوالدان پر عطف کیا تھا۔

آیت کا مطلب یہ تھا کہ مردوں عورتوں کا حصہ ہے، اس چیز میں جو والدین اور نزدیکی قرابت دار چھوڑ جائیں۔ ... ہر سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ والاقربون کا مصداق والدین نہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسرے قرابت دار ہیں۔ مگر طلوع اسلام اس کو والدین اور اولاد کے ساتھ چسپاں کرنا چاہتا ہے پھر اقرب کے معنی میں موجود کی قید لگانا۔ تا کہ میت کے اور وارث کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔'' خالص ایجاد بندہ ہے۔ جس پر وہ کوئی دلیل قرآن یا لغت سے قائم نہیں کرسکتا۔ اقرب قریب کا اسم تفضیل ہے جس کے معنی ہیں قریب تر۔ اور قریب تر وہ ہے۔ جس کے اور میت کے درمیان واسطہ نہ ہو۔ جس کے درمیان میں واسطہ ہوگا وہ اقرب نہیں بلکہ بعید ہے خواہ واسطہ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ پوتا دادا کا اقرب نہیں خواہ یتیم ہو یا غیر یتیم بلکہ بیٹا اقرب ہے تو جس طرح پوتا اپنے باپ کی موجودگی میں دادا کا وارث نہیں ہوسکتا اسی طرح اپنے چچا کی موجودگی میں بھی دادا کا وارث نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ چچا دادا کا اقرب ہے۔ پھر نہ معلوم طلوع اسلام کو یتیم پوتے ہی سے کیوں ہمدردی ہے۔ یتیم پوتی سے ہمدردی کیوں نہیں؟ اس کو اس کا بھی قائل ہونا چاہیے کہ یتیم پوتی بھی اپنے چچا کی موجودگی میں دادا کی وارث

ہوگی۔ مگر چونکہ پنجاب کے جاہلوں کولڑکیوں کا وارث ہونا گوارا نہیں۔ اس لئے وہ ان کی خاطر صرف یتیم پوتے ہی کی میراث پر زور دینا چاہتا ہے۔

اگر اقرب کے وہی معنی ہیں جو طلوع اسلام بیان کرتا ہے تو یتیم بھتیجے اور یتیم بھانجے اور یتیم نواسے کو بھی میت کے بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی میں وارث ماننا چاہیے کیونکہ ان کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہیں۔

یہ ہے منکرین حدیث کی قرآن فہمی کہ وہ الفاظ کے معانی خود گھڑتے ہیں۔ اور اپنی منگھڑت باتوں کو قرآن کی طرف منسوب کر کے امت کے اجماعی قول کو قرآن کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

ان لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ جس طرح یتیم پوتے کو چچا کی موجودگی میں دادا کی میراث سے بے تعلق کیا گیا ہے۔ اسی طرح چچا کو بھی اس یتیم کے باپ کی میراث سے محروم کیا گیا ہے۔ اگر چہ وہ لاکھوں روپیہ چھوڑ کر مرا ہو۔ کیونکہ بیٹے کے ہوتے ہوئے بھائی اقرب نہیں۔'' رہا یہ سوال کہ اگر یتیم پوتے کا باپ کچھ بھی چھوڑ کر نہ گیا ہو اور دادا کی میراث کا حقدار اس کا چچا ہو گیا تو اس یتیم پوتے کی پرورش کیونکر ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دادا اس یتیم پوتے کیلئے اپنی زندگی میں جائیداد کا کچھ حصہ نام زد کر سکتا ہے یا اس کیلئے وصیت کر سکتا ہے اگر دادا نے کچھ نہ کیا تو ایسے نادار یتیم کی پرورش اس کے چچا کے ذمہ ہے۔ حاکم شرعی اس کو مجبور کریگا کہ اپنے یتیم بھتیجے کی تعلیم و تربیت اور نان ونفقہ کا پورا اہتمام کرے۔ پھر اسلامی بیت المال میں بھی یتیموں، بیواؤں کا بڑا حق ہے جس کے بعد وہ پریشان نہیں ہو سکتے۔ منکرین حدیث کو نہ آئین اسلام کی کچھ خبر ہے۔ نہ وہ پاکستان میں اس کو جاری کرانا چاہتے ہیں۔ بس قرآن میں خواہ مخواہ تحریف کر کے علماء اسلام اور فقہائے امت کو بدنام کر کے اپنا من گھڑت آئین چلانا چاہتے ہیں۔ جس کا نمونہ ایسے ایک مسئلہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ والسلام

(ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ) از ڈھاکہ

مسائل ضروریہ
رمضان وعیدین وصدقۃ الفطر

مسائل ضروریہ رمضان وعید وصدقۃ الفطر

روزہ

(۱) رمضان شریف کے روزے ہر مسلمان پر جو مجنون اور نابالغ نہ ہو فرض ہیں جب تک کوئی قوی عذر نہ ہو روزہ کا چھوڑنا جائز نہیں مثلاً روزہ رکھنے سے مرجانے یا سخت مرض میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے یا مسلمان طبیب حاذق کسی مریض کے لئے روزہ کو مضر بتلا دے۔ ان صورتوں میں افطار جائز ہے۔

(۲) روزہ کی فرضیت کا انکار کرنا یا اس کی نسبت تمسخر کے کلمات کہنا مثلاً یہ کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر اناج نہ ہو یا یہ کہ ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا کفر ہے۔

(۳) مسافر کو بشرطیکہ تین منزل کی مسافت شرعی کا مسافر ہو اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے بعد میں قضا کرے۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر بچہ کی ہلاکت یا مضرت کا اندیشہ غالب ہو تو چاہیے کہ بعد میں قضا رکھے۔

(۴) حیض و نفاس والی عورت کو اس حالت میں روزہ رکھنا جائز نہیں بعد میں قضا رکھیں۔

(۵) اگر کسی شرعی عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو تب بھی رمضان کا ادب ضروری ہے کہ کسی کے سامنے کچھ کھائیں پئیں نہیں روزہ داروں کی سی صورت بنائیں اور شرعی اجازت سے کھائیں تو چھپ کر کھائیں۔

(۶) شرعی عذر سے اگر افطار کیا ہو اور اس عذر کے ختم ہونے کے وقت کچھ دن باقی ہے تو کھانے پینے وغیرہ سے دن کے بقیہ حصہ میں رکنا واجب ہے۔

(۷) روزہ کے لئے نیت یعنی یہ دھیان کرنا کہ کل کو میرا روزہ ہے اور اس کے بعد صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رکنا فرض ہے۔

(۸) اگر زبان سے بھی نیت کر لے یا عربی میں کہہ لے وَ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ تو بہتر ہے۔

(۹) اگر کچھ کھایا پیا نہ ہو تو دن کے ٹھیک دوپہر سے ایک گھنٹہ پہلے تک رمضان کے روزہ کی نیت کر لینا درست ہے۔

(۱۰) بھول کر کھانے پینے اور سوتے میں احتلام ہونے اور سر میں تیل لگانے اور بلا دھوئیں کی خوشبو سونگھنے اور مسواک کرنے سے روزہ نہیں جاتا۔

(۱۱) ہاں لوبان وغیرہ کی کوئی دھونی سلگا کر اپنے پاس رکھ کر اس طرح سونگھنے سے کہ دھواں حلق میں پہنچ جائے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور حقہ پینے سے بھی روزہ جاتا رہتا ہے۔

(۱۲) کلی کرنے یا منہ اور ناک سے نکلنے سے پہلے تھوک، سنک نگلنے یا سرمہ لگانے سے بھی روزہ نہیں جاتا اگرچہ سنک یا تھوک میں سرمہ کا رنگ دکھائی دے۔

(۱۳) سحری میں پان کھا کر اگر کلی کر لی اور اچھی طرح منہ صاف کر لیا تو پھر پان کی سرخی تھوک میں نظر آنے سے روزہ میں کچھ نقصان نہیں۔

(۱۴) اگر منہ میں پان دبا کر سو رہا اور صبح صادق کے بعد آنکھ کھلی تو روزہ نہیں ہوا۔

(۱۵) اگر آپ ہی آپ قے ہو جائے تو زیادہ ہو یا کم اس سے روزہ میں کچھ خرابی نہیں آتی۔ ہاں اگر قصداً قے کی جائے تو روزہ ٹوٹ جائیگا۔

(۱۶) بلا ضرورت صرف روزہ چھوڑنے کے واسطے سفر کرنا یا بیمار بن جانا حرام ہے۔

(۱۷) بعضے لوگوں کو سفر یا بیماری میں جان کو آ جاتی ہے لیکن افطار نہیں کرتے اس کی بھی ممانعت ہے۔

(۱۸) روزہ میں غیبت کرنا جھوٹ بولنا، لڑنا، جھگڑنا، گالم گلوچ اور فحش الفاظ زبان سے نکالنا یا حرام روزی کھانا۔ یا بری نگاہ سے لڑکوں اور عورتوں کو دیکھنا یا شطرنج

تاش، گنجفہ کھیلنا، ہارمونیم، گراموفون سے دل بہلانا اور دنوں سے زیادہ سخت حرام ہے۔

(۱۹) روزہ میں لایعنی اور فضول باتوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے اور زیادہ وقت یادالٰہی اور تلاوت قرآن میں گزارنا چاہیے کہ یہ وقت سال میں ایک ہی دفعہ نصیب ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رمضان میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے۔ اس مہینہ میں غریب محتاجوں کی امداد کا اور دنوں سے زیادہ خیال چاہیے روزہ دار کو افطار کرانے کا بڑا ثواب ہے چاہے ایک گھونٹ پانی ہی پلا دے۔

(۲۰) نابالغ بچوں کو بھی جب کہ وہ متحمل ہوسکیں روزہ کی عادت ڈالنی چاہیے لیکن محض خوشی منانے اور دل کا حوصلہ نکالنے کے لئے بہت چھوٹے بچوں سے روزہ رکھوانا ممنوع ہے۔

(۲۱) منجھلے روزہ کا زیادہ اہتمام کرنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

افطار

(۲۲) جب تک سورج کے ڈوبنے میں شبہ رہے تب تک افطار کرنا جائز نہیں۔

(۲۳) جب سورج یقیناً ڈوب جائے فوراً روزہ کھول دینا چاہیے پھر دیر کرنا مکروہ ہے۔

(۲۴) بادل کے دن خوب احتیاط سے کام لو صرف گھڑی اور نقشہ پر اعتماد کر کے افطار نہ کرو جب تک کہ تمہارا دل گواہی نہ دے دے کہ سورج ڈوب گیا ہوگا۔ بلکہ اگر کوئی اذان بھی کہہ دے لیکن ابھی غروب میں شبہ ہے، تب بھی افطار کرنا جائز نہیں۔

(۲۵) چھوہارے سے افطار کرنا بہتر ہے یا اور کوئی میٹھی چیز ہو، اگر کچھ نہ ہو تو پانی سے افطار کرے اور افطار کے وقت یہ دعا پڑھے۔ (ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ انشاء اللّٰه تعالیٰ) افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

(۲۶) افطاری کھانے میں اس قدر مشغولی کہ مغرب کی جماعت فوت ہو جائے یا کوئی رکعت جاتی رہے بہت ہی خسارہ کی بات ہے بہتر یہ ہے کہ روزہ مسجد میں افطار کیا

کرے تاکہ جماعت نہ جاوے۔

(۲۷) افطاری میں بہت تکلف اور سامان کرنا مکروہ ہے۔

تراویح

(۲۸) ایک ختم کلام مجید تراویح میں سننا اور بیس رکعت تراویح کا ہر رات رمضان میں پڑھنا سنت ہے۔

(۲۹) اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچا کہ تراویح شروع ہوگئی ہے تو اس شخص کو فرض عشا پڑھ کر تراویح میں شریک ہونا چاہیے۔

(۳۰) اگر ایک شخص عشاء کے فرض پڑھ چکا ہے مگر تراویح کی کل رکعتیں یا کچھ رکعتیں جماعت کے ساتھ اس کو نہیں ملیں اور وتر کی جماعت شروع ہوگئی تو اس کو وتر جماعت سے پڑھنا چاہئیں اور تراویح کی رکعتیں وتر کے بعد پڑھے اور اگر ایسے وقت مسجد میں آیا ہو کہ ابھی عشاء کے فرض بھی نہ پڑھے ہوں تو وتر کی جماعت میں شامل نہ ہو پہلے فرض پڑھنا چاہیے۔

(۳۱) تراویح سے جلدی فارغ ہونے کے لئے وقت سے پہلے کھڑے نہ ہوں ورنہ فرض کے چھوٹنے کا گناہ ہوگا۔

(۳۲) عشاء کی اذان تراویح جلدی ختم ہونے کے خیال سے وقت سے پہلے نہ کہلائیں۔

(۳۳) قرآن شریف نہ بہت تیز پڑھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آوے نہ اس قدر ٹھہرا کر کہ مقتدیوں کو تکلیف ہو۔

(۳۴) ثناء اور تشہد اور درود اور رکوع وسجود کی تسبیحیں تراویح میں اطمینان کے ساتھ ادا کرنا چاہئیں۔

(۳۵) اجرت پر قرآن شریف پڑھانا یا سنانا جائز نہیں خواہ تو اجرت ٹھہرالی جائے یا امام کو معلوم ہو کہ مجھ کو دستور کے موافق ضرور کچھ دیا جائیگا دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

(۳۶) ایسے لڑکوں کو تراویح میں امام بنانا مناسب نہیں جن کو پاکی اور نماز کے مسائل معلوم نہیں اگرچہ وہ بالغ ہی ہوں۔

(۳۷) ختم قرآن شریف پر شیرینی کا اہتمام والتزام بدعت ہے خاص کر چندہ کر کے تقسیم کرنا تو اور بھی زیادہ مفاسد کو مشتمل ہے۔

(۳۸) ختم قرآن کے دن مسجد میں روشنی کا خاص اہتمام ثابت نہیں بلکہ گناہ اور اسراف ہے۔

(۳۹) نامحرم حافظوں کو گھر میں بلا کر عورتوں کا قرآن سننا مفاسد سے خالی نہیں۔

سحور (یعنی سحری)

(۴۰) سحری کھانا سنت ہے اور بڑا ثواب ہے اگر بھوک نہ ہو اور کھانا نہ کھائے تو کم سے کم دو تین چھوہارے ہی کھالے ایک آدھ پان کھالے یا پانی ہی پی لے اس سے بھی سحری کا ثواب مل جائے گا۔

(۴۱) بعض لوگ آدھی رات کو سحری کھا لیتے ہیں اس سے پورا ثواب سحری کا نہیں ملتا اور بعض اس قدر دیر کرتے ہیں کہ صبح ہو جانے کا شبہ ہو جاتا ہے اس سے بھی بچنا لازم ہے۔

(۴۲) سحری دیر کر کے کھانا سنت ہے بشرطیکہ اتنی دیر نہ ہو کہ صبح کا شبہ ہونے لگے۔

(۴۳) سحری کے وقت کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں تہجد کی نیت سے کچھ رکعتیں پڑھ لینے کی ضرور ہمت کر لینا چاہیے کہ سال بھر میں ایک مہینہ ہی یہ سنت نصیب ہو جاوے۔

اعتکاف

(۴۴) رمضان کے اخیر دس دنوں میں اعتکاف کرنا سنت ہے اگر بستی بھر میں ایک شخص بھی اعتکاف نہ کرے گا تو سب بستی والے سنت کے تارک ہونگے۔

(۴۵) اعتکاف کے لئے بیسویں تاریخ کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں داخل ہو جانا چاہیے۔

(۴۶) اکیسویں تاریخ سے پہلے کی رات اور تیئسویں رات اور پچیسویں اور ستائیسویں اور انتیسویں رات یہ راتیں شب قدر کہلاتی ہیں ان میں زیادہ جاگنا چاہیے۔

صدقہ فطر

(۴۷) جس شخص کے پاس پچاس روپیہ کی مالیت کی چیز اپنی حاجت سے زیادہ ہو خواہ نقد ہو یا زیور یا کرایہ پر چلنے والے مکانات یا مویشی وغیرہ ہوں اس پر واجب ہے کہ اپنی طرف سے اور اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے۔

(۴۸) انگریزی تول سے ایک سیر ڈھائی پاؤ پختہ گیہوں صدقہ فطر کی مقدار ہے اور پورے پونے دو سیر زیادہ بہتر ہے اگر اتنے گیہوں کی قیمت ادا کر دے یہ بھی جائز ہے۔

(۴۹) بعض جگہ خصوصاً دیہات میں مسجد کے مؤذن اور امام وغیرہ کو یہ کہہ کر مقرر کیا جاتا ہے کہ تم کو عید میں بھی کچھ مل جائے گا۔ یا زبان سے نہ کہا جاوے مگر دستور کے موافق وہ صدقہ فطر کو اپنا حق سمجھتے ہیں اس صورت میں مؤذن اور امام مسجد اور سقہ وغیرہ کو صدقہ فطر دینا جائز نہیں اور اگر دیدیا تو صدقہ فطر ادا نہ ہوگا۔ ہاں اگر مقرر کرتے وقت ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ صدقہ فطر میں تمہارا کوئی حق نہیں پھر غریب سمجھ کر ان کو دیا جائے اور وہ واقع میں غریب بھی ہوں، تو اس صورت میں ان کو صدقہ دینا جائز ہے اور یہی حکم قربانی کی کھال کا ہے۔

(۵۰) جو بچہ عید کے دن صبح صادق سے پہلے پیدا ہو اس کی طرف سے بھی فطرانہ دینا باپ کے ذمہ واجب ہے اور اگر صبح صادق کے بعد پیدا ہوا ہے تو واجب نہیں۔ اگر چہ عید کی نماز سے پہلے ہی پیدا ہوا ہو اور جو بچہ عید کے دن صبح صادق سے پہلے مر جاوے اس کی طرف سے بھی فطرہ دینا واجب نہیں اور جو صبح کے بعد مرے اس کی طرف سے دینا واجب ہے۔

(۵۱) یہ ضروری نہیں کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے ہوں اس پر صدقہ فطر واجب ہو بلکہ جس نے روزے نہیں بھی رکھے اور وہ پچاس روپیہ کی مالیت رکھتا ہو تو اس کو صدقہ فطر دینا ہوگا۔ روزوں کی فرضیت مستقل ہے اور صدقہ فطر کا وجوب مستقل ہے۔

(۵۲) باپ، ماں، دادا، دادی، نانا، نانی، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی کو اور

خاوند کا بی بی کو اور بی بی کا خاوند کو صدقہ فطر دینا جائز نہیں اور بنو ہاشم اور غنی کو دینا بھی جائز نہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو اگر وہ غریب ہوں جائز ہے بلکہ غیروں کو دینے سے عزیزوں کو دینا زیادہ ثواب ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ کہہ کر صدقہ دے کہ یہ صدقہ فطر ہے بلکہ بہتر ہے کہ ظاہر نہ کیا جاوے تا کہ لینے والے کو شرم و عار نہ آئے۔ پس اگر اپنے محتاج رشتہ داروں کے بچوں کو عیدی کے نام سے صدقہ فطر دیدیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

(۵۳) بہتر یہ ہے کہ عید کے دن صبح صادق کے بعد اور نماز عید سے پہلے صدقہ فطر ادا کر دیا جاوے اگر کسی وجہ سے اس وقت نہ دیا گیا تو یہ واجب ذمہ میں رہے گا پھر کسی وقت ادا کرنا لازم ہے۔

(۵۴) بی بی اور بالغ اولاد کی طرف سے خاوند اور باپ پر صدقہ فطر ادا کرنا واجب نہیں البتہ اگر خاوند نے مہر ادا نہ کیا ہو تو بی بی اس سے یہ کہنے کا حق رکھتی ہے کہ میرے مہر میں سے صدقہ فطر ادا کر دو۔

عید

(۵۵) عید الفطر کے دن بارہ چیزیں مسنون ہیں شریعت کے موافق زینت کرنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، عمدہ کپڑے جو پاس موجود ہوں پہننا (بشرطیکہ شرع کے موافق ہوں یعنی ریشمی نہ ہوں، پائجامہ، کرتہ، چوغہ وغیرہ ٹخنوں سے نیچا نہ ہو اور کافروں کے لباس کے مشابہ نہ ہو) خوشبو لگانا، صبح کو سویرے اٹھنا، عید گاہ سویرے جانا۔ عید گاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھالینا۔ عید گاہ جانے سے پہلے صدقہ فطر دینا۔ عید کی نماز بلا عذر شہر میں نہ پڑھنا۔ جس راستہ سے جاوے اس کے علاوہ دوسرے راستہ سے واپس آنا، پیادہ جانا اور راستہ میں اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہِ الحمد آہستہ کہنا اور نماز عید کے بعد خطبہ مستحب ہے اور حاضرین پر اس کا سننا واجب ہے اس وقت بولنا چالنا نماز پڑھنا حرام ہے۔

(۵۶) عید الفطر کی نماز پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ اول یوں نیت کرے کہ ”میں

دو رکعت نماز واجب عید الفطر معہ چھے تکبیر کے ادا کرتا ہوں، پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے اور سبحانک اللّٰہم پڑھ کر تین مرتبہ اللہ اکبر کہے ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھاوے اور تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑے اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لے۔ پھر امام قرأت شروع کرے اور مقتدی خاموش کھڑا رہے۔ اور حسب دستور دو رکعت پڑھے۔ دوسری رکعت میں الحمد اور سورت پڑھنے کے بعد امام اور اس کے ساتھ سب مقتدی تین بار اللہ اکبر کہیں ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور یہاں تیسری تکبیر کے بعد بھی ہاتھ چھوڑ دیں پھر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائیں۔

(۵۷) اکثر لوگ عید کے دن سویاں اور شیر پکانا ضروری سمجھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے شریعت میں اس کی کوئی تخصیص نہیں۔

(۵۸) بعض لوگ کپڑوں کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ قرض لیکر نئے بناتے ہیں یا مانگ کر پہنتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی اصل نہیں۔

(۵۹) اگر عید کی نماز میں ایسے وقت پہنچا کہ امام رکوع میں جا چکا ہے تو اگر تین تکبیریں کہہ کر یہ رکوع میں شامل ہوسکتا ہو تو تکبیر تحریمہ کے بعد تین تکبیریں جلدی جلدی کہہ کر رکوع میں شریک ہو ورنہ تکبیر تحریمہ کہہ کر رکوع میں شامل ہو جاوے اور رکوع میں وہ تین تکبیریں کہہ لے اگر امام کو عید کی نماز میں کوئی سہو ہو جائے جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے تو سجدہ سہو نہ کرے کہ اس سے بہت آدمیوں کی نماز خراب ہو جائے گی اور دور والوں کو سجدہ سہو کی اطلاع نہ ہوگی۔

(۶۰) عید کے روز باہم ایک دوسرے کو مبارکباد دینا اور عید مبارک کہنا مستحب ہے۔ باقی نماز عید کے بعد معانقہ یا مصافحہ بالالتزام کرنا بدعت ہے البتہ اگر باہر سے لوگ آئے ہوں ان سے اور دنوں کی طرح ملاقات کے طور پر مصافحہ کا مضائقہ نہیں۔

(۶۱) تار کی خبر کا شریعت میں اعتبار نہیں ایسی خبروں سے افطار کرنا جائز نہیں جب تک بقاعدہ شریعت چاند کا ثبوت نہ ہو جاوے ہرگز افطار نہ کریں۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب

﴿مسلمانوں کے زوال کے اسباب﴾

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الحمد للّٰہ و کفی و سلام عَلٰی عبادہ الذین اصطفٰے

اما بعد

(۱) ﴿قَالَ اللّٰہ تعالٰی هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ. یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ﴾

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کی تائید کی اپنی نصرت سے اور مومنین سے۔ اور ان کے دلوں میں محبت ڈال دی۔ اگر آپ تمام زمین کی دولت خرچ کر دیتے تب بھی ان میں الفت نہ پیدا کر سکتے۔ لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈال دی بیشک وہ بڑا غالب اور حکیم ہے۔ اے نبی آپ کو اللہ کافی ہے اور یہ مومنین جو آپ کی پیروی کرتے ہیں۔ اے نبی! نبی مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیتے رہئے۔''

(۲) ﴿وقال تعالیٰ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّکُمْ وَ

اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ. وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْکُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾

(ترجمہ) ''ایک جگہ ارشاد ہے۔ان کافروں کے مقابلہ کے لئے سامان تیار رکھو جتنا بھی تم سے ہو سکے قوت حاصل کرو اور گھوڑے باندھو جس سے خدا کا دشمن اور تمہارا دشمن مرعوب ہو جائے اور ان کے سوا دوسرے اور بھی جن کو تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور جو کچھ اللہ کے راستہ میں (جہاد کے لئے) خرچ کرو گے تم کو پورا دیدیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔''

(۳) ﴿وقال تعالٰی وَ مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَاءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا٥﴾

(ترجمہ) ''نیز فرماتے ہیں کہ تم کو کیا ہوا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد نہیں کرتے اور ان کمزور مردوں، عورتوں، بچوں کے لئے بھی نہیں لڑتے جو ان ظالموں کے ظلم سے گھبرا کر دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی ہمارا دوست اور مددگار بھیج دیجئے۔''

(۴) ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنَاهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ٥﴾

''نیز ارشاد ہے کہ اگر یہ بستی والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے مگر انہوں نے (اپنے قول یا عمل سے) ہم کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کے سبب ان کو پکڑ لیا۔''

(۵) ﴿وقال تعالیٰ و قضینا الٰی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علواً کبیرا فاذا جاء وعد ولهما بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی بأس شدید فجاسوا خلال الدیار و کان وعدًا مفعولاً o﴾

(ترجمہ) ''ایک جگہ ارشاد ہے اور ہم نے بنی اسرائیل سے فیصلہ کن بات کہہ دی تھی کہ تم زمین میں دوبار فساد کرو گے اور بہت زیادہ تکبر کرو گے جب پہلا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلہ کے لئے اپنے بہادر بندوں کو کھڑا کر دیا تو وہ ہمارے گھروں میں گھس پڑے اللہ نے تم کو نکال باہر کیا اور ہمارا قول پورا ہو کر رہا۔

(۶) ﴿وقال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم و قد سئل عن الساعة اذا ضیعت لامانة فانتظر الساعة قال کیف اضاعتها یا رسول اللّٰہ قال اذا وسّد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة رواه البخاری﴾

(ترجمہ) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب امانت ضائع کر دی جائے قیامت کا انتظار کرو۔ پوچھا گیا کہ امانت کیوں کر ضائع کی جائے گی؟ فرمایا جب (حکومت وغیرہ کا) کام نااہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو امانت ضائع ہوگی اس وقت کا انتظار کرو۔''

(۷)﴿ وقال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم لتتبعن سبل من قبلکم شبراً بشبر ذراعاً بذراعٍ حتی لو دخلوا

حجر ضب لدخلتموھا رواہ البخاری ﴾

(ترجمہ) ''نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی اپنے سے پہلے لوگوں کے راستہ پر چلو گے ہاتھ در ہاتھ بالشت در بالشت یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسیں گے تو تم بھی اس میں گھسو گے۔''

(۸) ﴿وقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا رابت شحا مطاعاً وھویً متبعاً و دنیاً . موثرۃ واعجاب کل ذی رأی برأیہ فعلیک بخاصۃ نفسک ودع عنک لبرا الطامہ. ﴾

(ترجمہ) ''نیز آپ کا ارشاد ہے جب تم دیکھو کہ حرص کی اطاعت کی جا رہی ہے، خواہش نفس کی پیروی کی جا رہی ہے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو (دوسروں کو رائے سے) اچھا سمجھتا ہے (اس لئے مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھتا) تو اپنی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔''

(۹) ﴿وقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر. ﴾

(ترجمہ) ''نیز حضور کا ارشاد ہے کہ دنیا مومن کا جیل خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔''

(۱۰) ﴿کن فی الدنیا کانک غریب اوعا برسبیل. ﴾

(ترجمہ) ''نیز آپ کا ارشاد ہے۔ فرمایا کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے پردیسی (پردیس میں) رہتا ہے یا مسافر (راستہ میں رہتا ہے)

اب ان آیات واحادیث کے معانی ومطالب پر غور کیجئے تو مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

(۱) پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی کامیابی کا پہلا سبب اللہ تعالیٰ کی

نصرت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ تھی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور سے فرمادیا ہے۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِىْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ ۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''اگر اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہو تو کوئی تم پر غالب نہیں ہوسکتا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ اور اللہ پر ہی مسلمانوں کو بھروسہ کرنا چاہیے اس کے سوا کسی کی مدد پر بھروسہ نہ کیا جائے۔''

اللہ تعالیٰ کی مدد کیونکر ہمارے ساتھ ہوگی اس کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾

''اگر تم اللہ کی مدد کرو (یعنی اللہ کے دین کا بول بالا کرنا چاہو) تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا (ثابت قدمی عطا کرے گا)۔''

ایک آیت میں اللہ کے دین کی مدد کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔

﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝﴾

''اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کی مدد کرنے پر قادر ہے جن کی شان یہ ہے کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار بخشیں (حکومت و سلطنت عطا کریں) تو وہ نماز کو قائم کریں (جو عبادات بدنیہ میں سے بڑی عبادت ہے) اور زکوۃ دیں (جو طاعات مالیہ میں سے

سب سے بڑھ کر ہے) اور نیک کاموں کا امر کریں اور ہر برائی
سے لوگوں کو روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں
ہے۔"

ایک جگہ ارشاد ہے۔

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾

"اور تم ہی سب پر غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔"

اور ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ قول کے ساتھ عمل بھی ہو جو اوپر بتلا دیا گیا کہ عبادات بدنیہ اور عبادات مالیہ کی پابندی کی جائے۔ نیکی کو پھیلایا جائے بدی کو مٹایا جائے۔ غرض پہلے مسلمانوں کے ساتھ نصرت الٰہی اسی لئے تھی کہ وہ سچے مومن تھے۔ ان میں الفت ومحبت اور اتفاق واتحاد بھی پورا تھا۔ اس کو بھی غلبہ واقتدار میں پورا دخل ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿وَ اَطِیْعُو اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ۝﴾

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نزاع مت
کرو کہ اس سے دلوں میں بزدلی پیدا ہو جائے گی۔ اور تمہاری ہوا
اکھڑ جائے گی (یعنی دشمن پر رعب نہ رہے گا۔"

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جب دشمن کو ہمارے باہمی نزاع واختلاف کا پتہ چل جاتا ہے اس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں) اور صبر واستقامت سے کام لو کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے غلبہ کے لئے اللہ کی مدد اور مؤمنین کی جمعیت کافی ہے غیر مسلموں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ بشرطیکہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والے ہوں۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیجئے۔ کیونکہ جہاد کو بھی مسلمانوں کے غلبہ اور عروج میں

بڑا دخل ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے ذلیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے صدیوں سے جہاد کو چھوڑ دیا عیش پرستی میں پڑ گئے یا آپس میں مسلمان مسلمان سے لڑتا ہے، کفار سے جہاد کا مقصود اسلام اور حکومت اسلام کی حفاظت ہے، تلوار کے زور سے اسلام کی اشاعت مطلوب نہیں۔ کیونکہ تلوار کے زور سے جو لوگ اسلام لائیں گے۔ وہ منافق ہوں گے اور قرآن میں منافقوں کو سب کافروں سے بدتر کہا گیا ہے۔ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ. پھر مسلمان منافقوں کی بھرتی کے طلبگار کیسے ہو سکتے ہیں؟

(۲) ان آیات میں جہاد کے لئے سامان تیار کرنے کا حکم ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق جس قدر ہو سکے قوت بہم پہنچاؤ، اور گھوڑے بھی باندھو۔ حدیث میں قوت کی تفسیر میں تیر اندازی کو بیان کیا گیا ہے، اس وقت یہی بڑی قوت تھی، آجکل اس کی جگہ بندوق، رائفل، توپ، مشین گن، میزائل وغیرہ ہیں۔ گھوڑوں کی ضرورت جنگ میں اب بھی کسی وقت ہوتی ہے۔ مگر زیادہ تر ٹینک، بکتر بند گاڑیاں کام میں آتی ہیں۔ ان سب کا تیار کرنا اور اپنے یہاں ان کا ذخیرہ رکھنا ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ افسوس ہے کہ اسلحہ سازی کے فن میں سلاطین اسلام اس وقت بہت پیچھے ہیں۔ ہمارے اسلاف ایسے نہ تھے وہ اس زمانہ کے اسلحہ خود تیار کرتے تھے اور اس کے لئے کارخانے قائم کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت معاویہؓ نے خلافت عثمانی میں پانچ سو بحری جہازوں کا بیڑا تیار کیا تھا۔ جس نے ہرقل کا بحری بیڑہ بری طرح پامال کر ڈالا تھا۔ اور اس کے لئے وہ کفار کی دست نگر نہ تھے بلکہ خود مسلمان کاریگروں سے یہ بیڑا تیار کرایا تھا۔ بندوق سب سے پہلے بابر بادشاہ کے ہاتھ میں دیکھی گئی۔ اس سے پہلے کسی نے بندوق استعمال نہیں کی تھی۔ افسوس کہ سلاطین اسلام نے اس میں ترقی نہ کی۔ یورپ نے بہتر سے بہتر بندوق، رائفل، مشین گن بنا ڈالیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اسلحہ سازی میں کسی سے پیچھے نہ

رہے۔خود اپنے یہاں ہر قسم کے ہتھیار بتیار کریں۔جبھی دشمنان اسلام پر ان کا رعب قائم ہوگا۔ جب تک دوسروں کے دست نگر رہیں گے ہرگز ان پر رعب قائم نہ ہوگا۔اور حکم الٰہی یہ ہے کہ اتنی قوت بہم پہنچائی جائے جس سے دشمن مرعوب ہوئے۔

خدا کا شکر ہے کہ سلاطین اسلام کے پاس دولت کی کمی نہیں دو درجن کے اوپر مسلمان سلاطین اب بھی موجود ہیں۔اگر یہ سب مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کر دیں جن میں سب کی شرکت ہو تو امید ہے کہ اتنی قوت بہم پہنچ سکتی ہے جس سے دشمن پر رعب قائم ہو جائے۔ وہ تو سلاطین اسلام کے اتحاد سے ہی خائف ہیں اگر یہ سب مل کر مشترک کارخانے قائم کرلیں تو بہت زیادہ مرعوب ہو جائیں گے۔

(۳) ان آیتوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جس جگہ مسلمان کفار کے ظلم کا شکار ہوں وہاں ظالم حکومت سے جہاد کرنا اور مسلمانوں کو ان کے ظلم سے نجات دلانا فرض ہے، جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد کارفرما تھا کسی جگہ بھی مسلمانوں پر کسی حکومت کو ظلم کرنے کی مجال نہ تھی۔ کفار جانتے تھے کہ حکومت اسلام فوراً جہاد کا اعلان کر کے ہم پر حملہ کر دے گی۔مگر اب یہ حال ہے جابجا غیر مسلم حکومتوں میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے ان کے لیے عزت و امن و امان کے ساتھ زندہ رہنا دشوار ہے، مگر سلاطین اسلام زبانی یا کاغذی احتجاج کے سوا کچھ نہیں کرتے، اگر سب مسلمان سلاطین متحد ہو کر ان کو الٹی میٹم دیدیں کہ مسلمانوں پر ظلم سے باز آؤ ورنہ ہم سب جہاد کے لئے میدان میں آجائیں گے۔ تو پھر کسی کافر حکومت کو مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی جرأت نہ ہو۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر جارحانہ حملہ کیا تھا تو حکومت ایران اور ترکی نے پاکستان کی امداد کا اعلان کر دیا اس سے پاکستانی فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔اور ہندو فوج ایسی مرعوب ہوئی کہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگی، ضرورت ہے کہ اس جذبہ جہاد سے ہر جگہ کام لیا جائے تو انشاءاللہ مسلمان ہر جگہ غالب اور معزز ہوں گے۔

(۴) ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ ایمان اور تقویٰ سے صرف آخرت ہی نہیں بنتی بلکہ دنیا بھی سنورتی ہے اس کی وجہ سے زمین کی برکتوں کے دروازے کھل جاتے

ہیں۔ آجکل ہماری حکومتیں اضافہ آبادی سے خائف ہو کر برتھ کنٹرول اور ضبط تولید کی تدبیریں سوچتی ہیں مگر ایمان وتقویٰ سے زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے نہیں کھولتیں۔ ضرورت ہے کہ زرعی پیداوار میں ترقی کے ساتھ ساتھ ایمان وتقویٰ میں بھی ترقی کریں۔ تو ضبط تولید کی نوبت ہی نہ آوے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ ضبط تولید کی تدابیر سے زنا کی کثرت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔ پہلے ہر کنواری اور بیوہ کو زنا کاری سے حمل ٹھہر جانے اور دنیا کی نظروں میں ذلیل ہونے کا خوف تھا اب ضبط تولید کے اسباب سے کام لے کر یہ خوف جاتا رہا۔ اور زنا کی کثرت ہوگئی جس کی وجہ سے نئی نئی بیماریاں اور بلائیں نازل ہونے لگیں۔

ابر نایداز پئے منع زکات وز زنا افتدو با اندر جہات

(۵) ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ کسی وقت اہل ایمان ظلم وفساد پر کمر بستہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کفار کو ان پر مسلط کر دے گا۔ بنی اسرائیل اہل ایمان تھے مگر جب انہوں نے سلطنت وحکومت کے نشہ میں ظلم وفساد پر کمر باندھ لی تو خدا نے کافروں اور بخت نصر جیسے مشرکوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ جنہوں نے شام سے بھی اسرائیل کو نکال باہر کیا۔ اور بیت المقدس پر قبضہ کر کے اس کی بیحرمتی کی۔ پس مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ ظلم وفساد کے باوجود بھی وہ سب پر غالب ہی رہیں گے۔ خدا ظالم کو ضرور پکڑتا ہے اور مسلمان ظلم پر کمر بستہ ہوں تو کافروں کے ہاتھ سے ان کو ذلیل کرتا ہے۔ اگر کوئی شریف آدمی ناحق کسی کو قتل کر دے تو بھنگیوں کے ہاتھوں اسے سولی پر پھانسی دی جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار.

(۶) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا سبب امانت کا حق ادا کرنا تھا۔ جب سے اس میں کمی آ گئی اسی وقت سے زوال شروع ہو گیا۔ امانت کے ضائع ہونے کی صورت بھی آپ نے بتلا دی کہ نااہلوں کے سپرد کام کیا جائے۔ سب سے بڑا کام حکومت اور سلطنت ہے جب سے اس کو وراثت میں تبدیل کر دیا گیا ایک ہی خاندان میں منحصر کر دیا گیا کہ باپ کے بعد بیٹا بادشاہ ہو خواہ لائق ہو یا نہ ہو اسی وقت سے زوال شروع ہو گیا، باپ کے بعد بیٹے کو بوجہ لیاقت اور صلاحیت کے اہل الرائے بادشاہ

بنالیں تو اس کا مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد امام حسن رضی اللہ عنہ کو اسی بناء پر خلیفہ بنایا گیا تھا کہ اس وقت وہ سب سے افضل تھے۔ اس کو میراث بنالینا کہ باپ کے بعد بیٹا ہی بادشاہ ہو خواہ کیسا ہی ہو، امانت کو ضائع کرنا ہے۔ اسی طرح جو طریقہ آجکل رائج ہے کہ اس عہدہ کے لئے چند آدمی اپنا نام پیش کرتے ہیں پھر ان میں الیکشن ہوتا ہے ہر امیدوار اپنے حق میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے دورہ کرتا پھرتا ہے۔ یہ بھی اسلام میں پسندیدہ طریقہ نہیں۔ حدیث صحیح میں طلب امارت سے منع کیا گیا ہے اور طالب امارت کو امارت دینے کی بھی ممانعت ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے باشندوں میں جو سب سے بڑے اور معتمد علیہ شمار ہوتے ہیں ان کو اہل حل وعقد بنا دیا جائے اس مجلس میں سرداران قبائل بھی ہوں وہ اپنی صوابدید سے جس کو قابل اور لائق سمجھیں اس عہدہ کے لئے نامزد کریں۔ کسی کو خود درخواست کرنے اور اپنے حق میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے دورہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ اس صورت میں حکومت کا خرچ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور ووٹ حاصل کرنے میں بعض دفعہ دباؤ اور طمع سے بھی کام لیا جاتا ہے اور نا قابل پاس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر محکمہ کا سربراہ قابل اور لائق آدمی کو بنایا جائے صرف ڈگری یافتہ ہونے کو نہ دیکھا جائے کہ بعض دفعہ کودن بھی ڈگری پالیتا ہے، ہر کام کے لئے جس قابلیت کی ضرورت ہے اہل حل وعقد اس کو خود جانتے ہیں اس کے ساتھ اس وصف کو بھی دیکھنا ضروری ہے جس پر اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ جس کا ترجمہ اور مطلب شروع میں بیان ہو چکا۔

(۷) اس حدیث میں مسلمانوں کے زوال کا سبب بتلا دیا گیا ہے کہ جب حرص کی اطاعت کی جائے خواہش نفس کی پیروی کی جائے دنیا کو دین پر مقدم کیا جائے۔ ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھے، مشورہ کرنا چھوڑ دیں تو اس وقت عوام کی اصلاح دشوار ہو جائے گی، ہر ایک کو اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر مسلمان ترقی اور عروج کے طلبگار

ہیں تو ان کو ان اسباب زوال سے بچنا چاہیے۔ جن کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کو لازم ہے کہ حرص وطمع کی اطاعت نہ کریں۔ خواہش نفس کی پیروی چھوڑ دیں۔ دین کو دنیا پر مقدم کریں اور اپنی رائے کو دوسروں کی رائے سے اچھا نہ سمجھیں کہ یہ تکبر ہے اور متکبروں میں اتحاد واتفاق نہیں ہوسکتا، تواضع اختیار کریں۔ اور ہر مہتم بالشان کام میں مشورہ کو ضروری سمجھیں، اس سے ہر کام کے سب پہلو سامنے آ جائیں گے۔ مشورہ کے بعد جو کچھ کیا جائے گا اس میں خیر و برکت ہوگی، اور قوم میں اتفاق واتحاد بھی باقی رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی ضرورت نہ تھی لیکن تالیف قلوب کیلئے آپ کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. تاریخ شاہد ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی خلافت اسی لئے کامیاب تھی کہ وہ مشورہ بہت کرتے تھے۔ اس حدیث سے مسلمانوں کے زوال کا سبب معلوم ہوا کہ یہ دوسری قوموں کی پیروی کرنے لگیں گے۔ مذہب میں بھی تمدن میں بھی ثقافت میں بھی سیاست میں بھی صورت وشکل میں بھی اسی سے ان کا زوال شروع ہو جائے گا۔ مسلم قوم کو دنیا کی امانت سونپی گئی تھی۔ جب امام امانت کو چھوڑ کر مقتدی بن جائے تو زوال یقینی ہے۔ اول خلافت عباسیہ میں ایرانی تمدن نے جگہ لی عربی تمدن ختم ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ تمام بلاد اسلام میں دوسری قوموں کا تمدن گھر کرنے لگا اور اب تو یہ حالت ہے کہ سیاسیات میں بھی دوسری قوموں کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ وہ الیکشن کی لعنت جو یورپ میں ہے۔ مسلمانوں میں آ گئی ہے۔

اسلام نے کہا تھا الرجال قوامون على النساء مرد عورتوں کے نگران ہیں۔ مسلمان بھی یورپ کی دیکھا دیکھی عورتوں کو مردوں کے مساوی بنا رہے ہیں، ان کو بھی الیکشن لڑنے کا اور انتخابات میں رائے دینے کا حق دیا جا رہا ہے وزارت تک میں ان کو لیا جا رہا ہے۔ مرد کو دوسری شادی کرنے کیلئے پہلی بی بی سے اجازت لینے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے، بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو وارث بنایا جا رہا ہے، تعلیم مخلوط کو رواج دیا جا رہا ہے، لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم پائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکے فیل اور

لڑکیاں پاس ہو رہی ہیں۔ پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ بے پردگی کو رواج دیا جا رہا ہے۔ سینما کی گرم بازاری ہے، جس میں مردوں سے زیادہ عورتیں حصہ لے رہی ہیں۔ اسکولوں میں لڑکیوں کو رقص و سرور کی تعلیم دی جا رہی ہے، علوم اسلامیہ کی تعلیم اسکول کالجوں میں برائے نام ہے، علوم عصریہ ہی کی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ طلبہ میں دین سے اخلاق سے آزادی کی وبا پھیل رہی ہے۔ کوئی کمیونزم کا حامی ہے، کوئی سوشلزم کا کوئی احکام دین میں ترمیم کر رہا ہے۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم کو بھی دین میں فتویٰ دینے کا حق ہے۔ فتویٰ دینا کسی خاص طبقہ کی جاگیر نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا صرف انگریزی یا اردو میں قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھ کر یہ درجہ حاصل ہو سکتا ہے، یا اس کے لئے باقاعدہ تعلیم عربی بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ ترجمہ سے عالم دین بن سکتے ہیں تو ترجمہ پڑھ کر کسی کو ڈاکٹر بننے، وکیل بیرسٹر بننے، انجینئر اور پروفیسر بننے کی بھی اجازت دے دیجئے اور اگر ان علوم کے لئے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا اور امتحان پاس کرنا ضروری ہے تو مفتی دین بننے کے لئے اس کی ضرورت کیوں نہیں؟

یاد رکھئے صرف وسعت مطالعہ اور تراجم پڑھ لینے سے کوئی بھی کسی علم کا عالم نہیں بن سکتا، اکبر حسین جج مرحوم نے صحیح فرمایا ہے

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہکر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

ابوحیان توحیدی نے کہا ہے۔ **ومن طلب العلوم بغیر شیخ یضل عن الصراط المستقیم** جو شخص بغیر شیخ (استاد) کے عالم بننا چاہے گا صراط مستقیم سے گمراہ ہو جائیگا۔ یعنی صراط مستقیم کو گم کر دے گا۔ بعض لوگوں کو علماء پر اعتراض ہے کہ انہوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے لوگوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہ اجتہاد مطلق ہے جس میں قرآن وحدیث سے استنباط احکام کے اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ چونکہ فقہاء اربعہ نے ان اصولوں کو پوری طرح بیان کر دیا ہے کہ اب نہ ان پر اضافہ کیا جا سکتا ہے نہ اس سے بہتر اصول کوئی بیان

کر سکتا ہے۔ اس لئے اب اجتہاد مطلق کی ضرورت نہیں۔

علامہ سیوطیؒ کو ایک وقت یہ خیال ہوا تھا کہ ان کو اسباب اجتہاد میسر ہو گئے ہیں۔ علماء عصر نے مجتمع ہو کر ان کو بلایا اور کہا اگر آپ کو درجہ اجتہاد حاصل ہے تو ائمہ اربعہ کے اصول چھوڑ کر اپنے اصول بیان فرمائیں اس پر انہوں نے اعتراف کیا کہ واقعی نہ اصول پر اضافہ ہوسکتا ہے نہ ان سے بہتر اصول کوئی بیان کر سکتا ہے۔ یہ اجتہاد ان ائمہ پر ختم ہو چکا ہے۔

مگر اجتہاد مقید کا دروازہ بند نہیں ہوا کہ ان اصول کو پیش نظر رکھ کر مسائل کا جواب دیا جائے یہ اجتہاد قیامت کے قریب تک جاری رہے گا اور علماء اصول ائمہ کو سامنے رکھ کر قیامت تک کے حوادث کا جواب دیتے رہیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس طرح ہر شخص تو مجتہد نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے اصول سے پوری واقفیت لازم ہے مگر آج کل علوم قرآن وحدیث واصول فقہ میں کمال کون حاصل کرتا ہے علوم عصریہ ہی میں کمال حاصل کرتے ہیں، دوسری ہی قوموں کی اتباع میں خوش ہیں، کھانے پینے کا طریقہ بھی وہی یورپین طریقہ ہے، میز کرسی پر کھاتے ہیں اور انگریزی طریقہ ہی سے کھاتے ہیں، لباس اور صورت شکل میں بھی ان ہی کا اتباع ہے۔ ہمارے بچپن میں سلاطین یورپ ڈاڑھی رکھتے تھے تو مسلمان بھی رکھتے تھے اب انہوں نے منڈانا شروع کیا تو یہ بھی منڈانے لگے۔ ایک حکومت سعودیہ تو اس بلا سے محفوظ ہے کہ ان کا لباس بھی عربی ہے، چہروں پر داڑھی بھی ہے گو بڑی نہیں۔ جب میں ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے وفد خیر سگالی میں شامل ہو کر مکہ معظّمہ پہنچا اور وفد نے سلطان عبدالعزیز بن سعود سے ملاقات کی تو میرے سوا سب ڈاڑھی کا شیو کئے ہوئے تھے۔ سلطان نے مجھ سے پوچھا (کیونکہ میں ہی عربی میں ان سے گفتگو کر رہا تھا) **مالی لا اری فیھم ذی الاسلام** کیا بات ہے میں آپ کے ساتھیوں میں اسلام کی شکل وصورت نہیں دیکھتا؟ میں نے عرض کیا کہ یہ لوگ ابھی تک حکومت انگریز کے ماتحت تھے ابھی آزادی نصیب ہوئی ہے انشاء اللہ بتدریج اسلامی شکل اختیار کر لیں گے۔

سلطان نے فرمایا ان سے کہہ دو کہ اس آیت پر عمل کریں اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُو الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ مسلمان عام طور سے داڑھی کو اسلامی شعار سمجھتے ہیں سلطان نے بھی اس کو ذی الاسلام قرار دیا۔ ڈاڑھی مونڈنے والے بھی نماز کا امام ڈاڑھی منڈے کو نہیں بناتے مسلمانوں کو اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی تھی یا نہیں؟ ان کو قرآن و حدیث سے معلوم ہوگا کہ جملہ انبیاء علیہم السلام داڑھی رکھتے تھے۔ قرآن میں ہے۔ یا ابن ام لا تَأْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَ لاَ بِرَاسِیْ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ط اے بھائی (موسیٰ) میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو نہ پکڑو۔ الخ۔ حدیث میں ہے۔

﴿لکن ربی امرنی باعفاء اللحی و قص الشوارب﴾

''میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کترنے کا حکم دیا ہے''

رہا یہ کہ داڑھی کہاں تک بڑھانی چاہیے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو صحابہ میں سب سے زیادہ متبع آثار رسول مانے جاتے ہیں بتلا دیا ہے کہ ایک مشت تک بڑھانا ضروری ہے۔

(۹) اس حدیث میں مسلمانوں کے عروج کا راز بتلایا گیا ہے کہ وہ دنیا کو جیل خانہ سمجھتے ہیں جبکہ کافر اس کو جنت سمجھتے ہیں، حدیث میں اس پر بھی اشارہ ہے کہ مسلمان کافر کی جنت پر اسی وقت غالب ہو سکتے ہیں جب خود دنیا کو جنت نہ بنائیں۔ اگر یہ بھی دنیا کو جنت بنائیں اور اس سے دل لگالیں تو کافر کی جنت پر غالب نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ تمہاری جنت نہیں ہے کافر کی جنت ہے حضرات صحابہ اور تابعین کے عروج کا راز یہی تھا کہ وہ دنیا کو جنت نہیں سمجھتے تھے۔ جیل خانہ سمجھتے تھے اور شہادت کے طالب تھے۔

مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کے قتل کئے جانے کے بعد طلیحہ بن خویلد اسدی نے دعویٰ نبوت کیا تو صحابہ نے اس کو بھی نہ بخشا اور اس کے قتل کے لئے فوج بھیج دی طلیحہ بن

خویلد کی فوج چالیس ہزار سے اوپر تھی اور صحابہ کی فوج پانچ ہزار سے کچھ زیادہ تھی، مقابلہ ہوا تو طلیحہ کو شکست ہوئی اور میدان سے بھاگ گیا، طلیحہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ مسلمانوں کی فوج تعداد میں ہم سے بہت کم تھی پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری فوج کو شکست ہو گئی۔ وزیر نے کہا کہ مسلمان تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہے مگر اتنی بات میں نے بھی دیکھی ہے کہ ہماری فوج کا ہر سپاہی یہ چاہتا تھا کہ میں بچ جاؤں۔ میرے پاس والے مارے جائیں اور مسلمانوں کا ہر سپاہی یہ چاہتا تھا کہ میں پہلے شہید ہو جاؤں۔ دوسرے میرے بعد ہوں تو جو قوم موت سے بیخوف ہو کر شہادت کی طالب ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ بعد میں طلیحہ نے دعوائے نبوت سے توبہ کی اور سچا مسلمان ہو گیا، فتوحات شام وعراق میں بڑے کارنامے انجام دیئے جو قوم دنیا کو جیل خانہ سمجھے گی وہ دنیا کو دین پر مقدم نہ کرے گی احکام الٰہی کی پوری پیروی کرے گی اور ہر وقت جہاد کے لئے تیار اور شہادت کی طلب گار رہے گی۔ پھر اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

(۱۰) اس حدیث میں بھی مسلمانوں کے عروج کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہتے ہیں جیسے پردیسی پردیس میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ پردیس سے دل کون لگاتا ہے انسان پردیس میں رہ کر اپنے اصلی وطن کے لئے دولت جمع کرتا ہے، اسی طرح مسلمان دنیا میں رہ کر جنت کے لئے سامان جمع کرتا ہے کہ وہی اس کا وطن اصلی ہے اور بعضے خاص لوگ تو دنیا میں ایسے رہتے ہیں جیسے مسافر راستہ میں کسی جگہ پڑاؤ کرتا ہے ظاہر ہے کہ پڑاؤ سے دل کون لگاتا ہے، اس میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرتا اور بقدر ضرورت آرام کا سامان کرتا ہے، جب مسلمان دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تھے جنت کو وطن اصلی جانتے تھے تو ان کے اعمال، اخلاق، معاشرت اور معاملات سب شریعت کے موافق ہوتے تھے تاکہ وطن اصلی میں اعمال صالحہ کا ذخیرہ پہنچائیں دنیا سے بقدر ضرورت تعلق رکھتے تھے موت سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ اس کے مشتاق رہتے تھے کہ وہی پردیس سے اصلی وطن پہنچنے کا وقت ہے۔ اب مضمون تو ختم ہو گیا ہے۔ تمہ کے طور پر چند واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) ہرمزان فارسی فارس کا بڑا بہادر نواب تھا۔ اس نے مسلمانوں سے جنگ کی اور شکست کھا کر گرفتار ہوا پھر صلح کر کے رہا ہوگیا، شرائط صلح کی خلاف ورزی کر کے پھر مقابلہ پر آیا اور گرفتار کر کے مدینہ بھیج دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے فرمایا۔

ہرمزان! تم نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سلطنت کو کیسا پارہ پارہ کیا اور تم کیسے ذلیل ہوئے؟

ہرمزان نے کہا مجھے جواب دینے کی اجازت ہے؟

فرمایا ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

ہرمزان نے کہا کہ یا عمر **اذا کنا نحن وانتم غالبنا کم واذا کان اللّٰہ معکم فاللّٰہ لا بغالب.** اے عمر جب تک ہمارا تمہارا مقابلہ تھا ہم ہی تم پر غالب تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو گئے تو اللہ کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟ مسلمانوں کے احوال وافعال سے کفار بھی یہ سمجھنے پر مجبور تھے کہ اللہ کی غیبی امداد ان کے ساتھ ہے۔

(۲) جب مسلمانوں نے مدائن کسریٰ فتح کرلیا تو یزدگرد شاہ فارس ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا جہاں جاتا بھاگی ہوئی فوج اس کے پاس جمع ہو جاتی اور وہ پھر مسلمانوں کا مقابلہ کرتا بلخ پہنچ کر اس نے خاقان چین کو خط لکھا کہ بادشاہ بادشاہوں کی امداد کیا کرتے ہیں، اس وقت آپ میری مدد کیجئے، عربوں نے مجھ پر حملہ کر کے مجھے شکست دیدی ہے اور میرے اور میرے ملک پر قبضہ کرلیا ہے۔ خط پڑھ کر خاقان چین نے قاصد سے کہا ہم نے سنا مسلمانوں کی فوج بہت کم تھی (چالیس ہزار سے زائد نہ تھی) اورتمہاری فوج بہت تھی (بعض مواقع پر ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ تھی) تمہارا سامان جنگ بھی ان سے بہتر تھا پھر وہ کیسے غالب ہوگئے؟ قاصد خاموش رہا تو خاقان چین نے کہا اچھا بتلاؤ ان کے اخلاق کیسے ہیں؟ قاصد نے کہا وہ بات کے سچے ہیں اور وعدے کے پکے جس سے جو وعدہ کرلیتے ہیں اس کے خلاف نہیں کرتے، جس علاقہ کو فتح کرلیتے ہیں وہاں کے باشندوں سے عدل وانصاف کرتے اور رعایا کی بہبود وامن وعافیت کا پورا

بندوبست کرتے ہیں۔ قانون سب کے لئے برابر ہے، خواہ شریف ہو یا چھوٹی قوم کا ہو ان کے خلیفہ کا بیٹا بھی اگر جرم کرتا ہے تو دوسروں کی طرح اس پر بھی قانون جاری کیا جاتا ہے۔ اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اپنے امیر کی پوری اطاعت کرتے ہیں۔ خاقان نے قاصد کا جواب سن کر شاہ فارس کو خط لکھا کہ بیشک بادشاہ بادشاہ کی مدد کرتے ہیں میں آپ کی مدد کے لئے ایسا لشکر جرار بھیجتا کہ اس کا ایک سرا چین میں اور دوسرا سرا بلخ میں ہوتا ہے مگر تمہارے قاصد کی زبانی مجھے عربوں کا جو کچھ حال معلوم ہوا ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ خدا کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ ان سے جنگ کر کے آپ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے صلح کرلیں (تاریخ طبری)

اب مسلمان خود سوچ لیں کہ ان کی کامیابی اور عروج کے اسباب کیا ہیں، اور ان کا چھوڑنا ہی ان کا زوال ہوا۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　تم ہوئے خوار تو بس تارک قرآں ہو کر

ضرورت ہے کہ مسلمان سچے مسلمان بن جائیں پھر یہی سب پر غالب ہوں گے۔ وَاَنتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. والسلام

مذاکرہ

﴿مذاکرہ﴾

سوالات

۱۔ جہاد ستمبر میں ہماری فتح کے اسباب کیا تھے؟
۲۔ اس جہاد سے ہمیں کیا سبق ملے اور کیا فوائد حاصل ہوئے؟
۳۔ کیا اس واقعے کے بعد ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟
۴۔ حق و باطل کا معرکہ کبھی بند نہیں ہوتا، باطل کی تیاریاں واضح ہیں، اس کے جواب میں مسلمانوں کی تیاریاں کس نہج پر ہونی چاہئیں۔
۵۔ جہاد ستمبر میں علماء کا کردار کیا تھا؟ اور آئندہ ایسے مواقع پر کیا ہونا چاہیے؟

آپ کے سوالنامہ کا جواب مختصراً یہ ہے کہ

(۱) جہاد ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی فتح کے اسباب میں بڑی وجہ نصرت الٰہی تھی جس پر واقعات شاہد ہیں جن کی کچھ تفصیل جنگ و جہاد نمبر خاتون پاکستان بابت جنوری ۱۹۶۶ء میں بھی ہے علالت طبع کی وجہ سے نقل نہ کر سکا۔ اور نصرت الٰہی نے پاکستان کو کیوں نوازا؟ حقیقی علم تو اللہ ہی کو ہے مگر بظاہر اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صدر پاکستان کا کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر جنگ کا نہیں بلکہ جہاد کا اعلان کرنا۔

۲۔ اس اعلان کے بعد سارے پاکستانی مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار ہو گئے۔ بڑے چھوٹے مرد وعورت سب میں یہی جذبہ کارفرما تھا عورتوں نے زیوروں سے، بچوں نے اپنی ناشتہ کی رقم سے، اہل وسعت نے کپڑوں سے، اہل ثروت نے اپنی دولت سے

اس جہاد میں خوب امداد کی تاجروں نے نفع خوری، راشیوں نے رشوت خوری، چوروں نے چوری، ڈاکوؤں نے ڈاکہ زنی، بدمعاشوں نے بدمعاشی چھوڑ دی، فوج نے نعرہ تکبیر اور تلاوت قرآن شروع کر دی اکثر مسلمان نمازی اور نیک بن گئے۔ پاکستانی مسلمانوں نے اپنے اختلافات چھوڑ کر اتحاد و اتفاق کو اپنا شعار بنالیا۔

پاکستان سے باہر بھی عام طور سے سب مسلمان فتح پاکستان کے لئے دعائیں کرتے تھے اور انڈونیشیا، ترکی، ایران، اردن اور حکومت سعودیہ نے تو پوری طرح حمایت پاکستان کا اعلان کر دیا اور کہہ دیا کہ پاکستان کو جس قسم کی امداد کی ضرورت ہوگی ہم اس کے لئے حاضر ہیں۔

۳۔ پاکستانی فوج پاکستان کی فتح اور غلبہ کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھی۔

۴۔ پاکستانی فوج کی نظر خدا پر تھی، ظاہر سامان پر نہ تھی اس لئے باوجود قلت تعداد اور قلت سامان کے اپنے سے چھ گنی فوج کے مقابلہ پر ڈٹی رہی جو قوت اسلحہ میں اس سے دس گنی تھی۔

۵۔ ہمارے ادبا اور شعراء اور علماء نے بھی جذبہ جہاد کو قوم میں خوب بیدار کیا، علماء نے فضائل جہاد پر تقریریں کیں کتابچے لکھ کر فوج میں بھیجے، ادباء اور شعراء نے اپنی نظموں اور گیتوں سے فوج کے حوصلے بڑھائے۔

۶۔ ائمہ مساجد نے صبح کی نماز میں قنوت نازلہ شروع کر دی جس سے سب مسلمانوں کے دل فتح و نصرت کی دعا میں مشغول ہو گئے۔

(۲) اس جہاد سے ہمیں ایک سبق تو یہ ملا کہ جب کفار سے مقابلہ کی نوبت آئے تو سربراہ مملکت کو اعلان جنگ نہیں بلکہ اللہ کا نام لیکر جہاد کا اعلان کرنا چاہیے۔ اعلان جہاد کا مسلمانوں کے دلوں پر خاص اثر ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس موقعہ پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اس کی نصرت و امداد کا طالب ہونا چاہیے اپنے سامان یا دوسروں کی امداد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ ظاہری سامان بھی ضرور کیا جائے کہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ میں

اس کا امر بھی ہے دوسروں سے امداد لینے کا بھی مضائقہ نہیں جبکہ وہ ہمارے جھنڈے تلے ہوں مگر بھروسہ اللہ پر کرنا چاہیے وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون.

تیسری یہ کہ جذبہ جہاد کو مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی اصلاح میں بڑا دخل ہے جب تک یہ جہاد جاری رہا پاکستانی مسلمان بہت نیک بن گئے تھے جس پر سب کو حیرت تھی مگر جہاد ختم ہوتے ہی پھر وہی حالت ہوگئی جو جہاد سے پہلے تھی غالبًا اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ امام کو ہر سال کسی نہ کسی طرف جہاد کرنا چاہیے جہاں کفر کا غلبہ ہو اور مسلمانوں سے معاہدہ نہ ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو پہلا خطبہ اپنی خلافت میں دیا تھا اس میں فرمایا تھا کہ جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے ذلیل ہو جاتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جب باغیوں نے سر اٹھایا حضرت عثمانؓ نے اپنے اعمال سے اس کا سبب دریافت کیا تو ایک گورنر نے کہا اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ فرمایا میرا مقصد یہ تھا کہ مقبوضہ علاقہ کا نظم ونسق مکمل ہو جائے تو آگے بڑھا جائے۔ عامل نے کہا کہ مقبوضہ علاقہ کا نظم ونسق آپ کے عمال اچھی طرح کرلیں گے۔ فوجوں کو پیش قدمی سے نہ روکا جائے، فرمایا بہتر ہے اب تم سب واپس جاکر فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دیدو، مگر وہ ابھی اپنی جگہ واپس بھی نہ پہنچے تھے کہ باغیوں نے خلیفہ مظلوم کا کام تمام کر دیا۔

چوتھے یہ کہ اس جہاد سے پاکستان کا رعب کفار کے دلوں میں بیٹھ گیا اور دنیا کو پاکستان کی قوت کا اندازہ ہوگیا کہ اس سے ٹکر لینا آسان نہیں، پاکستان کا وقار بلند ہوگیا۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا.

(۳) افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس جہاد کے ختم ہوتے ہی ہماری دینی واخلاقی حالت میں جو بہترین انقلاب آیا تھا ختم ہوگیا، پھر وہی حالت ہوگئی، جو جہاد سے پہلے تھی۔ البتہ سیاسی اور عسکری قوت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، مگر میں بتلا چکا ہوں کہ فتح و نصرت کیلئے یہ کافی نہیں۔ اللہ کی نصرت کے اسباب اختیار کرنے کی بھی ضرورت ہے جس کا طریقہ اصلاح اعمال واخلاق ہے جیسا جہاد کے دنوں میں ہوا تھا۔ ان ینصر کم اللّٰہ

فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

(۴) مسلمانوں کو ہمیشہ جہاد میں مشغول رہنا چاہیے، جہاد کو ترک نہ کیا جائے جب جہاد جاری رہے گا اس کی تیاری بھی برابر جاری رہے گی، ظاہری قوت بھی بڑھتی رہے گی اور دینی واخلاقی حالت بھی درست ہوتی رہے گی۔

(۵) علماء کو لازم ہے کہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد کو بیدار رکھیں اصلاح اعمال و اخلاق کی تاکید کرتے رہیں، جو حضرات علماء درس وافتاء کی ذمہ داری سے فارغ ہوں وہ عملی طور پر خود بھی فوج اسلامی میں بھرتی ہو جائیں اور اعلان جہاد کے بعد علماء اپنی تمام توانائیاں جذبہ جہاد پیدا کرنے میں صرف کر دیں اور یہ بات مسلمانوں کے دلوں میں بٹھلا دیں کہ محض ظاہری قوت غلبۂ مسلمین کے لئے کافی نہیں بلکہ نصرت الٰہی کو ساتھ لینا بھی ضروری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو جنگ قادسیہ کے موقعہ پر خط لکھا تھا کہ مسلمان کفار پر اسی لئے غالب ہوتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں اور وہ نافرمان ہیں اگر مسلمان بھی نافرمان بن جائیں گے۔ خدا کی مدد ان کیساتھ نہ ہوگی پھر مقابلہ ظاہری قوت وطاقت سے ہوگا اور اس میں کفار کا پلہ ہی بھاری ہوتا ہے۔ (او کما قال والمستدرک)

درحدیث دیگراں

''پاکستان فضا پر پوری طرح چھایا ہوا ہے، اگر بھارتی طیارے فضا سے بالکل ہی بھاگ نہیں گئے تو کم از کم اس قدر حتم ویقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں فضا سے بے دخل ضرور کر دیا گیا ہے۔ بھارتی ہوا باز پاکستانی ہوا بازوں کے مقابلہ میں بہت ہی گھٹیا درجہ کے ہیں۔ بھارتی افسروں میں قیادت کی صلاحیتیں بری طرح مفقود ہیں۔ بھارت ایک ایسے ملک کے ہاتھوں پٹ رہا ہے جو آبادی میں اس سے ساڑھے چار گنا چھوٹا اور مسلح افواج کے اعتبار سے تین گنا چھوٹا ہے''۔

انکشاف الحقیقہ
عن استخلاف الطریقہ

رسالہ انکشاف الحقیقہ عن استخلاف الطریقہ

بعد الحمد والصلوۃ کمترین غلامان خانقاہ امدادیہ افاض اللہ برکاتہا علی العالمین احقر ظفر احمد عفاء اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ بعض احباب کو اس جگہ پر خدشہ پیش آتا ہوگا کہ احمد حسن سنبھلی اگر فانی و واصل ہو چکا تھا جیسا کہ حضرت حکیم الامت کی اجازت و خلافت عطا کرنے سے یہی مفہوم ہوتا ہے تو پھر اس سے خلافت سلب کیوں کی گئی کیونکہ سلب خلافت اس کے غیر فانی وغیر واصل ہونے کی دلیل ہے۔ حالانکہ فانی و واصل مردود نہیں ہوسکتا۔

صوفیہ کا مقولہ مشہور ہے الفانی لا یرد اور عوارف المعارف میں ہے الواصل الذی یصلہ اللہ فلا یخشی علیہ القطع ابداً وقال ذو النون بارجع من رجع الامن الطریق ما وصل الیہ احدٌ فرجع منہ (منقول از مکتوبات قدوسیہ ص ۲۳۸)

پس یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ بعد وصول کے غیر واصل ہوگیا ہو لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ وہ پہلے ہی سے واصل نہ ہوا تھا اس پر یہ اشکال پڑتا ہے کہ پھر ایسی حالت میں حضرت شیخ نے اس کو اجازت وخلافت ہی کیوں عطا فرمائی تھی اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اجازت و اعطاء خلافت کا مبنی اور چیز ہے اور وصول وقبول عند اللہ دوسری چیز ہے پس الفانی لا یرد یہ مقدمہ تو بالکل صحیح ہے مگر اس کیلئے المجاز لا یرد لازم نہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حصول نسبت اور وصول الی اللہ فقط اس کا نام نہیں ہے کہ صرف بندہ کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو جائے بلکہ حصول نسبت حقیقت میں اس کا نام ہے کہ بندہ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جائے اور خدا تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو جاوے کیونکہ نسبت تعلق بین الشیئین کا نام ہے جس کے لئے طرفین سے تعلق کا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ ایسی نسبت ہوگی ۔

وقوم یدعون وصال لیلی ولیلی لاتقر لہم بذا کا

جیسا کہ ایک طالب علم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آجکل کس مشغلہ میں ہو اس

نے کہا شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں۔ جب اس نے دریافت کیا کہ اس کے واسطے تم نے کیا سامان کیا تو وہ فرماتے ہیں کہ آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے یعنی میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں اور نکاح طرفین کی رضا سے منعقد ہوتا ہے تو میرا راضی ہونا یہ نصف نکاح ہے۔ اور اس کا لغو ہونا ہر شخص پر ظاہر ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ جس واصل کی نسبت آئمہ صوفیہ کا ارشاد ہے کہ "الفانی لایرد والو اصل لایقطع" اس سے مراد وہی واصل ہے جس سے خدا تعالیٰ کو بھی تعلق ہو جاوے۔ جس کی دلیل عوارف کا یہ قول مذکور ہے الواصل الذی یصله اللّٰه واقعی جس شخص سے حق تعالیٰ کو تعلق ہو جائے گا وہ مردود یا مخذول و مقطوع کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ہر چند کہ اجازت اور خلافت کے قابل تو حقیقت میں یہی واصل ہے۔ جس سے خدا تعالیٰ کو یہی تعلق ہو اور صحیح معنی میں صاحب نسبت کہلانے کا مستحق وہی ہے مگر ظاہر ہے کہ شیخ کو طالب کے تعلق مع اللہ کا تو علم ہوسکتا ہے مگر تعلق اللہ مع العبد کا علم اسے کیونکر ہوسکتا ہے۔ بندہ کے ساتھ خدا کے تعلق کا علم شیخ کو محض اس قاعدہ اکثریہ کی بنا پر ہوسکتا ہے کہ عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ جب بندہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہو جاتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا مجاہدہ کے بعد راہ ہدایت مفتوح کر دینے کا تو پختہ وعدہ ہے مگر محض اتنی بات سے واصل نہیں ہوتا وصول تعلق اللہ مع العبد کا نام ہے، اس کے متعلق اسی کے بعد ارشاد ہے۔ وان اللّٰه لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی ہدایت سبیل کے بعد اگر طالب میں اخلاص و احسان کامل کی صفت پیدا ہو گئی تو اس وقت معیت حق اس کے ساتھ ہوگی اور وہ واصل ہو جائے گا۔

پس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرید نے طلب حق میں سعی اور مجاہدہ شروع کیا اور حسب وعدہ حق تعالیٰ نے طریق وصول اس پر مفتوح کر دیا لیکن ابھی مرید میں احسان و اخلاق کامل نہ پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو واقع میں وصول نصیب نہ ہوا اور اخلاق کامل ایسا پوشیدہ امر ہے کہ اس کی اطلاع شیخ کو بجز قرائن اور وجدان یا کشف کے اور کسی طرح نہیں

ہوسکتی پس ممکن ہے کہ شیخ کسی طالب کو ریاضات و مجاہدات میں مشغول اور طریق وصول کو اس پر مفتوح دیکھ کر اپنے وجدان یا کشف سے اس کو صاحب اخلاص سمجھ جائے اور اجازت دیدے اور واقع میں وہ صاحب اخلاص نہ تھا کیونکہ وجدان یا کشف وقرائن یہ جملہ امور وحی آسمانی کی طرح قطعی تو نہیں ہیں۔ محض ظنی ہیں۔ جن میں خطاء وصواب دونوں کا احتمال ہے۔ پس شیخ جب کسی طالب کو دیکھتا ہے کہ یہ خدا کے ساتھ تعلق بڑھانے کی سعی کر رہا ہے اور ظاہر میں احکام و اوامر شرعیہ اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں تو وہ قاعدہ اکثر یہ کی بنا پر یہ سمجھ کر کہ جب اس کو خدا سے تعلق ہے تو امید ہے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہوگا اس کو صاحب نسبت جان کر مجاز و خلیفہ کر دیتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شیخ کے اس گمان کو سچا کر دیتے ہیں کہ جس کو وہ واصل سمجھتا ہے، حق تعالیٰ سچ مچ اسے واصل کر دیتے ہیں یعنی خود بھی اس سے اپنا تعلق معیت قائم کر دیتے ہیں۔ مگر قطعی و یقینی طور پر شیخ کو یہ خبر نہیں ہوسکتی کہ واقع میں اس شخص سے حق تعالیٰ کو تعلق ہے یا نہیں کیونکہ غیب کا حال سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور وحی کا باب مسدود ہو چکا اور وجدان و کشف غلطی و خطا سے محفوظ نہیں ہیں۔ پس کبھی ایسا ممکن ہے کہ جس شخص کی نسبت شیخ محقق عارف نے یہ امید وابستہ کی تھی کہ انشاء اللہ خدا تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہو گیا ہوگا۔ واقع میں وہ ایسا نہ ہو اور اس شخص میں جو آثار تعلق مع اللہ کے نظر آئے ہوں وہ محض استدراج ہوں۔ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ ٥ وفی الحدیث الصحیح ان الرجل لیعمل بعمل اهل الجنة حتی لا یبقی بینه و بینها الا ذراع فیسبق علیه الکتاب فیرجع ویعمل بعمل اهل النار فیدخل النار الحدیث وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ٥ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ الآیة بلعم باعور کو سب لوگ واصل اور مقرب حق سمجھتے تھے کیونکہ ظاہر میں اس کی کرامات و خوارق و مجاہدات و ریاضات کی کچھ حد نہ تھی۔ مگر درحقیقت یہ سب استدراج تھا اور واقع میں وہ مقرب نہ تھا۔

سید نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مسلمانوں کو ظاہری تقوی وطہارت کی وجہ سے مخلص سمجھ کر اتنا مقرب بنالیا تھا کہ منصب کتابت وحی ان کے سپرد کر دیا مگر بعد میں ایک کاتب وحی مرتد بھی ہوگیا پس خلاصہ کلام یہ ہوا کہ صوفیہ کا قول "الفانی لایرد والواصل لایقطع" فانی حقیقی واصل حقیقی کے بارہ میں ہے اور اجازت وخلافت عطا کرنے کا مدار فانیٔ وجدانی و واصل وجدانی ہوتا ہے کیونکہ یقینی طور پر کسی کا واصل حقیقی ہونا مشائخ کو معلوم نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بجز ان صحابہ کے جن کے جنتی ہونے کی قطعی خبر وحی سے معلوم ہو چکی ہے باقی کسی امتی کو قطع اور یقین کے ساتھ جنتی نہیں کہا جا سکتا اور نہ ایسا کہنا جائز ہے تو پھر یقین کے ساتھ ہم کسی کے واصل ہونے کا کیونکر حکم لگا سکتے ہیں۔ لہذا اجازت کا مدار محض وصول وجدانی ہے جس میں کبھی خطاء کا ہو جانا ممکن ہے جیسا کہ کبھی مجتہد احکام سے بھی اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے۔ جس سے بعد میں وہ رجوع کرتا ہے۔

> فقہ میں ائمہ مجتہدین کے ایسے اقوال موجود ہیں جن سے انہوں نے بعد میں رجوع کیا (گو محقق عارف کے ایسے وجدانات میں جو طریق کے متعلق ہوں غلطی بہت ہی شاذ و نادر اور کم واقع ہوتی ہے جیسا کہ مجتہد احکام سے خطاء ولغزش بہت کم ہوتی ہے چنانچہ مجتہد کی تعریف ہی یہ ہے من کان صوابہ اکثر من خطاہ مجتہد وہ ہے جس کی رائے میں اصابت بہ نسبت خطاء کے زیادہ ہو اسی طرح محقق طریق کا وجدان اکثر تو درست ہی ہوتا ہے مگر امکان خطاء تو ضروری ہے اور قلت کے ساتھ وقوع بھی ہوتا جاتا ہے۔"

چنانچہ ہم اخیر میں حضرت قطب الاقطاب شیخ المشائخ شاہ عبدالقدوس صاحب نور اللہ مرقدہ کے چند مکتوبات مع ترجمہ کے پیش کرینگے جو آپ کے بعض خلفاء ومجازین کے نام ہیں۔ جن میں شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو تحریر فرمایا ہے کہ تم مردود و مخذول ہو گئے اور ہم نے جو تم کو اجازت وخلافت دی تھی وہ باطل ہوگئی۔ اب کچھ باقی

نہیں رہا۔ یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جبکہ اجازت اور خلافت دینا اس امر کی شہادت ہو کہ یہ شخص فانی اور واصل بحق ہو چکا ہے۔ مگر اجازت و استخلاف کی یہ حقیقت زمانہ سابق کے موافق ہے۔

آجکل کے مشائخ نے بوجہ کوتاہی عمر و قلت فراغ وغیرہ کے اس میں کسی قدر توسع کرلیا ہے یعنی پہلے زمانہ میں تو اجازت و خلافت اسی وقت دی جاتی تھی جبکہ طالب شیخ کے وجدان یا کشف میں فانی اور واصل ہو چکا ہو اور متأخرین نے یہ دیکھ کر فناء کامل اور وصول کامل حاصل ہونے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اگر اس درجہ کا انتظار کر کے اجازت دی جایا کرے تو تعلیم و تلقین ذکر کا کام بند ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اس وقت اجازت دے دیتے ہیں جبکہ طالب کو تلوین ابتدائی کے مقابل ایک درجہ تمکین کا عطا ہو جاوے اور ذکر اللہ کا غلبہ ایسا ہو جاوے کہ اکثر اوقات ذہول نہ ہوتا ہو اور مقام فنا و دیگر مقامات سلوک سے کچھ کچھ مناسبت حاصل ہو جاوے۔ گو ابھی رسوخ حاصل نہ ہوا ہو۔ اس درجہ میں پہنچ کر طالب فانی و واصل تو نہیں ہوتا مگر وصول کی قابلیت قریبہ ایسی حاصل ہو جاتی ہے کہ اگر طالب اپنے نفس کی نگہداشت اور رزائل کبر و عجب وغیرہ تمام معاصی سے اسی طرح کرتا رہے جس طرح ابتداء سلوک و مجاہدہ کے وقت کرتا تھا اور ذکر و معمولات پر دوام رکھے اور شیخ سے مثل سابق تعلق قائم رکھے تو ایک وقت میں ضرور واصل و فانی ہو جائے گا (اور اس درجہ میں طالب سے ان امور کی امید غالب ہوتی ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتا رہے گا) اور چونکہ اس وقت طالب کو طریق سے مناسبت معتد بہا حاصل ہو چکی ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسروں کو وصول کا راستہ بتلا سکے، اس لئے اجازت دی جاتی ہے۔

اس کی نظیر بالکل ایسی ہے جیسے آجکل مدارس عربیہ میں درس معمول بہ تمام کرنے کے بعد طلبہ کو اجازت و سند دیدیتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ طالب علم فاضل کامل اور عالم متبحر ہو چکا ہے کہ اس کو تمام علوم سے ایسی مناسبت راسخہ حاصل ہو گئی ہے جو کبھی زائل نہیں ہوسکتی اور اب اس سے کسی مسئلہ میں بھی غلطی نہ ہو گی اور جو کتاب

چاہے گا بے تکلف پڑھا سکے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ طلبہ کو سند و اجازت دینے کا حاصل صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو علوم مقصودہ سے فی الجملہ ایسی مناسبت و استعداد پیدا ہوگئی ہے کہ اگر یہ کتب بینی اور مطالعہ شروح وحواشی اور تعلیم و تدریس میں مشغول رہے تو کسی وقت انشاء اللہ تبحر و فاضل ہو جائیں گے اور محض اتنی مناسبت پیدا ہو جانے کے بعد سند دے دینے کا منشا یہاں بھی وہی ہے کہ اگر حصول مناسبت راسخہ اور تمام علوم میں تہیہ کے بعد سند دی جایا کرے تو اس کے لئے زمانہ دراز کی ضرورت ہے اور آجکل لوگوں کو علوم دینیہ کے لئے سات آٹھ برس خرچ کرنا بھی گراں ہوتا ہے پندرہ بیس سال تو کون صرف کرسکتا ہے۔

پس جس طرح ایک طالب علم سند یافتہ مدرسہ سے نکل کر کتب بینی و تعلیم و تدریس کا کام کر کے دس پندرہ سال کے بعد عالم تبحر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ طالب بھی جس کو مقامات سلوک سے کچھ مناسبت حاصل ہو چکی ہے اور شیخ نے اس کو اجازت تلقین وغیرہ دیدی ہے اگر برابر کام میں لگا رہا اور نگہداشت نفس سے غافل نہ ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد فانی کامل راسخ و واصل ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح کہ وہ طالب علم جو مدرسہ سے نکل کر جوتوں کی دکان لے بیٹھے اور دنیا کے دھندوں میں پڑ کر کتب بینی تدریس وغیرہ سے بالکل جدا ہو جائے تو چند سال میں اس کی وہ استعداد مناسبت علمیہ بالکل زائل ہو جاتی ہے جو مدرسہ سے فارغ ہوتے وقت حاصل تھی۔

اسی طرح وہ طالب جو مقامات سلوک سے قدرے مناسبت حاصل کرنے کے بعد اپنے نفس کی نگہداشت سے غافل ہو جائے اور تمکین کے بعد معاصی کا ارتکاب کرنے لگے اس کی مناسبت مذکورہ زائل اور قابلیت قریبہ وصول مفقود ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح علوم ظاہرہ میں استاد کے ساتھ بے ادبی و گستاخی کو مناسبت علمیہ سے محرومی میں بڑا دخل ہے۔ اس سے بدرجہا زاید طریق باطن میں شیخ کے ساتھ بے ادبی و گستاخی کرنے کو اس مناسبت باطنیہ کے سلب ہو جانے میں دخل عظیم ہے اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ آجکل اجازت و خلافت جن لوگوں کو دی جاتی ہے وہ سب واصل و فانی نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے بعض بعض افراد فانی و واصل ہوتے ہیں اور اکثر وہ لوگ ہیں جن کو قابلیت وصول

حاصل ہوگئی اور راستہ معلوم ہوگیا ہے۔ اگر وہ اس پر برابر چلتے رہے تو امید ہے کہ واصل ہو جائیں۔

پس آج کل کسی مجاز طریق کا بگڑ جانا کچھ زیادہ بعید نہیں ہے یہ لوگ اگر اجازت کے بعد ذکر و معمولات سے غافل اور نگہداشت نفس میں متساہل اور شیخ سے مستغنی و مستقل ہو جائیں تو ان کی حالت ضرور بگڑ جائے گی اور مناسبت باطنیہ جو کچھ حاصل ہوئی تھی سب سلب ہو جائے گی جیسا کہ طلبہ مدارس اگر علمی مشغلہ کو چھوڑ کر دنیوی کاروبار میں لگ جائیں تو وہ علمی مناسبت سے بالکل کورے ہو جاتے ہیں پس اس زمانہ میں جس خلیفہ ومجاز طریق کی بابت یہ معلوم ہو کہ اس کی حالت خراب وخستہ ہوگئی اور شیخ نے اس سے اپنی اجازت وخلافت کو سلب کرلیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شخص وقت اجازت وخلافت کے واصل وفانی اور صاحب نسبت نہ تھا بلکہ صرف صاحب مناسبت تھا۔ اور مردود ہونا صاحب نسبت کا باستحالہ عادیہ محال ہے نہ صاحب مناسبت کا

فائدہ

مجازین کو جان لینا چاہیے کہ صاحب نسبت اور صاحب مناسبت میں بڑا فرق ہے۔ صاحب نسبت سے حق تعالیٰ کو تعلق ہو جاتا ہے اور صاحب مناسبت کو صرف طریق معلوم ہو جاتا ہے۔ صاحب نسبت ہونے کی علامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا فاعل مشاہدہ کرے مخلوق کے فعل سے نظر بالکل اٹھ جاوے۔ کسی فعل میں مخلوق کو خدا کا شریک نہ پائے اور یہ مضمون محض درجہ اعتقاد میں نہ ہو بلکہ ہر وقت وجدانا اس کا مشاہدہ ہوتا ہو۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه وان يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ. جس کا اثر یہ ہوگا کہ مخلوق سے خوف وطمع بالکل معدوم ہو جائے گا (یعنی عقلاً) نیز جب کسی سے حق تعالیٰ کو تعلق ہوگا اور وہ فانی و واصل ہوگا تو اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ اس شخص کا ارادہ اور خواہش بالکل فنا ہو جائے کہ اپنے واسطے کوئی حالت تجویز کرے۔ جس حالت میں حق تعالیٰ شانہ کہیں اس پر راضی رہے۔ کبر وعجب وحب جاہ وغیرہ سے

بالکل بری ہو۔ اگر تکبر و عجب وغیرہ باقی ہیں تو سمجھ لو کہ تم صاحب نسبت اور واصل و فانی نہیں ہو بلکہ تم کو صرف طریق کا علم ہو گیا ہے اور تم محض صاحب مناسبت ہو

فائدہ

اجازت کے بعد مجازین کو امور ذیل کی رعایت ضروری ہے تا کہ ترقی دائم رہے اور جو مناسبت طریق حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ سلب نہ ہو جائے۔

(۱) شیخ سے اپنے کو مستغنی اور مستقل نہ سمجھے بلکہ ہمیشہ اپنے کو اس کا محتاج سمجھے سال بھر میں دو چار دفعہ کم از کم اس کی زیارت سے مستفیض ہو اور ہر مہینہ خط و کتابت سے اپنے احوال کی اطلاع دیتا رہے۔ اجازت کے بعد اپنے کو شیخ سے مستغنی سمجھ لینا سدراہ اور سم قاتل اور باعث سلب مناسبت ہے۔ قال العلامة الشعرانی قلت مرة سیدی علی الخواصؒ اذا بلغ المرید مقام العرفان ھل یستغنی عن شیخه فقال اذا بلغ المرید مقام شیخه افرد شیخه و قطع عنه فیتولاه الحق جل و علا فیفطمه عن الخلق جمیعا ما عدا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فانه لا یمکن رفع واسطة ابداویصیر الشیخ بعد فطام الحق جل و علا لھذا المرید کالظئر والدایة ویؤیده حدیث الارضاع بعد الحولین. فقلت له فاذن الشیخ یحتاج الیه مادام عند المرید ھو او ارادة دون اللّٰه عز و جل قال نعم لیکسر ھما عنه فاذاکسر ھما عنه و ذالا فلاکدورة ولانقصان . اھ (ص ۵۷ ج ا کتاب المبین والاخلاق)

(ترجمہ) ”میں نے ایک بار سیدی علی خواص سے عرض کیا کہ جب مرید مقام عرفان پر پہنچ جائے تو کیا شیخ سے مستغنی ہو جاتا ہے فرمایا جب مرید اپنے شیخ کے مقام پر پہنچ جائے اس وقت اس کو شیخ سے الگ کر دیا جاتا ہے اور حق تعالیٰ اس کی پرورش خود فرماتے ہیں اور بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مخلوق سے اس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کا قطع ہونا تو کبھی ممکن نہیں اور جب حق تعالیٰ اس

مرید کا دودھ چھڑا دیتے ہیں اس وقت شیخ اس کے لئے بمنزلہ دایہ اور کھلائی کے ہو جاتا ہے (یعنی اب دودھ تو نہیں پلاتا مگر حفاظت کیلئے شیخ کی پھر بھی ضرورت ہے جیسے دودھ چھوٹ جانے کے بعد بچہ کو دودھ پلانے کی ضرورت تو نہیں رہتی مگر گود میں لینے والی اور کھلانے والی کی ضرورت تو اب بھی ہے اگر بچہ دودھ چھوٹ جانے کے بعد تنہا رہا کرے اور اندر باہر اکیلا پھرا کرے تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور ہلاکت میں پڑے گا۔ یہی حال مرید کا شیخ سے دودھ چھوٹ جانے کے بعد ہوتا ہے کہ ابھی اس کو عرصہ تک حفاظت شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لو۱۲۔ جامع

اور حدیث الارضاع بعد الحولین اس کی تائید کرتی ہے میں نے عرض کیا کہ پھر تو جب تک مرید کے اندر خواہش اور ارادہ باقی رہے اس وقت تک شیخ کی اسے ضرورت ہے فرمایا ہاں تاکہ شیخ ان دونوں کو توڑ پھوڑ کر مرید سے نکال دے۔ پس جب وہ ان دونوں کو نکال دے گا پھر مرید میں نہ کچھ کدورت رہے گی نہ کچھ نقصان رہے گا۔ اھ۔

ناظرین کو اس عبارت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مرید جب شیخ کے مقام پر پہنچ جائے اس وقت تو اس کا دودھ چھوٹتا ہے جس کے بعد بھی شیخ کی احتیاج تربیت میں رہتی ہے (گو تغذی میں نہ رہے) تو جو مرید شیخ کے مقام پر بھی ابھی تک نہیں پہنچا اس کا تو ابھی دودھ بھی نہیں چھوٹا۔ وہ شیخ سے کیونکر مستقل و مستغنی ہو سکتا ہے اور آج کل اکثر مجازین کو قبل از وصول بر مقام شیخ اجازت دیدی جاتی ہے جس کی وجہ اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

(۲) اجازت کے بعد مجاز کو نفس کی نگہداشت اور مجاہدہ سے غافل نہ ہونا چاہیے ۔مجاہدہ کی اب بھی ضرورت ہے اور ہر وقت رہے گی۔

اندریں رہ مے تراش و میخراش ۔۔۔ تادم آخر دمے فارغ مباش
تادمِ آخر دمے آخر بود ۔۔۔ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ. حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ تمکین کے بعد مجاہدہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس وقت طبعی، ذوق و شوق اور جوش کا غلبہ نہیں رہتا۔ جس سے قوی نفسانیہ پہلے مغلوب نہیں۔ اس وقت قوی

نفسانیہ پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں مگر تھوڑی دیر توجہ سے نفس درست ہو جاتا ہے۔ جیسے تعلیمیافتہ اور شائستہ گھوڑا بھی کبھی شرارت کرنے لگتا ہے مگر ذرا سے اشارہ سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ خصوصاً کبر و عجب و حب جاہ سے اجازت کے بعد نفس کی نگہداشت پہلے سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ علوم و واردات و رجوع خلق سے ان امراض کا عود شروع ہوتا ہے۔

(۳) ذکر لسانی کا اجازت کے بعد بھی پابند رہے صرف مراکبات پر اکتفا نہ کرے معمولات حسب فرصت مناسب مقدار میں مقرر کر کے ان پر ہمت سے دوام کرے معمولات میں تلاوت قرآن اور درود شریف استغفار کی بھی معتد بہ مقدار ہونی چاہیے۔

(۴) حق تعالیٰ سے ہمیشہ لرزاں ترساں رہے اور اس نعمت کے حصول پر نازاں اور مطمئن نہ ہو استدراج و مکر سے ڈرتا رہے اور دعا کرتا رہے کہ خداوند اس نعمت کو سلب نہ کیجیو بلکہ روز بروز اس میں ترقی عطا ہو۔ ان مقدمات اربعہ کی اگر مجازین پابندی کرتے رہیں تو انشاء اللہ سلب نعمت سے ہمیشہ محفوظ و ماموں رہیں گے۔

احمد حسن سنبھلی کو طریق سے فی الجملہ مناسبت ہو گئی تھی اور وہ مجاہدے بھی کرتا تھا جس سے حضرت شیخ کو امید ہو گئی تھی کہ اگر یہ کام میں لگا رہا تو انشاء اللہ واصل ہو جائیگا۔ اس لئے اس کو اجازت دیدی گئی مگر وہ اجازت کے بعد اپنے کو شیخ سے مستغنی و مستقل سمجھنے لگا حتی کہ خود شیخ کی اصلاح کا دعوی کرنے لگا، شیخ کے لحاظ و مروت سے جس کا منشاء اس کا دعوی سیادت تھا نیز طالبین کی تربیت سے کبر و عجب و حسد و حب جاہ بڑھ گیا۔ شیخ نے ان رذائل کی اصلاح کا حکم بھی کیا مگر اس نے کچھ عمل نہ کیا اس لئے وہ مناسبت زائل اور نعمت سلب ہو گئی۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَ مِنَ الْعَمٰى بَعْدَ الْاَبْصَارِ وَ مِنَ الْقَطْعِ بَعْدَ الْوَصْلِ وَ مِنَ الصُّدُوْدِ بَعْدَ الْقُرْبِ وَ مِنَ الضَّلَالَةِ بَعْدَ الْهِدَايَةِ وَ مِنَ الْكُفْرِ بَعْدَ الْاِيْمَانِ اِنَّهٗ هُوَ الْمُنْعِمُ الْمَنَّانُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رب العالمین اب ہم حسب وعدہ اعلیٰ حضرت قدوۃ العارفین قطب الاقطاب شیخ المشائخ شاہ عبدالقدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے وہ کرامت نامے معہ اصل و ترجمہ کے نقل کرتے ہیں۔ جن میں آپ نے اپنے بعض خلفاء و مجازین سے اپنی اجازت و خلافت کو

سلب کیا ہے اس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی کو خلافت دینے کے بعد اس سے خلافت کا سلب کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ مشائخ متقدمین بھی ایسا کرتے آئے ہیں اور اس سے شیخ کی معرفت وبصیرت وتحقیق میں کچھ نقص لازم نہیں آتا ورنہ معاذ اللہ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کی بصیرت کو بھی ناقص ماننا پڑے گا حالانکہ ان کے کمال معرفت پر اجماع صوفیہ ہے۔

مکتوب اول صفحہ ۳۵۶ مکتوبات قدوسیہ

بجانب شیخ عبدالرحمٰن شاہ آبادی حق حق حق بعد حمد وصلوۃ دعاء خیر و صلاح عبدالرحمٰن بداند بیت بگذارم این کون و مکان بگذارم این جان و جہان۔ جائیکہ ہستا آن بے نشان گر بندہ ام انجا روم عالم خرابی است بیت راہ حق صنعت وعبارت نیست+ جز خرابی دردعمارت نیست+ چرا کسی از خدا روبگرواند و درفسا درد آرداز شغل حق بشغل دیوان درآید وعزت خویش بشغل دیوان واند مردان جان بازند جہان نازند و بادوست سازند بیت ایں کارکسا نیست کہ خیز ندز سرجان+ این خانہ خرابی زرہ بو الہوی نیست+ چرا عبدالشیطان شد ورد۔ نیفاق آور دو نام خود برجرید کا فمثلہ کمثل الکلب ثبت کردہ آہ ہزار آہ افسوس ہزار افسوس کا راز کجا بکجا کشید واز چہ درچہ افتاد این چہ واقعہ مسجد بود تبخانہ گشت صلاح بود بفساد پیوست سبک برخیز برخیز برخیز بیب ہر چہ جز حق بسوز غارت کن+ ہرجہ جز دین از وطہارت کن+ ومخلص دیگانہ باش اَلاَ لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِص. واگر نہ از خداواز پیران بریدست واز راہ حق رفتہ است اجازت از ماوخلافت از ما بر خود جائز ندارد وخود را بعد ازمیس شیخ و درویش نخواند قطعیت ست ہوش دار ہوس دار ہوش دار اگر توانی دست بدامن استغفار زن ومستغفر شود دیگر تو دانی والّٰلہُ المستعان ارمستان باید ترسید واز زخم ایشان خود را نگاہ باید داشت بیت ماست السّتیم قضا را نشنا سیم+ از غایت مستی سر و پا را نشناسیم+ ہوشدار ہوشدار ہوشدار کار خود از دست رفتہ است وتر اخبر نیست بیت کشتی من کہ بگرداب خطر افتادست+ وہ چہ بودی کہ رسیدی بکناری یاری+ تو یار دیواں شدۂ وشیطان گشتہ واز رحمٰن رفتہ یَا لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلاً زخمے است کہ مردان از اسیت آن زخم بیجان

اندو بے زبان بیت بشتاب سری تو بہ دتو بہ کشادست+ واز کردن تاخیر بسی واقعہ نادست+ بیت بردم مرکو یتو جان وہم+ این حیلہ وچارہ رہا کنم+ **استغفر اللّٰہ استغفر اللّٰہ استغفر اللّٰہ من جمیع ما کرہ اللّٰہ** بیت جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضایع است+ جز حرف عشق ہر چہجو ابی بطالت است+ بر خیر مشتاب بیا ہیچ درنگ برحود جایز مدار کہ کار ابتر است و یار ابتر و زلف ابتر و ہر چہ ہست ہمہ ابتران شائنک ہوالا بتر دوہرہ جگ سبایا چھوڑ کر ہون نج جو گن ہون+ باج پیاری ہی سکھی اکو جگ نہ لیون+

(ترجمہ) حق حق حق۔ بعد حمد وصلوۃ ودعائے خیر وصلاح کے عبدالرحمٰن کو جاننا چاہیے۔

بگذارم این کون و مکان بگذارم این جان و جہان
جائیکہ ہست آن بے نشان گر بندہ ام آنجا

اور وہ عالم اجڑنے کا ہے (بننے سنورنے اور بڑا بننے کا عالم نہیں) راہ حق صنت وعبارت نیست جو خرابی در وعمارت نیست+ جو شخص کہ خدا سے رخ پھیر لے اور فساد کے کام کرنے لگے وہ شغل خداوندی سے جدا ہو کر شیطانوں کے کام میں لگ جاتا اور اپنی عزت انہی کاموں میں سمجھنے لگتا۔ بے سر دہان خدا جانباز ہوتے ہیں اس جہان سے پار ہو کر دوست کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں۔

این کار کسا نیست کہ تیز ندز سرجان این خانہ خرابی زرہ بو الہوسی نیست+ (عبدالرحمٰن)

کیوں شیطان کا بندہ ہو گیا اور نفاق ظاہر کرنے لگا اور اپنا نام فمثلہ کمثل الکلب کی لوح پر لکھوالیا۔ آہ ہزار مرتبہ آہ۔ افسوس ہزار افسوس کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور کس جگہ سے کس جگہ گر گیا یہ کیا واقعہ ہے مسجد تھی بت خانہ بن گیا۔ صلاحیت میں تھا فساد کی صورت میں آ گیا جلدی اٹھ جلدی کھڑا ہو جلدی دوڑ۔

ہر چہ جز حق بسوز و غارت کن ہر چہ جز دین از و طہارت کن

مخلص اور دوست بنجا الا للہ الدین الخاص ورنہ خدا سے اور مشائخ (طریق)

سے قطع تعلق ہے اور راہ حق سے جاتا رہا۔ ہماری طرف سے اجازت وخلافت کو جائز نہ سمجھے اور اس کے بعد اپنے کو شیخ و درویش نہ کہے۔ ہم سے قطع تعلق ہے۔ ہوش دار ہوش دار خبردار اگر ہو سکے تو دامن استغفار سے پکڑ اور توبہ کر اور جو ہو سکے تلافی کرو واللہ المستعان۔ مستان خدا سے ڈرنا چاہیے اور ان کے زخم سے اپنے کو بچانا چاہیے۔

مامست التسیم قضار انشاء سیم   از غایت مستی سرو پار انشنا سیم

ہوشیار ہو جاؤ ہوشیار ہو جاؤ، خبردار ہو جاؤ تمہارا کام قابو سے نکل گیا ہے۔ اور تم کو خبر بھی نہیں

کشتی من کہ بگرداب خطر افتاد است   وہ چہ بودی کہ رسیدی بکنا ریائے

تو شیطان کا دوست اور خود شیطان بن گیا ہے اور رحمٰن سے پھر گیا۔ یا لیتنی لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلاً یہ ایک ایسا زخم ہے مردان (طریق) اس زخم کی ہیبت سے بیجان و بیزبان ہیں۔

بشتاب سوی توبہ در توبہ کشاد دست   و از کردن تاخیر بسی واقعہ زادست

بردم سرکوئی تو جان دہم   ایں حیلئہ و چارہ رہا کنم

استغفر اللّٰہ استغفر اللّٰہ. اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ان تمام چیزوں سے جو اس کو ناگوار ہیں۔

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است   جز حرف عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

اٹھو جلدی آؤ۔ ذرا سی دیر بھی اپنے اوپر جائز نہ سمجھو کہ کام ابتر ہو گیا اور یار بھی ابتر اور زلف بھی ابتر اور جو کچھ ہے سب ہی ابتر ہے ان شانئک ہوالا بتر دو ہرہ

جک سبایا چھوڑ کر ہون نج جوگن ہون   باج پیاری ہی سکھی ابکو جگ نہ لیون

مکتوب دوم صفحہ ۳۵۶ مکتوبات قدوسیہ

بجانب سیان عبدالرحمٰن شاہ آبادی حق حق حق بعد حمد وصلوۃ عبدالرحمٰن دعاء خیر و صلاح مطالعہ کند و بداند کہ از بعضی کسان بیوفائی و ناہنجاری و نفاق وی چنداں معلوم شد کہ

در تقریر نیاید اگر واقع برین است مردود و مخزول است خدایش ہرگز فلاح نبود این نوع ازوی محال و بعید نمود از مقبولان ہرگز چنین واقع نشود و در ظن ایشان نبود لیس ہذا الاصفۃ المردودین المخزولین و در حال روئے استغفار آرد و تائب گردد مخلص و یگانہ شود تا وقت باقیست وگرنہ مہلک قہر فرد بردو در ہادیہ سپارد وَلَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِن وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ حکمی قطعی است ہوشدار ہوشدار ہوشدار عبدالرحمٰن چرا عبالشیطان شود ردی بنفاق آرد توقیر وتوفیر جوید وتحقیر تنقیص فرزندان ما خواہد والعیاز باللہ من ذلک آری مردود راہمان راہ مردودی ومخزولی در پیش است چہ توان کرد از استاد خود شنیدہ ام دوہرہ بہت بودی بجاہ تون دہک جیون تیرا+ سائیں تہیں تو کی بہرا دیکہہ کنب کہیرا+ ایکو کام نہ اوسی جب پرسی بیرا+ چھوڑ پیارا سائیاں توں چاہتہ گہیرا+ قطعیت با پیران کردہ است مخزول ومطرود گشتہ است اگر اورا میسر است اوداند **استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ من جمیع ما کرہ اللہ قولا و فعلا و ضمیرا و حاضرا و ناظرا** + اورا خلافت بطوع ورغبت ندادہ ایم بکوشش فرزندم شیخ حمید دادہ ایم ہمان خلاف برآمد والعیاذ باللہ من ذلک وکل یعمل علی شاکلتہ چہ کند کہ سعید در راہ سعادت رود وشقی در راہ شقاوت رود خاتمہ بخیر باد

(ترجمہ) بعد وصلوٰۃ و دعائے خیر وصلاح کو عبدالرحمٰن مطالعہ کرے اور جان لیوے کہ بعض لوگوں سے اس کی بیوفائی اور بدکرداری اور نفاق کا حال اس قدر معلوم ہوا ہے کہ بیان میں نہیں آ سکتا اگر واقعہ یہی ہے تو وہ مردود و مخذول ہو چکا بخدا اس کو ہرگز فلاح نہ ہوگی۔ یہ صورت حال اس سے ایسی محال وبعید ظاہر ہوئی کہ مقبولان الٰہی سے ہرگز ایسا کام واقع نہیں ہوسکتا بلکہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ طریقہ بجز مردودین مخذولین کے کسی کا نہیں۔ اسی وقت اس کو استغفار پر توجہ کرنی چاہیے اور تائب ہو کر مخلص و دوست بننا چاہیے۔ ابھی وقت باقی ہے ورنہ تباہ کرنے والا قہر اسے نیچی ڈال دے گا اور جہنم کے سپرد کرے گا وَلَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِن وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ. اس کے لئے بجز خدا کے کوئی دوست و مددگار نہیں ہوگا (اور خدا کی ولایت واعانت سے خود الگ ہو چکا تو اب کوئی بھی مددگار نہیں) یہ حکم قطعی ہے ہوشیار خبردار آگاہ ہو جاؤ۔ عبدالرحمٰن عبدالشیطان

کیونکر ہو رہا ہے۔ نفاق ظاہر کرتا اور اپنی توقیر و عزت چاہتا ہے اور ہمارے بیٹوں کی تحقیر و تنقیص پسند کرتا ہے العیاذ باللہ من ذلک بے شک مردود کیلئے وہی مردودی اور مخزولی کا راستہ سامنے ہے کیا کیا جاوے میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے۔ دوہرہ بہت بودی بیچاہ تون دہک جیون تیرا+ سائیں تہیں تو کی بہرا دیکھا کنب کہیرا+ ایکو کام نہ اوسی جب پرسی بیرا+ چوڑ پیارا سائیان تون چاتہہ گہنیرا۔ اس نے پیروں سے قطع تعلق کیا ہے مخزول و مطرود ہوگیا۔ اگر اسے کچھ میسر ہے تو وہ جانے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ خدا کی پناہ ہے ہر اس چیز سے جو خدا کو ناگوار ہو خواہ وہ بات ہو یا فعل یا حدیث النفس خدا کو سب کچھ معلوم ہے وہ حاضر و ناظر ہے۔ ہم نے اس کو اپنی خوشی سے خلافت نہیں دی تھی بلکہ اپنے فرزند شیخ حمید کی سفارش سے دی تھی وہی غلطی ہو گئی العیاذ باللہ ہر شخص اپنی حالت کے مطابق عمل کرتا ہے نیک بخت سعادت کے راستہ میں جاتا ہے اور بدبخت شقاوت کے راستہ میں جاتا ہے خاتمہ بخیر ہوجیو۔

مکتوب سوم جزو مکتوب ص ۳۵۹ از مکتوبات قدوسیہ

تحقیق مالک عبدالرحمٰن عبدالشیطان آنجا بود بنفاق پیش آمد قاعدہ دیگر بود و دیگر کشود و این سبب خزلان و خسران و سیاہ روئ دو جہان اوست ہر کہ ماہ را خاک انداز د خاک در چشم وی افتدہ ماہ راچہ زیان بلکہ در خلاف مردان زخم کاریست ہرگز فلاح نہ پذیر ند بیت بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات+ بادرد کشان ہر کہ در افتاد بر افتاد

(ترجمہ) عبدالرحمٰن بلکہ عبدالشیطان وہاں تھا وہ (میرے بیٹے کے ساتھ) نفاق سے پیش آیا قاعدہ کچھ تھا اس نے دوسرا راستہ نکالا۔ اور یہ اس کی خزلان و خسران اور دونوں جہان کی روسیاہی کا سبب ہے جو کوئی چاند پر خاک ڈالے گا اسی کی آنکھ میں خاک پڑے گی۔ چاند کا اس سے کیا نقصان ہے بلکہ مردان خدا کی مخالفت میں ایسا کاری زخم ہے کہ ہرگز فلاح نہیں ہوسکتی۔

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات   بادرد کشان ہر کہ در افتاد بر افتاد

(ایک خط میں حضرت قطب الاقطاب نے اپنے ایک بہت بڑے مایہ ناز مرید کو کہ وہ بھی خلیفہ ومجاز ہیں یہ تحریر فرمایا ہے)۔

مکتوب چہارم ص ۳۵۸ مکتوبات قدوسیہ

بجانب شیخ جلال حق حق حق بعد حمد وصلوۃ دعا خیر وصلاح شیخ جلال مرتکب تباہی بخیال از فقیر حقیر عبدالقدوس اسمعیل الحنفی مطالعہ کند بداند ہر کہ روؤ از پیران بگرداند و تحقیر فرزندان ایشان بکند مردود ہر دو جہان ومطرود گردد اولا دنا اکباد نامخصوص کہ اہل اللہ و اہل حق باشند اگر تعظیم وتکریم ایشان نکند جز لعنت دیگر بار نیارو بااین نفاق دین کجاو معرفت کجاو مشاہدہ کجا اگر اخلاص واتحاد وخدمتگاری بافرزندان ما نباشد وخود را شیطان صفت شیخ ملاحدہ گویاندو جاہ نفسانی وعز شیطانی خواہد آنچہ دعوی بمشاہدہ ربانی وذوق سبحانی میکند آنہمہ وسوسہ شیطان ست وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ زخم جان عارفانست از ہیبت این زخم واقعہ مکر عارفان خواہند کہ در عدم شیوند و ناچیز گردند بیت کاشکے ہرگز نبودے نام من + نابودے نیس وآرام من + در ابہام عاقبت ہمیں سرست وہمیں ہیبت کجا کسی یا خوداست تا باغر خود وچاہ خود ساکن گرددو آن برادر کہ ہیچ التفات بفرزندم شیخ احمد نمیکند وآمد وشد نمیکند تعظیم وتکریم وی نمی آرد وخبر اونمی ستاند وغم روزگار او نمیو خورو عجیب نمود و محال کشود وبعضی معاملات آن برادر چنان معلوم شد کہ ہیچ ملعونے وہیچ مردودے نکند و کتابت برادری با جفت کفش بطور دیگر رسید و معاملہ بطور دیگر وانمود اگر دیندار ست و طالب کردگار در خدمتگاری فرزندم شیخ احمد باشد وسر در قدم او آرد وہمہ کار ہار ابر خود لازم گیرد وتواضع وتکریم وخدمتگاری فرزندم کما حقہ بجا آرد واگر چنین تکند از ما بیزاری واند و خداو رسول خدارا آزادی واند ہرگز روی او نہ بینم ونام او نگیرم بہشتا در سیدہ ایم امروز فردادر گزریم کار خود بہوشیاری کند شیطان زندہ است بسیار آنزاراہ زدہ است بلعم باعور وشیخ برصیصا از زخم او بدوزخ رسیدہ اند بسیار چہ نویسم خاطر ابتر شدہ است اگر چیزی کردن بتواند بکند و بخدمت و اخلاص پیش رود و اگر نہ باما قطیعت ابدی شدہ است یقین

داند یقین داند واللہ المستعان۔

(ترجمہ) حق حق حق۔ بعد حمد وصلوۃ دعائے خیر وصلاح کے شیخ جلال جو میرے خیال میں تباہی کے مرتکب ہیں۔ فقیر حقیر عبدالقدوس اسمعیل حنفی کی طرف سے مطالعہ کریں اور جانیں کہ جو شخص پیروں سے اعراض اور ان کے فرزندوں کی تحقیر کرے گا دونوں جہاں میں مطرود و مردود ہو جائے گا اولاد نا اکبادنا ہماری اولاد ہمارے جگر گوشہ ہیں خصوصاً (وہ اولاد) جو کہ (خود بھی) اہل اللہ اور اہل حق ہوں اگر ان کی تعظیم وتکریم نہ کرو گے تو بجز لعنت کے اور کچھ پھل نہ ملے گا اس نفاق کے ساتھ دین کہاں اور معرفت کہاں مشاہدہ کہاں اگر اخلاص واتحاد اور خدمتگاری ہمارے فرزندوں کی نہ ہو اور اپنے کو شیطان کی طرح ملاحدہ اور بد دینوں کا شیخ مشہور کرے اور جاہ نفسانی اور عزت شیطانی طلب کرے تو جو کچھ دعوے مشاہدہ ربانی اور ذوق وشوق سبحانی کا کیا جاتا ہے وہ سب شیطانی وسوسہ ہے۔ و مکر و اومکر اللّٰہ واللّٰہ خیر الما کرین یہ عارفوں کی جان کا زخم ہے اس زخم مکر کی ہیبت سے عارفین یوں چاہتے ہیں کہ مٹ جائیں نیست و نابود ہو جائیں۔ کاشکی ہرگز نبودی نام من + تا نبودی جنبش وآرام من + انجام کے مخفی رکھنے میں یہی راز اور یہی ہیبت ہے۔ کوئی اپنی ذات کے ساتھ موجود ہی کہاں ہے یہاں تک کہ وہ اپنی عزت و جاہ کے ساتھ ساکن و مطمئن ہونا چاہتا ہے۔ اور آن برادر (یعنی مکتوب الیہ جو کہ میرے فرزند شیخ احمد کی طرف کچھ التفات نہیں کرتے نہ ان کی خدمت میں آمدورفت کرتے ہیں نہ ان کی تعظیم وتکریم بجالاتے ہیں نہ ان کی خبر لیتے نہ ان کا غم کھاتے ہیں۔ عجیب برتاؤ ظاہر کیا اور نفاق کھول دیا اور بعضے معاملات آن برادر کے ایسے معلوم ہوئے ہیں کہ کوئی مردود اور کوئی ملعون ایسا نہیں کرسکتا۔

اگر آپ دیندار ہیں اور خدائے طالب تو میرے فرزند شیخ احمد کی خدمتگاری میں رہیں اور ان کے قدموں میں سر رکھیں اور ان کے تمام کام اپنے اوپر لازم سمجھیں اور خاطر تواضع وتعظیم وتکریم میرے فرزند کی کما حقہ بجالائیں۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ہماری طرف سے بیزاری جانو اور خدا و رسول خدا کی دل آزاری سمجھو۔ میں ہرگز تمہارا منہ نہ دیکھوں گا

نہ کبھی نام لوں گا۔ میں اسی سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں آج کل میں چل بسوں گا اپنا کام ہوشیاری سے کرو شیطان زندہ ہے اس نے بہتوں کا راہ مارا ہے۔ بلعم باعور اور شیخ برصیصا اس کے زخم سے جہنم میں پہنچ چکے ہیں زیادہ کیا لکھوں خاطر ناساز ہے۔ اگر کچھ کر سکتے ہو کرلو۔ اور خدمت اور اخلاص کے ساتھ پیش آؤ ورنہ ہم سے ہمیشہ کیلئے قطع تعلق ہو چکا ہے۔ یقین جانو یقین جانو واللہ المستعان اھ۔

ناظرین نے غور کیا ہوگا ان مکتوبات میں حضرت قطب الاقطاب نے اپنے بعض بڑے بڑے خلفاء کو ایک ذرا سی بے اعتنائی پر جو فرزند شیخ کے ساتھ ان سے ظہور میں آئی تھی سلب خلافت و اجازت و مطرودیت و مردودیت وغیرہ کی کیسی سخت سخت دھمکیاں دی ہیں تو بھلا جس شخص نے خود اپنے عارف و متبع سنت شیخ کے ساتھ بے اعتنائی سے زیادہ بے حیائی گستاخی و عداوت کا وہ برتاؤ کیا ہو جو کوئی دشمن کسی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا تو اس کے مردود ہونے میں کیا کسر رہ گئی ہے۔ (۲) جن حضرات کو شیخ نے یہ دھمکیاں تحریر فرمائی ہیں انہوں نے بہت جلد خائف و ترساں ہوکر توبہ و معذرت کی اور حضرت شیخ کی اولاد ہی کو طلب عفو کا ذریعہ بنایا جس کے بعد ان کا قصور معاف ہوا اور نعمت سلب شدہ پھر واپس مل گئی۔ (جیسا کہ مکتوبات مندرجہ ص ۳۶۰ و ۳۳۲ سے معلوم ہوتا ہے) اور یہ علامت ہے ان حضرات کی سعادت مندی کی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے جو کچھ بے اعتنائی فرزند شیخ کے ساتھ ظاہر ہوئی تھی وہ کسی عذر یا تساہل کی وجہ سے تھی عناد یا تحقیر کا قصد نہ تھا و فقنا اللہ تعالیٰ لما یحب و یرضی و نعوذ باللہ من غضب اللہ و غضب رسولہ و غضب اولیائہ اجمعین آمین.

(طرفہ) اس مضمون کے ختم کر چکنے کے بعد جی چاہا کہ اس موذی کے متعلق دیوان حافظ سے تفاؤل کروں اور جو کچھ مضمون نکلے ناظرین کی تصریح طبع کیلئے پیش کروں چنانچہ بعد فاتحہ اور دعا کے بسم اللہ کر کے جو دیوان مذکور کھولا تو ص ۲۰۲ کے شروع ورق ہی پر اشعار ذیل نمودار ہوئے جو اس موذی کی حالت کے بالکل مطابق ہیں۔

چند بناز پردرم مہر بتان سنگ دل یاد پدر نمی کنندن این پسران ناخلف

از خم ابروئے توام ہیچ کشائشے نشد وہ کہ درین خیال کج عمر عزیز شد تلف
الی قولہ
بیخبر نذر زاہدان نقش بخوان ولا تقل مست ریاست محتسب بادہ بنوش ولا تخف
صوفی شہر بین کہ چون لقمہ شبہہ می خورد پال دومش دراز باد ایں حیوان خوش علف

شعر اول میں سنگدلی و احسان فراموشی اور پسر نا خلف ہونے کا ذکر ہے۔ دوسرے شعر میں کجی طبیعت کی طرف اشارہ ہے تیسرے شعر میں زاہد ومحتسب کو بیخبر اور ریا کار بتلایا ہے یہ ایک واقعہ ہے کیونکہ اس موذی کو بھی زہد و احتساب کا بڑا دعویٰ تھا مگر سب کا منشا ریا کاری اور طریق سے بیخبری تھی چوتھے شعر میں ذریعہ معاش کے مشتبہ ہونے کا ذکر ہے اور اس وجہ سے اس کو حیوان خوش علف کہا گیا ہے یہ بھی ایک واقعہ ہے اس موذی کو توکل کا ایسا دعویٰ تھا کہ جائز صورت ملازمت کو بھی حرام سمجھتا تھا اور اب وہ سب توکل خاک میں مل گیا اور ایسی جگہ ملازمت ہے جہاں چندۂ حلال وحرام کی کچھ پروانہیں۔

اعاذنا اللہ منہ اللھم ارحمنا بترک المعاصی ابداما
ابقیتنا و ارزقنا حسن النظر فیما یرضیک عنا
ظفر احمد رحمہ اللہ

القول الماضی فی نصب القاضی

القول الماضی فی نصب القاضی

سوال [1]

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آجکل بعض مسلمان ممبران کونسل گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنے والے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے منصب قضا قائم کردیا جائے اس کے متعلق چند امور دریافت طلب ہیں۔

(۱) کیا شرعاً مسلمانوں کیلئے نصب قاضی ضروری ہے۔

(۲) قاضی کی تعریف کیا ہے اور کون شخص قاضی بن سکتا ہے۔

(۳) کن کن معاملات میں قاضی کی ضرورت ہے۔

(۴) جن معاملات میں قاضی کی ضرورت ہے ان میں حاکم غیر مسلم کا فیصلہ معتبر ہے یا نہیں۔

(۵) اگر کسی جگہ کے مسلمان بطور خود اتفاق کر کے فسخ نکاح وغیرہ کے لئے کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی شرعی ہوگا یا نہیں اور اس کے فیصلے ان معاملات میں جن میں قاضی کی ضرورت ہے معتبر ہوں گے یا نہیں۔

(۶) اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے ہندوستان میں کسی مسلمان کو فسخ نکاح وغیرہ کیلئے قاضی بنادے تو وہ قاضی شرعی ہوسکتا ہے یا نہیں اور اس کے فیصلے فسخ نکاح وغیرہ میں معتبر ہونگے یا نہیں۔

(۷) مسلم ممبران کونسل جو درخواست نصب قاضی کے متعلق کونسل میں پیش کرنے والے ہیں اس میں عامہ مسلمین کو ان کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے یا نہیں اور اس

---

[1] یہ تحریر اس زمانہ کی ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔

معاملہ میں ہم کو کوشش کرنا چاہیے یا نہیں۔

الجواب

(۱) قاضی شرعی کا قائم کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے جہاں قدرت ہو۔ جیسے دارالاسلام اور جہاں قدرت نہ ہو جیسے ہندوستان تو وہاں حکومت سے اس کے متعلق درخواست کرنا ضروری ہے۔

قال فی البدائع فنصب القاضی فرض لانہ ینصب لا قامة مفروضٍ وھوا لقضاء قال اللّٰہ سبحانہ و تعالی لنبینا المکرم علیہ افضل الصلوۃ والسلام فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ والقضاء ھو الحکم بین الناس بالحق والحکم بما انزل اللّٰہ عزوجل فکان نصب القاضی لاقامة الفرض فکان فرضاً ضرورةً وقد سماہ محمد . فریضة محکمة لانہ لا یحتمل النسخ لکونہ من الاحکام التی عرف وجوبھا بالعقل والحکم العقلی لا یحتمل الانتساخ واللّٰہ تعالیٰ اعلم اھ ملخصا (ص ۲ ج ۷)

(۲) فی العالمگیریہ. والقضاء فی الشرع قول ملزم یصدر عن ولایة عامة کذا فی خزانة المفتین ولا تصح ولایة القاضی حتی تجمع فی المولیٰ شرائط الشھادة کذا فی الھدایة من الاسلام والتکلیف والحریة و کونہ غیر اعمی ولا محدوداً فی القذف ولا اصم ولا اخرس واما لا طرش الذی یسمع القوی من الاصوات فالا صح جواز تولیتہ کذا فی النھر اھ (ص ۱۶۰ ج ۴) و فی الدرلمختار القضاء شرعاً فصل الخصومات وقطع

المنازعات و ارکانه ستة حکم و محکوم به وله محکوم علیه و حاکم و طریق و اهله اهل الشهادة و الفاسق اهلها فیکون اهله لکنه لایقلد وجوباً و یاثم مقلده کقابل شهادته به یفتی اھ (۴۶۴ ج ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کیلئے صاحب حکومت ہونا رکن قضا ہے کہ جس مقام پر وہ قضا کرتا ہے وہاں پر اس کی ولایت وحکومت عام ہو (گو کسی خاص فرقہ ہی پر ہو) اور گو خاص خاص معاملات ہی میں ہو، **قال فی رد المختار ثم القاضی تتقید ولایته بالزمان والمکان و الحوادث** اھ ص۴۶۲ ج ۴) غیر صاحب حکومت قاضی نہ ہوگا اور صحت قضا کے لئے قاضی میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ مسلمان ہونا کافر نہ ہو عاقل بالغ ہو آزاد ہو غلام نہ ہو۔ سوانکھا ہو کو اندھا نہ ہو۔ محدود فی القذف نہ ہو۔ اور بہرا گونگا نہ ہو باقی اونچا سنتا ہو تو اس کا مضائقہ نہیں اور ضروری ہے کہ قاضی عالم بھی ہو اگر مسلمان جاہل کو قاضی بنادیا گیا اور وہ مقدمات میں علماء سے استفتاء کر کے فیصلہ کر دے یہ بھی ممکن ہے مگر بہتر نہیں کیونکہ علماء کے جواب کو بخوبی سمجھنے میں جاہل سے کوتاہی ہوگی اور غلطی کرے گا۔ اور عالم کے ہوتے ہوئے جاہل کو قاضی بنانے سے مسلمان گنہگار ہوں گے جبکہ حکومت کی طرف سے ان کو انتخاب کا حق دیا جائے اور اگر فاسق کو قاضی بنادیا جائے۔ تو وہ قاضی ہو جائے گا مگر فاسق کو قاضی بنانا جائز نہیں اور فاسق وہ ہے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اور توبہ نہ کرے یا صغیرہ پر اصرار کرتا ہو باقی جن مسائل میں قضاء قاضی شرط ہے جن کا ذکر آگے آتا ہے ایسے مسائل میں حاکم کافر کا فیصلہ ہرگز کافی نہیں حاکم کافر کے فیصلہ سے نہ نکاح فسخ ہوسکتا ہے۔ نہ طلاق واقع ہوسکتی ہے نہ ثبوت نسب ہوسکتا ہے نہ مفقود کو میت کہا جاسکتا ہے۔ وغیر ذلک۔

(۳ و ۴) شریعت محمدیہ اور ملت اسلامیہ میں بعض معاملات ایسے ہیں جن میں قاضی شرعی یعنی حاکم مسلم کا فیصلہ ہی معاملہ کو فیصل کرسکتا ہے حاکم غیر مسلم کا فیصلہ ان معاملات میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہوسکتا بلکہ شرعاً حاکم غیر مسلم کا فیصلہ ان معاملات میں کالعدم اور غیر قابل اعتبار ہے نمونہ کیلئے میں چند مسائل کا ذکر کرتا ہوں جن میں

مسلمانان ہند کو قاضی شرعی کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔

(۱) کسی لڑکی کا نکاح بلوغ سے پہلے اس کے ولی نے جو باپ دادا کے سوا ہو کر دیا اور بالغ ہونے پر لڑکی اس نکاح سے راضی نہیں تو اس نکاح کو قاضی شرعی چند شرائط کے ساتھ فسخ کرسکتا ہے حاکم غیر مسلم اگر فسخ کرے گا تو وہ فسخ معتبر نہ ہوگا۔ شامی مع درمختار (ص ۴۸۶ ج ۲) وہدایہ (ص ۲۵۷ جلد ۲)

(۲) کسی بالغ عورت نے اپنا نکاح خاندانی مہر سے کم مقدار پر یا کسی غیر کفو سے بدون رضائے ولی کے خود کرلیا تو اصل مذہب میں خاندان والوں کو حق دیا گیا ہے کہ وہ قاضی کی عدالت میں دعویٰ کر کے پہلی صورت میں مہر پورا کرالیں اور دوسری صورت میں نکاح کو فسخ کرادیں شامی معہ درمختار (ص ۴۸۶ ج ۲ وص ۵۸۱ ج ۲) فسخ کرنا قاضی ہی کا کام ہے دوسرے کا نہیں۔

(۳) کسی شخص نے اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کیا یا بدنیتی سے ہاتھ لگایا تو یوں عورت اپنے شوہر کیلئے حلال نہیں رہی مگر نکاح اس وقت تک نہیں ٹوٹتا جب تک قاضی نکاح کو فسخ نہ کرے یا زوجین خود قطع تعلق نہ کردیں اور آجکل بعض دفعہ شوہر قطع تعلق نہیں کرتا تو بدون قاضی شرعی کے ایسی عورت کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ شامی معہ درالمختار (ص ۴۶۳ ج ۲)

(۴) شوہر نامرد ہو اور بیوی کو طلاق بھی نہ دیتا ہو تو اس نکاح کو ایک سال کی مہلت دینے کے بعد قاضی فسخ کرسکتا ہے۔ عالمگیری (ص ۱۵۶ ج ۲) بدون قاضی کے ایسی صورت میں عنین کی بیوی کو سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

(۵) اسی طرح شوہر مجنون ہو جاوے تو اس کے نکاح کو بھی قاضی ہی فسخ کرسکتا ہے عالمگیری (ص ۱۵۷ ج ۲)

(۶) کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جاوے۔ تو اس کی بیوی کو ایک خاص مدت کے بعد جس کی تحقیق کتب مذہب میں ہے قاضی شرعی مفقود کے نکاح سے خارج کرسکتا ہے۔ عالمگیری ص ۱۷۶ ج ۳۔

(۷) اگر شوہر کسی وقت اپنی بیوی کو زنا سے متہم کرے یا اس کی اولاد کو غیر مرد کی

بتلاوے تو عورت عدالت قاضی میں مرافعہ کر کے لعان کر سکتی اور اپنی ہتک حرمت کا بدلہ لے سکتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو شوہر کو اگر وہ جھوٹا ہوا اس تہمت کی سزا ملے گی یا نکاح فسخ کرا دیا جائے گا۔ عالمگیری (ص ۱۵۱، ۱۵۲ ج ۲)

(۸) اگر کسی نابالغ لڑکی کا کوئی ولی نہ ہو اور پرورش کے لئے جلدی نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو ایسی لاوارث لڑکیوں کا ولی قاضی ہے (عالمگیری ص ۱۱ جلد ۲) بدون قاضی شرعی کے ان مسائل میں مسلمانوں کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ ہم نے مدارس عربیہ میں ایسے سوالات کے جوابات میں علماء کو یہی لکھتے ہوئے دیکھا ہے کہ اگر قاضی شرعی مفقود کی موت کا حکم کر دے یا عنین کا نکاح فسخ کر دے تو عورت دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور قاضی شرعی نہ ہو تو عورت کو بجز صبر کے کچھ چارہ نہیں۔

(۹) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دیکر یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ہوش و حواس کی حالت میں طلاق نہیں دی بلکہ میں مدہوش یا مغلوب الغضب تھا تو اس صورت میں عورت کو شوہر کے اس قول کی تصدیق جائز نہیں بلکہ اس مقدمہ کا مرافعہ قاضی کی عدالت میں لازم ہے اگر وہ اس طلاق کو طلاق تسلیم نہ کرے جس کی خاص شرائط ہیں تب تو عورت شوہر کے پاس رہ سکتی ہے ورنہ نہیں رہ سکتی۔ شامی معہ الدر باب طلاق المدہوش جلد ۲۔

(۱۰) کسی نے نکاح فاسد کر لیا تو اس نکاح کو قاضی ہی فسخ کر سکتا ہے یا شوہر بیوی کو خود چھوڑ دے (عالمگیری ص ۴۰ ج ۲) اگر وہ نہ چھوڑے تو بدون قاضی کے عورتوں کو اس حالت میں سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

یہ چند مسائل صرف باب نکاح و طلاق کے بطور نمونہ کے عرض کئے گئے ہیں باقی ابواب نسب وقف و میراث وغیرہ میں جو مسائل قاضی شرعی کے وجود پر موقوف ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ جن میں بدون قاضی کے مسلمانان ہند کو سخت تکلیف ہے اور اس تکلیف کو وہ بدون گورنمنٹ کی امداد کے حل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ قاضی کے لئے مسلم ہونے کے ساتھ صاحب حکومت ہونا بھی ضروری ہے اگر کسی جگہ کے مسلمان از خود کسی کو قاضی بنانا چاہیں تو وہ قاضی نہ ہوگا محض حکم اور ثالث ہوگا جس کا فیصلہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے

جبکہ مدعی و مدعیٰ علیہ دونوں اپنا معاملہ اس کے سپرد کردیں اور اگر ایک فریق سپرد کرنا چاہے دوسرا نہ چاہے تو اس صورت میں ثالث اور حکم کا فیصلہ کسی درجہ میں بھی معتبر نہیں۔

﴿قال فی العالمگیریة. والقضاء المولی شرائط الشهادة كذا فی الهداية من الاسلام و التكليف والحرية الخ (ص ۱۶۰ ج ۴) وفيها ايضاً و اذا اجتمع اهلّ بلدة علی رجل وجعلوه قاضيا يقضی فيما بينهم لا يصير قاضيا الخ﴾ (ص ۱۶۴ ج ۴)

ان عبارات میں تصریح ہے کہ قاضی کے لئے مسلمان ہونا صاحب حکومت ہونا شرط ہے اور یہ کہ کسی جگہ کے مسلمان ازخود کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ صاحب حکومت قاضی وہی ہوسکتا ہے جو سلطنت کی طرف سے مقرر کیا جاوے اس لئے گورنمنٹ کی امداد کے اس مسئلہ میں مسلمانان ہند سخت محتاج ہیں کیونکہ بدون قاضی کے بعض مسائل میں ان کا دین برباد ہوتا ہے اور غیر مسلم حکام کا فیصلہ ان مسائل میں جو قضاء قاضی کے محتاج ہیں محض لغو اور کالعدم ہے اس لئے مسلمانوں کو نہایت التجا کے ساتھ گورنمنٹ سے درخواست کرنا چاہیے کہ وہ ہندوستان میں منصب قضاء کو قائم کر کے اپنی مسلم رعایا کو ان مشکلات سے نجات دے اور جب تک منصب قضاء کی تجویز مکمل نہ ہو اس وقت تک کے لئے کم از کم یہی قانون مقرر کردیا جاوے کہ جو مسائل قضاء قاضی کے محتاج ہیں ان کا فیصلہ غیر مسلم حکام نہ کریں بلکہ ایسے مقدمات مسلم حکام ہی کے سپرد ہوں اور مسلم حکام کو ہدایت کی جائے کہ ان مسائل میں علماء سے صورت مقدمہ بیان کر کے شرعی حکم حاصل کریں اور شرعی فتوے کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کردیں اور اپنے فیصلہ کے ساتھ عالم کے فتوے کو بھی نتھی کردیا کریں۔ جیسا کہ میراث و تقسیم ترکہ کے مقدمات میں ابھی بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اگر یہ صورت بھی ہو جائے تو مسلمانان ہند کی مشکلات بہت کچھ کم ہو جائیں گی ہمیں قوی امید ہے کہ گورنمنٹ ہماری اس درخواست پر ضرور توجہ کرے گی اور اپنی مسلم رعایا کو شکر و امتنان کا موقع دیگی۔ واللّٰه المستعان فی کل

باب وهو الميسر لكل صعاب.

(۵) ﴿قال في الدر و يجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كان كافر ذكره مسكين وغيره الا اذا كان يمنعه عن القضاء بالحق فيحرم اھ (ص ۴۶۸ ج ۴) في العالمگيرية. والاسلام ليس بشرط اى في السلطان الذى يقلد كذا في التاتر خانية ﴾ اھ (صفحہ ۱۶۰ ج ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان کو قاضی بنا دے اور جن مسائل میں قضاء قاضی کی ضرورت ہے ان میں اس کو فیصلہ کا اختیار دے دے تو وہ شرعی قاضی ہو جاوے گا اور اس کے فیصلے فسخ نکاح و ایقاع طلاق و ثبوت نسب و حکم موت مفقود وغیرہ میں نافذ ہونگے بشرطیکہ اس کو موافق حکم شرع فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے خلاف حکم شرع فیصلہ پر مجبور نہ کیا جائے۔

(۶) ﴿قال في العالمگيرية و اذا اجتمع اهل بلدة على رجل وجعلوه قاضياً يقضى فيما بينهم لا يصير قاضيا ولو اجتمعوا على رجل وعقد وامعه عقد السلطنته او الخلافة يصير خليفة وسلطاناً﴾ اھ (ص ۱۶۴ جلد ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کسی جگہ کے مسلمان بطور خود بدون گورنمنٹ کی اجازت کے اگر کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا کیونکہ اس کی ولایت[1] عامہ نہ

---

[1] قلت فلا يرد عليه ما في ردالمختار (ص ۴۷۷ جلد ۴) وهذا احيث لاضرورة والا فلهم اى للعامة تولية القاضي ايضاً كما ياتي بعده وقال بعد اسطر واما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجميع والا عياد و يصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين اھ فن مضاء انه يصير قاضيا بتراضي المسلمين اذا حصلت له ولاية عامة في محلل قصد لما عرفت ان الولاية احد اركان القضاء واهل الهند لو جعل اقاضيا منهم بتراضيهم لا يكون له ولاية على احد اصلا كما هو مشاهد من حالهم فافهم.

ہوگی۔ البتہ حکم ہو جائے گا جس کا فیصلہ اسی وقت معتبر ہوگا جبکہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں رضا مندی سے اپنے معاملہ کو اس کے سپرد کر دیں اور اگر ایک نے معاملہ سپرد کیا اور دوسرے نے سپرد نہ کیا تو اس صورت میں حکم کا فیصلہ کالعدم ہے اور فریقین باہمی رضا مندی سے اگر کسی کو حکم بنالیں اور وہ موافق حکم شرعی فیصلہ کر دے تو اسے بھی فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا اور اس کے فسخ سے نکاح فسخ ہو جائے گا۔ یعنی جب معاملہ سپرد کر دیا گیا اور فیصلہ تک تحکیم سے کسی فریق نے رجوع نہ کیا تو اب حکم کا فیصلہ بھی مثل فیصلہ قاضی کے لازم و نافذ ہو جائے گا، پھر کوئی فریق اس کو توڑ نہیں سکتا۔ بشرطیکہ فیصلہ موافق حکم شرع ہو۔

﴿قال الشامی. اما المحکم فشرطه اهلية القضاء و يقضی فيما سوی الحدود والقصاص اھ (ص۴۶۲ ج۴) وفيه ايضاً التحكيم عرفاتو لية الخصمين حاكماً يحكم بينهما ببينةٍ او اقرار اونكول و رضيا بحكمه (الی ان حكم احتراز عما لو رجعا عن تحكيمه قبل الحكم او عما لو رضی احدهما ما فقط ۱۲ شامی) صح فی غير حدو قو دودية علی عاقلة لان حكم المحكم بمنزلة الصلح وهذا لاتجوز با لصلح فلا تجوز بالتحكيم و ينفرد احدهما بنقضه ای التحكيم بعد وقوعه فان حكم لزمهما ولا يبطل حكمه بعزلهما لصدوره عن ولاية شرعية﴾ ۱ھ (ص ۵۴۰ ج ۴)

(۷) جب یہ معلوم ہو چکا کہ قاضی شرعی کا قائم کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ بعض معاملات میں حاکم غیر مسلم کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں۔ بلکہ حاکم مسلم کا فیصلہ ضروری ہے تو عامہ مسلمین پر ضروری ہے کہ وہ اپنی اس شرعی ضرورت کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر کے درخواست کریں کہ ہندوستان میں منصب قضاء کو قائم کر کے اپنی مسلم رعایا کو مشکلات سے نجات دے۔ چونکہ گورنمنٹ اپنی رعایا کی راحت رسانی

کا بہت زیادہ خیال کرتی ہے بالخصوص مذہبی معاملات میں اس کو ہر طرح آسانی بہم پہنچاتی ہے۔اس لئے قوی امید ہے کہ یہ درخواست منظور ہوگی۔

نیز جو مسلم ممبران کونسل اس مسئلہ کو کونسل میں پیش کرنے والے ہیں ان کے ساتھ سب مسلمانوں کو اتفاق رائے ظاہر کرنا چاہیے اور ہر ضلع کے مسلمانوں کو اپنی طرف سے الگ الگ اس مسئلہ کی ضرورت ظاہر کرنا چاہیے کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے جو بے توجہی اب تک اس مسئلہ میں ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کو ہنوز ضرورت کی اطلاع اہمیت کے ساتھ کسی نے نہیں کی۔ضرورت پر مطلع ہوکر امید ہے کہ گورنمنٹ بہت جلد مسلمانوں کے حال پر توجہ فرمائے گی۔

الجواب صواب بلا ارتیاب اشرف علی ۴ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

حررہ الاحقر ظفر احمد رحمہ اللہ عنہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بون ۴ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

تمت رسالہ القول الماضی فی نصب القاضی

ذکر محمود

﴿ضمیمہ ذکر محمود﴾

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ٥

﴿الحمد للّٰہ الذی کل شیٔ ماخلاہ باطل وھو الحی المعبود. والصّلوۃ والسلام علی افضل الرسل سیدنا محمد ن الذی ھو فخر کل موجود. خاتم الرسالۃ وصاحب الشفاعۃ العظمیٰ والمقام المحمود. وعلی الہ واصحابہ واتباعہ الطیبین الطاھرین الفائزین بالمقصود﴾

اما بعد

احقر ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ حضرت سیدنا امیر المومنین علی کرم اللہ تعالیٰ وجہ کا ارشاد ہے اذا ذکر الصّالحون فحیھلا بِعُمرَ (رواہ السیوطی فی الجامع الکبیر) جب صالحین کا ذکر کیا جائے تو (حضرت) عمرؓ کا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے اھ۔ اس ارشاد سے ذکر صالحین کی اہمیت اور ان میں سے بالخصوص کاملین کی اقدسیت مستنبط ہوتی ہے اس سنت کا اتباع کرتے ہوئے دل چاہتا ہے کہ اس وقت ناظرین کے سامنے حضرت اقدس شیخ العالم قطب العارفین کہف الطالبین مولانا محمود حسن المحدث العارف الصوفی الدیو بندی قدس اللہ سرہ کا جو شدت و غلظت علی المعاندین و رحمت و رافت بالمسلمین میں اپنے وقت کے عمر اور سیاست میں عثمان وقت تھے مختصر تذکرہ پیش کروں۔ کیونکہ مفصل تذکرہ لکھنا انہی حضرات کا کام ہے جو حضرت کی طول صحبت و ملازمت

خدمت سے زیادہ مشرف ہوئے ہیں۔ جس سے یہ ناکارہ محروم ہے اور اس کو رسالہ ذکر محمود کا جو کہ حضرت حکیم الامت مجدد الملت مربی روحانی وجسمانی سیدی مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمہ اللہ نے اس احقر کی درخواست پر مولانا ممدوح قدس سرہ کے تذکرہ میں بالاختصار تحریر فرمایا ہے ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ حق تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں اور اس ناکارہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض برزخیہ سے فیضیاب فرمائیں۔

منشاء اس تحریر کا صرف یہ ہے من احب شیئا اکثر ذکرہ کہ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے وہ اس کو بہت یاد کرتا ہے جیسا کہ اس مضمون کو حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہ نے ایک حکایت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔

گفت اے مجنون لیلی چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشقِ نام لیلے می کنم — خاطر خود راتسلی می دہم
باز گوازنجد وا زیاران نجد — تادر و دیوار را آری بوجد
یاد یاراں یار رامیموں بود — خاصہ کان لیلی و ایں مجنون بود

اور مقصود یہ ہے کہ طالبانِ راہ حق کو اتباع اور اقتدا کا ایک نمونہ کھلا دیا جائے اور بس۔ اس لئے امید ہے کہ الفاظ کی بے ربطی پر التفات نہ فرما کر اصل مقصود سے متنفع ہونے پر نظر رکھی جائے گی۔ اس ضمیمہ میں بھی اصل رسالہ کی طرح واقعات کو نمبر وار بعنوان (ذکر) بیان کیا جائیگا۔

(ذکر نمبر ۱) سادگی

سب سے اول اس ناکارہ کو اس مرکز دائرہ ارشاد کی زیارت اس وقت ہوئی جب کہ میں مدرسہ عالیہ دیوبند میں فارسی اردو وغیرہ کی تعلیم پاتا تھا اور اس وقت میری عمر تقریباً نو دس سال کی تھی اس لئے حقیقی کمالات کو تو میں اس وقت کیا سمجھ سکتا تھا البتہ خداداد محبوبیت کی شان کی وجہ سے میرے دل میں حضرت کی محبت اور عظمت وعقیدت اسی وقت سے جاگزیں ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت حضرت کا لباس بہت ہی سادہ

ہوتا تھا گاڑھے کی نیلی لنگی اکثر کاندھے پر پڑی رہتی اور باقی لباس بھی موٹا جھوٹا ہوتا تھا مگر اس کے باوجود ایک خداداد عظمت تھی جو اس لباس کے اندر بھی نمایاں ہوتی تھی۔

ہیبت حق ست و ایں از خلق نیست — ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

(ذکر نمبر ۲) ذکاوت وظرافت وجفاکشی

ایک بار میں سہارنپور سے (جب کہ وہاں خدمت تدریس پر مامور تھا) دیوبند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت اس وقت حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے۔ باوجود یکہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں کچھ تکلیف بھی تھی غالباً چوٹ لگ گئی تھی اور طلبہ اصرار کر رہے تھے کہ ہم اس حالت میں پڑھنا نہیں چاہتے جناب کو تکلیف ہوگی۔ مگر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ناغہ کرنا اچھا نہیں اور میں ہاتھ سے تھوڑا ہی پڑھاؤں گا جو تکلیف ہو میں تو زبان سے پڑھاؤں گا۔ غرض سبق شروع ہوا۔ کتاب غالباً ترمذی تھی اس میں یہ حدیث آئی۔

﴿لا یمنعکم اذان بلال فانه یؤذن باللیل فکلوا واشربوا حتی یوذن ابن ام مکتوم الخ﴾

''حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلال کی اذان تم کو کھانے پینے سے نہ روکے کیونکہ وہ رات میں اذان دیتے ہیں بلکہ تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ (کیونکہ وہ صبح ہو جانے کے بعد اذان دیتے ہیں)''

اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان دینا وقت سے پہلے بھی جائز ہے کیونکہ بلال صبح ہونے سے پہلے اذان دیتے تھے۔ حضرت مولانا نے فوراً جواب دیا کہ اگر اذان دینا وقت سے پہلے جائز ہوتا اور وہ اذان کافی ہو جایا کرتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو اذانیں کیوں دلواتے بس بلال کی اذان صبح کی نماز کے لئے کافی تھی۔ عبداللہ ابن ام مکتوم کی اذان کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو خود یہ بات معلوم ہوتی ہے

کہ بلال کی قبل از وقت اذان صبح کی نماز کے لئے کافی نہ تھی۔ یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔ اگر وقت سے پہلے اذان دے دی جائے تو وہ کافی نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا اعادہ ضروری ہے۔

رہی یہ بات کہ جب بلال کی اذان صبح کی نماز کے لئے کافی نہ تھی تو وہ کس لئے اذان دیتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلال کی اذان درحقیقت اذان نہ تھی بلکہ وہ روزہ داروں کو سحری کے لئے جگانے کا اعلان تھا۔ آج کل سحری میں جگانے کے واسطے نقارے بجائے جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے اذان کی صورت کو مناسب سمجھا اور صحابہ کو مطلع کر دیا کہ بلال رات میں اذان دیا کرینگے اس سے صبح ہو جانے کا گمان نہ کرنا سو اس سے حنفیہ کو بھی انکار نہیں اگر اس وقت کوئی امام (اور خلیفہ) ہو اور وہ سحری میں جگانے کے واسطے یہی صورت اختیار کرے جائز ہے مگر ہر شخص کو ایسا اختیار نہیں ہے کیونکہ خلیفہ جو کچھ کریگا انتظام سے کریگا اور دوسرے لوگ نہ معلوم کیا کیا گڑ بڑ کریں گے۔ پس حنفیہ کے دعوے کی اس حدیث سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔ اھ۔

یہ بات تو مولانا کی خصوصیات میں سے تھی کہ دلائل خصم سے اپنا مدعی ثابت کر دیتے تھے اور اس آسانی سے کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ حدیث تو حقیقت میں حنفیہ ہی کی دلیل ہے دوسرے خواہ مخواہ اس سے اپنا مدعی ثابت کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ بعض حضرات کے پاس مولانا کی تقریریں فن حدیث کے متعلق محفوظ ہیں خدا کرے وہ شائع ہو جائیں افسوس ہے کہ اب تک حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ کی تقریریں بھی شائع نہیں ہوئیں جو استاذی مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ علیہ نے قلمبند فرمائی تھیں خدا ان کی اشاعت کا بھی سامان کردے۔

(ذکر نمبر ۳) اکمال صلوۃ

حضرت قدس سرہ نماز بہت اچھی ادا فرماتے تھے ایک مرتبہ مجھے بریلی کے سفر میں حضرت کی معیت نصیب ہوئی مغرب کے بعد جو حضرت نوافل کی نیت باندھ کر کھڑے ہوئے تو قیام کی حالت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بدن میں حس وحرکت ہی

نہیں۔ پھر قیام کی طرح رکوع اور سجدے بھی لمبے لمبے نہایت سکون کے ساتھ ہوتے تھے۔غرض کہ آپ کی نماز بالکل مطابق سنت تھی۔ رمضان کی راتوں میں سنا ہے کہ مولانا بہت ہی کم سوتے پھر سحری کے وقت تک نوافل میں قرآن سنتے رہتے تھے اور بعض دفعہ تمام رات نماز اور تلاوت ہی میں گزار دیتے تھے۔نوافل کی جماعت میں آپ کو توسع تھا ثقات سے سنا ہے کہ رمضان کی راتوں میں آپ کے یہاں نوافل کی بڑی جماعت ہوتی تھی لیکن ہمارے دیگر مشائخ اس میں تنگی کرتے ہیں اور نفل کی جماعت کو مکروہ فرماتے ہیں کہ اصل مذہب حنفیہ کا یہی ہے مگر مسئلہ مجتہد فیہا ہے اس لئے حضرت قدس سرہ اس میں توسع فرماتے تھے۔

(ذکر نمبر ۴) چھوٹوں پر شفقت

ایک بار میں سہارنپور سے دیوبند گیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا آنے والوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ اور خندہ پیشانی سے پیش آنا یہ تو حضرت کی جبلت ثانیہ تھی۔ مجھ کو اپنے پاس ہی بٹھلا لیا اس وقت حضرت عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے اور ڈاک کے خطوط ملاحظہ فرمارہے تھے۔ان میں ایک خط خاص شخص کا تھا جو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں اور حضرت شیخ العالم مولانا دیوبندی نے ان کو خلافت و اجازت عطا فرمائی تھی مگر درحقیقت وہ اس وقت اجازت کے قابل نہ تھے حضرت نے خط پڑھ کر ان کا تذکرہ کیا (اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ حضرت نے ان کو خلافت کیوں دیدی یہ تو اس قابل نہیں ہیں) حضرت نے فوراً مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ وہ ذکر و شغل پابندی سے کرتے ہیں اور اکثر خلوت میں رہتے ہیں۔ مجاہدہ بھی بہت کرتے ہیں اور جو ان سے بیعت ہوتا ہے اس کو صحیح عقائد تعلیم کرتے اور نماز وغیرہ کی بہت تاکید کرتے ہیں اور ان اطراف میں لوگ ان کے بہت معتقد ہیں تو میں نے اس مصلحت سے ان کو اجازت دے دی ہے کہ کام کرتے کرتے قابل ہو ہی جائیں گے اور عوام ان کے ذریعہ سے گمراہ پیروں سے بچے رہیں گے۔

اگرچہ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ ابھی وہ اجازت کے اہل نہیں مگر بات یہ ہے کہ کام کرنے والا محروم نہیں رہتا۔ اھ۔ میں اپنے خطرہ پر بہت شرمندہ ہوا اور حضرت کی اس شفقت پر بہت ہی حیرت ہوئی کہ مجھ جیسے نااہل کے سامنے اپنے اسرار ظاہر فرما دیئے۔ مکہ معظمہ سے حضرت حکیم الامت کے نام جو والا نامہ آپ نے تحریر فرمایا اس میں احقر کو اور چند دیگر صاحبوں کو بھی سلام سے یاد فرمایا جو خدام پر غائبانہ شفقت کی دلیل ہے۔

(ذکر نمبر ۵) مزاح

اہل اللہ کی طبیعت میں چونکہ ذکر و شغل کی برکت سے نشاط اور انشراح زیادہ ہوتا ہے اس لئے یہ حضرات اکثر زندہ دل ہوتے ہیں جس کا ظہور کبھی کبھی ان کے کلام میں بضمن ظرافت ہو جاتا ہے۔ حضرت قدس سرہ بہت زندہ دل تھے اور بعض دفعہ چبھتے ہوئے فقرے ایسے فرما دیا کرتے تھے کہ مجلس کی مجلس لوٹ جاتی ۔ حضرت حکیم الامت بواسطہ روایت فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ اپنے بعض حضرات جمع تھے مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے اور وہ کسی بات پر اپنے چھوٹے بھائی کو دھمکا رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے ان کو یہ کہا کہ تو بڑا گدھا ہے تو حضرت مولانا قدس سرہ بیساختہ کیا فرماتے ہیں کہ گدھا ہونا تو مسلم لیکن بڑا ہونے میں کلام ہے۔ اس فقرہ پر سب حاضرین لوٹ گئے اور مولوی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

(ذکر نمبر ۶) قوت نسبت

حضرت حکیم الامت سے میں نے سنا فرماتے تھے کہ مجھ سے مولوی بدر الدین صاحب مرحوم ساکن گلاؤٹھی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ خورجہ تشریف لے گئے عشاء کے بعد سونے کے لئے لیٹ گئے تھے کہ امیر محمد شاہ صاحب جو ایک صاحب نسبت بزرگ تھے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ دیر تک حضرت کی طرف مراقب ہو کر بیٹھے پھر دیوانوں کی طرح اٹھ کر حضرتؒ کے تلوے چومنے لگے حضرت مولانا فوراً اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ صاحب یہ کیا غضب کرتے ہو انہوں نے کہا کہ حضرت میں نے

بہت صاحب نسبت دیکھے ہیں مگر آپ جیسا قوی النسبت نہیں دیکھا۔ مجھے اپنے فیض سے محروم نہ فرمائیے۔ ف۔ میں کہتا ہوں کہ حضرتؒ کی قوت نسبت ایسی ظاہر تھی کہ اس کے لئے کسی دلیل کا بیان کرنا اس کی تنقیص کرنا ہے۔

زمدرح نا تمام ما جمالِ یا رمستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے بنارا

(ذکر نمبر ۷) انفاق محبوب

حضرت حکیم الامت فرماتے تھے کہ جس وقت میں دیوبند میں پڑھتا تھا اس زمانہ میں حضرتؒ کے یہاں ایک گائے تھی جس کو مولانا نے قربانی کے واسطے خریدا تھا۔ عصر کے بعد اپنے ساتھ جنگل لیجا کر اسے دوڑایا کرتے اور دانہ وغیرہ خوب کھلاتے تھے چند دنوں میں وہ ایسے تیار ہوگئی کہ قصائی اس کے ۸۰ روپے دیتے تھے حالانکہ اس زمانہ میں گائیں ایسی ارزاں ملتی تھیں کہ دس بارہ روپے کو اچھی مل جاتی تھی اس سے اندازہ کرلیا جاوے کہ اس زمانہ میں جس گائے کے ۸۰ روپے قیمت ملتی ہو وہ کیسی کچھ ہوگی مگر حضرت مولانا نے اس کو نہیں بیچا اور قربانی کے دن ذبح کر دی. حالانکہ خود مولانا کو اس سے محبت بھی بہت ہوگئی تھی اور ذبح کرتے ہوئے آنسو بھی نکل آئے مگر آپ نے خدا کے لئے اس کی قربانی کردی اور فروخت نہیں کی سبحان اللہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ پر عمل کر کے دکھلا دیا۔

(ذکر نمبر ۸) ہر کس و ناکس کا خیال

یہ صفت حضرتؒ میں بہت ہی بڑھی ہوئی تھی حضرت حکیم الامت فرماتے تھے کہ دیوبند کے جلسہ دستار بندی کے موقعہ پر مولوی احمد صاحب رامپوری نے مہتمم صاحب کے پاس ایک مزدور کو خط دیکر بھیجا تھا۔ جس میں مدرسہ کے متعلق کوئی بات لکھی تھی۔ مہتمم صاحب نے اس مزدور کو ۴ آنہ کے پیسے خوراک کے لئے دیدیئے کہ بازار سے کچھ لیکر کھالینا اور خط کا جواب لکھ دیا جب حضرتؒ کو معلوم ہوا کہ رامپور سے مزدور آیا تھا تو آپ

نے دریافت فرمایا کہ اس کو کھانا بھی کھلا دیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت چار آنہ کے پیسے دے دیئے گئے فرمایا کہ غریب آدمی پیسے خرچ نہیں کرتا وہ ان پیسوں کو تو اپنے ساتھ لے جائیگا اور بھوکا رہے گا۔ جلدی اس کو تلاش کرو۔ چنانچہ چند آدمی اس کو تلاش کرنے نکلے اور خود حضرت نے بھی تلاش کیا یہاں تک کہ بہت دور سے ملا اس کو واپس بلا کر حضرت نے کھانا کھلوا کر پھر رخصت کیا۔

فائدہ

واقعی اخلاق نبوت یہی ہیں اور کمالات انہی کا نام ہے۔ یہ کوئی کمال نہیں کہ ذرا رقت طاری ہوگئی اور رو لئے یا دوسروں کو رلا دیا۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال می تواں بتمنا گریستن

(ذکر نمبر ۹) سوز و درد

حضرت حکیم الامت فرماتے تھے کہ مولاناؒ کی نسبت میں سوز درد اور بیتابیٔ عشق بہت زیادہ ہے۔

(ذکر نمبر ۱۰) حب شیخ

مولانا گنگوہی قدس سرہ کی حیات میں حضرتؒ کا اکثر معمول یہ تھا کہ جمعرات کی شام کو دیوبند سے چل کر عشاء کے وقت تک گنگوہ پہنچ جاتے پھر وہاں سے شنبہ کی رات کو عشاء کے بعد چل کر صبح تک دیوبند پہنچ جاتے اور حسب معمول سبق شروع کرا دیتے (میں نے ثقات سے یہ بات سنی ہے)۔

فائدہ

اس سے مولانا کے دو کمال ثابت ہوتے ہیں ایک محبت شیخ میں پا پیادہ یا طویل مسافت طے کر کے زیارت کے لئے پہنچنا جو بدون شدید بیتابی کے نہیں ہوسکتا۔ دوسری

تقویٰ اور دیانت کہ مدرسہ کی تعلیم میں حرج واقع نہ کرتے تھے۔

(ذکر نمبر ۱۱)

میں نے ثقات سے سنا ہے کہ گنگوہ پہنچ کر بعض دفعہ مولاناؒ عشا کے بعد حضرت قطب العالم گنگوہی کی جوتیوں کو اپنے سینہ سے لگا کر رات بھر کھڑے رہتے تھے اور تہجد کے وقت حضرت کو وضوء کے لئے پانی دیتے تھے۔

فائدہ

سبحان اللہ ایسے واقعات پہلے بزرگوں کے سنے جاتے تھے جن کو حضرت نے کر کے دکھلا دیا۔

(ذکر نمبر ۱۲)

میں نے بعض احباب سے سنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت قطب عالم گنگوہی سے عرض کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ آپ کو تسخیر کا عمل آتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں بھائی ہاں مجھے تسخیر کا عمل نہ آتا تو مولوی محمود حسن صاحب جیسے عالم میرے پاس کیوں آتے یہ تسخیر ہی تو ہے کہ مجھے کچھ بھی نہیں آتا اور ایسے ایسے عالم میرے معتقد ہیں۔

فائدہ

اس میں حضرت قطب عالم کی تواضع اور مولانا دیوبندی کے علم پر ناز وافتخار ظاہر ہے۔

(ذکر نمبر ۱۳) اجازت وخلافت

حضرت مولانا نے اول حضرت قاسم العلوم قدس سرہ سے سلوک حاصل کیا اور تکمیل حضرت قطب عالم گنگوہی کے آستانہ پر ہوئی اور حضرت نے آپ کو خلعت اجازت وخلافت عطا فرمایا اس لئے مولانا کی نسبت میں دونوں رنگ موجود تھے اس کی مجھے تحقیق

نہیں کہ آپ کو اجازت کس سنہ میں حاصل ہوئی۔

(ذکر نمبر ۱۴)

مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمود حسن صاحب تو علم کا کھٹلا ہیں (تذکرۃ الرشید)

(ذکر نمبر ۱۵) فنا فی الشیخ

حضرت سید مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ سے میں نے سنا فرماتے تھے کہ جب میں اور مولانا محمود حسن صاحب بہاولپور مناظرہ کے لئے جانے لگے تو ہم دونوں گنگوہ حاضر ہوئے۔ مولانا محمود حسن صاحب نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ مسئلہ امکان کذب میں، آپ اپنی رائے ہم کو بتلا دیں پھر مقدمات اور دلائل تو ہم اپنے آپ قائم کرلیں گے۔

فائدہ

حضرت مرشدی دامت برکاتہم فرماتے تھے کہ یہ مولانا کا کمال تھا ہم تو حضرت کی بات بھی دلیل کے بعد مانتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں صورتوں میں ایک حال ہے ایک مقام ہے۔

(ذکر نمبر ۱۶) صبر وشکر

جب حضرت مولانا مالٹا سے تشریف لائے تو اپنی اسیری کی تکلیف اور مصیبت کا مطلق تذکرہ نہیں فرمایا۔ جب بمبئی سے دیوبند تشریف لا رہے تھے تو سنا گیا ہے کہ میرٹھ کے اسٹیشن پر مضمون مبارکباد پیش کیا گیا۔ جس میں آپ کی تکالیف اسیری پر غم کا اظہار بھی تھا۔ مولانا نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا

سفینہ جبکہ کنارہ پہ آلگا غالب　　خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہئے

(ذکر نمبر ۱۷)

حضرت حکیم الامت فرماتے تھے کہ جب مالٹا سے مولانا تشریف لائے اور میں زیارت کے لئے گیا اس وقت حضرت نے یہ فرمایا کہ مجھ کو مالٹا میں ایسی یکسوئی رہتی تھی اور خلوت ایسی پسند تھی کہ بعض دفعہ یوں جی چاہتا تھا کہ یہ رفقاء بھی میرے پاس نہ ہوتے تو اچھا تھا بس میں اکیلا ہی ہوتا۔

فائدہ

سبحان اللہ سچ ہے اہل اللہ کے لئے کوئی تکلیف تکلیف نہیں ان کے لئے مصائب میں بھی راحت ہے۔

درد از یاراست و درماں نیز ہم　　دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(ذکر نمبر ۱۸)

حضرتؒ نے سنت یوسف علیہ السلام پر حالت اسیری میں پوری طرح عمل کیا کہ زندان میں بھی دین کی خدمت ادا کرتے تھے۔ مالٹا میں بہت لوگ حضرت سے بیعت ہوئے اور آپ نے اسی حالت میں ترجمہ قرآن شریف پورا کیا اور کچھ تراجم بخاری شریف کی شرح بھی تحریر فرمائے تھے جو افسوس ہے کہ مکمل نہ ہونے پائی۔

(ذکر نمبر ۱۹) تواضع

حضرت نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے (جو کہ حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے) یہ فرمایا کہ بھائی میں نے یہ قرآن کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو۔ اگر پسند ہو تو شائع کر دو ورنہ رہنے دیا جائے۔

فائدہ

اللہ اکبر اس تواضع کی بھی حد ہے۔

(ذکر نمبر ۲۰)

حضرتؒ میں چونکہ سوز و درد غایت درجہ تھا اس لئے کبھی کبھی فارسی اور اردو میں اشعار بھی نظم ہو جاتے تھے مولانا کا کلام بہت پاکیزہ عالمانہ مضامین سے بھرا ہوا اور درد و سوز میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا عربی کلام مولانا کا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

(ذکر نمبر ۲۱)

جب حضرت رمضان ۳۸ھ میں مالٹا سے دیو بند پہنچ گئے تو اس وقت خدام کو زیارت کی بیحد تمنا تھی چنانچہ صدہا آدمی دیو بند پہنچ گئے تھے۔ احقر بوجہ اس کے کہ رمضان میں روزے کے ضعف کی وجہ سے سفر دشوار ہوتا ہے فوراً نہ جاسکا مگر اس وقت شوق اور بیتابی کی حالت میں چند عربی اشعار موزوں ہو گئے تھے جس میں حضرت کی تشریف آوری پر اظہار مسرت و مبارکباد کا مضمون تھا جس کو میں نے قلمبند کر کے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں بھیج دیا تھا کہ حضرت کو سنا دیئے جائیں چنانچہ مولانا موصوف نے وہ اشعار سنا دیئے رمضان کے بعد جب میں خود حاضر خدمت ہوا تو احباب سے معلوم ہوا کہ ان اشعار کو سن کر حضرت نے یہ فرمایا کہ جو کچھ پیش آیا بحمد اللہ اس میں بھی خدا کی طرف سے نعمت اور راحت تھی اور احقر کے لئے دعائیہ کلمات فرمائے مطلع کے دو اشعار یہ تھے۔

زال الظلام و ضاء کل مکان — بطلوع بدر تم فی اللمعان

روح الحیاۃ اعید فی الابدان — بقدوم شیخ عارف ربانی

اب میں نے انہی اشعار کو مطلع بدل کر مرثیہ کی صورت میں کر دیا ہے جو آگے حاشیہ پر نقل ہوگا۔

(ذکر نمبر ۲۲)

جب میں حاضر خدمت ہوا رات کا وقت تھا اس وقت زیادہ بات چیت کا موقعہ نہ مل سکا، ہجوم زیادہ تھا۔ صبح کو اچھی طرح زیارت ہوئی اور میں نے اپنی کتاب الدر

المنضود ترجمۃ بحر المورود حصہ اول حضرت کی خدمت میں پیش کی جس کو حضرت نے بہت خوشی سے قبول کیا اور اسی وقت کچھ کہیں کہیں سے ورق لوٹ کر دیکھا اور دعائیہ کلمات سے سرفراز فرمایا۔ **فالحمدُ للّٰہ علی ذلک**

(ذکر نمبر ۲۳)

حضرت مولانا کو مالٹا سے تشریف لانے کے بعد افسوس یہ ہے کہ راحت کا موقعہ نہ ملا اس لئے بہت جلد بوجہ ضعف کے بیمار ہو گئے اور علالت دن بدن بڑھتی گئی ایک مرتبہ دیو بند ہی میں بہت زیادہ نازک حالت ہو گئی تھی مگر پھر افاقہ ہو گیا اس وقت آپ کو مدرسہ اور اپنی حدیث پڑھانے کی جگہ بہت یاد آئی اور دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا چنانچہ پالکی میں لٹا کر آپ کو اس جگہ لایا گیا جہاں آپ درس دیا کرتے تھے پالکی کو علماء کی جماعت نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا وہ بھی عجیب سماں ہوگا۔ (یہ واقعہ اخبار ہمدم سے معلوم ہوا) پھر دوبارہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی اور علالت بڑھتی گئی تو آپ کو معالجہ کے لئے دہلی لایا گیا۔ ہوش و حواس آپ کے اخیر تک درست تھے اور ذکر اللہ میں اکثر مشغول رہتے تھے (یہ مولانا حسین احمد صاحب کا بیان ہے جو اخبار الخلیل میں طبع ہوا ہے) یہاں تک کہ ۱۸ ربیع الاول ۳۹ھ کو صبح سے پہلے یا اس کے بعد آپ کا وصال ہو گیا ماہ و تاریخ وصال اردو میں بھی ہے، "ہائے آج چراغ دینی بجھ گیا" اور نظم فارسی میں یہ ہے۔

گفت ہاتف بہر تاریخش کہ دو ہائے ۔ مرشد محمود آواں شد شہید

اور نثر عربی میں یہ ہے **المحمود عاش حمیدا ومیت شهیدا**

(ذکر نمبر ۲۴)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ دستخط وغیرہ میں اکثر بندہ محمود لکھا کرتے تھے تصنع سے غایت درجہ نفرت تھی مہر میں نے حضرت کی نہیں دیکھی لیکن سنا ہے کہ مہر بھی تھی جس پر یہ سجع کندہ تھا۔ الٰہی عاقبت محمود گرداں (آمین)

(ذکر نمبر ۲۵)

دنیا دار الفنا ہے یہاں سے سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے اس لئے بجز صبر و شکر کے کوئی چارہ نہیں۔ ہم کو ایسے موقع پر سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو یاد کر کے دل کو تسلی دینا چاہیے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِمن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ o جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر بھی ہم کو شکر کی تعلیم ہے تو بندگان دین کی وفات پر بدرجہ اولی۔ سچ ہے۔

الا انما کانت وفاة محمد دليلا على ان ليس لله غالب

بیشک سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس کی بڑی دلیل ہے کہ خدا کی مشیت میں کسی کو کچھ دخل نہیں حضرت عباس بن عبدالمطلب کی وفات کے موقعہ پر ایک بدوی نے عبداللہ بن عباسؓ کو ان الفاظ سے تسلی دی تھی۔

اصبر تكن بك صابرين فانما صبر الرعية بعد صبر الرأس

خير من العباس اجرك بعده والله خير منك للعباس

(ترجمہ) آپ صبر کیجئے تا کہ ہم بھی آپ کی وجہ سے صابر ہو جاویں کیونکہ رعیت کا صبر سردار کے صبر کے تابع ہے۔ آپ کے لئے وہ اجر حضرت عباس سے بہتر ہے جو ان کے بعد (صبر کرنے سے) آپ کو ملا اور عباس کے لیے خدا تعالیٰ آپ سے بہتر ہیں۔ واقعی خوب تسلی دی۔

میں بھی حضرت کے تمام اعزہ و اقارب اور خدام عالی مقام کی خدمت میں یہی مضمون عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرماوے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل اللہ کی وفات کو وفات نہ کہنا چاہیے۔ وہ اپنے بیشمار کارنامے دنیا کے سامنے چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ رکھتے ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد لعشق　　ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

پس ہم کواس کی کوشش کرنی چاہیے کہ حضرت قدس سرہ ہمارے سامنے اتقا اور زہد اور محبت الٰہی و اتباع سنت و اخلاق حمیدہ کا جو نمونہ چھوڑ گئے ہیں اس پر کوشش کے ساتھ عمل کریں اوران کی محبت کو اپنے دلوں میں جگہ دیں تا کہ بموجب حدیث المرء مع من احب کے آخرت میں حضرت کے ساتھ محشور ہوں اوران کے قرب سے سرفراز ہوں آمین ثم آمین۔ اب میں اس تذکرہ کو چند اشعار عربیہ پر ختم کرتا ہوں۔

حزن بقلبی ام لظی نیران　　قد احرقت حتی کأنی الفانی

کیف القرارو قد تبدلت السماء　　لافول بدر تم فی اللمعان

کیف الحیاۃ وقد تفتت مهجتی　　برحیل شیخ عارف ربّانی

مولائی محمود الا نام المقتدی　　قطب الهدایة منبع الفیضان

بحر الندی شمس الولایة والتقے　　غوث البریة کامل العرفان

بحریروی الطالبین بفیضه　　شمس تزیل حنادس الاحزان

او مزنةٌ جادت بامطار الهدے　　تشفی الغلیل بضیفها الهتان

رب المحامد و المعارف والعلے　　وفضائل جلت عن التبیان

کنز العلوم محدث و مفسر　　متکلم و مترجم القرآن

متبحر فی الفقه والمعقول فی　　علم الحدیث هو العدیم الثانی

فرد الزمان و بیهقی اوانه　　ومماثل بن سعید ن القطان

واحسر تامن للحدیث واهله　　من بعده فی ارض هندستانی

اسدا لا له محبه و حبیبه　　حامی الشریعة صابر حقانی

قاسی الشدائد والمصائب لم یخف　　فی اللّه لومة لائم بمکان

فرشت لوطئة قلوب اولی النهی　　وجماله قرت به العینان

وکلامه للطالبین کأنه　　ماء الحیاۃ اتے الی الظمان

محمود لاتبعد فذکرل خالدٌ　　والذکر للانسان عمر ثان

للّٰــه انــت ایــا امــام اولــی الـتـقـی	للّٰــه درک مــن عظیم الشــان
لازلــت مبتهــج الـفـؤادولـم تــزل	فــی عیشة مــرضیة بــجـنــان
لازلـت فــی کـنف الـمهیمن فـائـزا	بـنـعیـم رؤیتـه مـع الـرضوان
وانـظـر الـی الـظـفـر الـکـئیب فـانـه	یـرجو جوارک یا رجاء العانی
ثـم الـصـلـوة عـلـی الـنبـی محمد	وعـلـی صـحـابته اولی الاتقان

ترجمہ:-''(۱) یہ میرے دل میں رنج وغم ہے یا ایسی آگ کا شعلہ ہے جس نے جلا پھونک کر مجھے مردہ اور بے جان بنا دیا ہے۔(۲) اب کیونکہ قرار آئے کہ بدر کامل کے غائب ہو جانے سے آسمان ہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے(۳) اب زندگی کیسی جبکہ شیخ عارف ربانی کی رحلت سے دل ہی پارہ پارہ ہو چکا۔(۴) وہ کون! میرے آقا مخلوق کے محمود۔ مقتدے ہدایت کے قطب فیوض کے سرچشمہ (۵) سخاوت کے دریا ولایت اور اتقا کے آفتاب مخلوق کے فریاد رس عرفان میں کامل (۶) ایسا دریا جس سے طالبین خوب سیراب ہوتے تھے ایسا آفتاب جو رنج وغم کی تاریکیوں کو دور کرتا تھا۔(۷) بلکہ ایسا بادل جو ہدایت کی بارشیں برساتا تھا اور اپنے بہتے ہوئے سیلاب سے سب کی پیاس بجھاتا تھا۔(۸) محامد وعلوم اور بلندی والے تھے اور اُن میں ایسے فضائل تھے کہ بیان سے باہر ہیں۔(۹) علوم کا خزانہ تھے محدث ومفسر تھے متکلم مناظر اور قرآن کے مترجم تھے۔(۱۰) فقہ ومعقول میں متبحر تھے اور علم وحدیث میں تو یکتا و بے نظیر ہی تھے(۱۱) خلاصہ یہ کہ اپنے زمانہ میں فرد اور اپنے وقت کے بیہقی اور سعید بن قطان محدث کے مشابہ تھے۔(۱۲) واحسرتا اُن کے بعد ہندوستان میں حدیث اور اہل حدیث کے لیے کون ہو گا(۱۳) وہ خدا کے شیر اور اُس کے عاشق اور اُس کے محبوب تھے۔

شریعت کے حامی اور سچے صابر تھے۔ (۱۴) شدائد ومصائب بہت جھیلیں مگر کسی موقع پر خدا کی راہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کی (۱۵) اُن کی شریعت آوری کے لیے عقلا کے دل فرش راہ بن گئے تھے اور ان کے جمال سے ہر ایک کی دونوں آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ (۱۶) اور عاشقوں کے سامنے ان کی باتیں ایسی تھیں کہ گویا پیاسے کے پاس آبحیات پہنچ گیا۔ (۱۷) مولائی محمود آپ دور نہ جایئے کیونکہ آپ کا ذکر یہاں ہمیشہ رہے گا اور انسان کے لیے ذکر خیر بھی دوسری عمر ہے۔ (۱۸) اے متقیوں کے امام بس خدا کے سپرد۔ اے عظیم الشان ذات تیری خوبی خدا ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ (۱۹) خدا کرے تم ہمیشہ خوش دل رہو اور جنتوں میں راحت کی زندگی بسر کرتے رہو۔ (۲۰) ہمیشہ خدا کے دامن رحمت میں اس کے دیدار اور رضا کی نعمت سے کامیاب رہو۔ (۲۱) اور ذرا اس پریشان دل ظفر کی طرف ایک نگاہ بھر کر دیکھ لیجیو کہ اے مصیبت والوں کی امید گاہ وہ بھی آپ کی ہمسائیگی کا امیدوار ہے۔ (۲۳) پھر صلوٰۃ وسلام نازل ہو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے جان نثاروں پر جو کہ بڑی پختگی والے تھے۔''

ھذا وانا المفتقر الی رحمة ربی الصّمد. عبده المذنب ظفر احمد عفا اللّٰه عنه بمنه و کرمه عزة رجب المرجب ۳۹ھ

از ترجیح الراجح بابت ۳۹ھ فصل بست وصوم

تنقید در بعض حکایات مندرجہ ذکر محمود

خلاصہ سوال

پرچہ النور بابت ماہ جمادی الثانی ۳۹ھ کو جو ماہواری شائع ہوتا ہے اس میں بلالحاظ وتصحیح جو جناب نے ایک واقعہ مرادآباد نمبر ۱۷ کی کہ جو مولانا محمود حسن صاحب مرحوم ومغفور کی سوانح عمری میں تحریر فرمایا ہے اور اس میں بعض بزرگوں کو ایسے تلفظ سے یاد فرمایا کہ جو آپ کی شان سے نہایت بعید ہے۔ جو واقعہ تحریر فرمایا ہے اس جلسہ میں جناب شریک نہ تھے اور حضرات اس وقت موجود تھے اب بھی بعض ثقات اس میں سے موجود ہیں۔ جناب مولوی عبدالعلی صاحب مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی۔ جناب مولوی دائم علی صاحب مرادآباد۔ جناب مولوی ظہور الحسن صاحب رامپور۔ جناب مولوی منور علی صاحب محدث رامپور وغیرہم ان حضرات سے اس کی تحقیق بخوبی ہوسکتی ہے۔ مناسب ہے کہ تحقیق کر کے انصاف کام میں لا کر تصحیح فرمائی جاوے۔

الجواب

راوی کے ثقہ ہونے میں دقت روایت کے مجھ کو شبہ نہیں ہوا نقل کی بناء تو یہ ہوئی اور باوجود اس کے یہ احتیاط کی گئی کہ صاحب قصہ کی تعبیر میں ابہام رکھا۔ اب عبارت سوال پر مطلع ہو کر میں اس مضمون وعنوان دونوں سے رجوع کرتا ہوں۔ جن حضرات کو معنون و عنوان کی تحقیق فرمانا ہو بزرگان مذکورین فی السوال سے تحقیق فرمالیں اور جن صاحبان ان کو اس عنوان سے اس وجہ سے کہ ان کے اذہان میں وہ ابہام نہیں ہے۔ گرانی ہوئی ہو للہ معاف فرمادیں۔ وانی استغفر اللّٰہ تعالیٰ منہما ۔اشرف علی ۲۳ ذیقعدہ ۳۹ھ

تصحیح واقعہ مندرجہ پرچہ النور بابت جمادی الاخری ۳۹ھ

از سید حامد شاہ صاحب محلّہ زینہ عنایت خان ریاست رامپور

جو حضرات اس جلسہ میں موجود تھے ان کی تحریریں ارسال خدمت ہیں، یہی واقعہ اب معتبر ہے۔ اھ۔ اس کے بعد سید صاحب نے تحریرات ذیل نقل فرمائیں۔

بسم اللّٰہِ الرحمٰنِ الرَّحیُم o

نحمده و نصلی علےٰ رسوله الکریم

امابعد مراد آباد کا جلسہ امتحان اور انعام کا تھا اس میں حضرت میاں مولانا محمد شاہ صاحب محدث رام پوری مرحوم تشریف لائے تھے اور مولانا محمود حسن صاحب مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت مراد آباد کے لوگوں کی رائے اور اصرار سے مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریر کے واسطے کھڑے ہوئے۔ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (فقیہ واحد اشد علے الشیطان من الف عابد) یہ حدیث پڑھی اشد کا ترجمہ بھاری اور گراں کے ساتھ فرمایا حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ قریب تشریف رکھتے تھے انہوں نے بیٹھے ہوئے اشد کا ترجمہ اضر کے ساتھ فرمایا۔ اس وقت اہل جلسہ کو ناگوار ہوا۔ پھر مغرب کی نماز ہوئی مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میاں صاحب سے یہ کہا کہ آپ نے جو یہ فرمایا کہ اشد کے معنے اضر کے ہیں۔ یہاں اضر کے معنے لے لیے حدیث وحی میں تو اشد کے معنے اضر کے نہیں ہونگے وہاں کیا فرمایئے گا۔ مجھ کو اس کے بعد یاد نہیں ہے لیکن میرے خیال میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراضاً نہیں فرمایا تھا اور نہ میری رائے میں ان کو تخطبہ کرنا مقصود تھا۔

دستخط جناب مولوی عبدالعلی صاحب مدرس مدرسہ عبدالرب دھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ہماری یاد میں یہ قصہ اس طرح واقع ہوا تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب مرحوم نے اثناء وعظ میں حدیث (فقیہ واحد اشد علے الشیطان من الف عابد) پڑھ کر اس طرح ترجمہ بیان فرمایا کہ ایک عالم کا وجود شیطان پر اس کے ذہن میں ہزار عابد سے بھاری ہے۔ جلسہ میں علماء وطلبہ موجود تھے۔ چند محدث بھی تھے، مثل مولانا جان علی صاحب مرحوم ومولانا محمد قاسم علی صاحب مرحوم مراد آبادی ومولانا سید محمد شاہ صاحب مرحوم محدث رامپوری جب اس جملہ کی چند مرتبہ تکرار کی نوبت آئی تو مولانا محدث رام پوری مغفور نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے جو مولانا واعظ صاحب مرحوم سے قریب تھے مخاطب ہوکر یہ کہا کہ مولانا حضرت نبی علیہ الصلوۃ والسلام امور واقعیہ کی خبر دیتے ہیں نہ کسی کے ذہن کی اور یہاں اشد بمعنی اضر کے انسب ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کلمہ محدث صاحب موصوف نے نہیں کہا تھا۔ اس پر مولانا واعظ صاحب نے تو کوئی کلمہ ایجابی فرما کر چند جملوں کے بعد اپنا وعظ ختم فرمایا چونکہ وقت بھی ختم ہو چکا تھا اذان مغرب کا وقت قریب آ گیا تھا۔

لیکن بعد ختم وعظ کے مولانا واعظ صاحب کے حوارین جو غالباً ان کے طلبہ ہوں گے کچھ شور وغل مچانے لگے مولانا محدث صاحب کے ہمراہی مستعد ہوئے اور جواب دینے لگے اسی اثناء میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ نماز مغرب کے بعد مولانا واعظ صاحب مولانا محدث صاحب کے پاس تشریف لائے اور شور وغل والوں کی طرف مخاطب ہوکر یہ کہا کہ مولانا نے جو کچھ مجھ سے فرمایا تھا مجھ کو تسلیم آپ لوگ کیوں شور وغل کرتے ہیں۔ میں خود مولانا سے استفادہ کرتا ہوں یہ کہہ کر مولانا محدث صاحب کے پاس ادب سے بیٹھ کر یہ فرمانے لگے کہ حضرت میں استفادۃً یہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے جو یہاں اشد کا ترجمہ اثقل۔ بھاری۔ سے کیا یہ اس حدیث کے موافق کیا تھا جو صحیح بخاری شریف کی اول حدیث وحی میں واحیاناً یاتینی مثل سلسلہ الجرس وھو اشد علی. واقع ہے تو آیا یہ معنی یعنی اثقل بھاری کے یہاں بھی صحیح ہو سکتے ہیں یا نہیں مولانا

محدث صاحب نے فرمایا میری یہ غرض تھی کہ یہاں اضر کے معنے مناسب اور واضح ہیں۔ نیز حکایت و اخبار نفس الامر سے ہے نہ ذہن شیطان سے مولانا واعظ صاحب نے فرمایا کہ جو کچھ حضرت فرماتے ہیں۔ یہ تو مجھ کو تسلیم ہے۔ صرف اس قدر گزارش ہے کہ اشد کے معنی اثقل کے بھی آئے ہیں۔ جیسے حدیث وحی مذکور میں۔

مولانا محدث صاحب نے فرمایا میری غرض یہ نہیں کہ لفظ اشد کے معنے کہیں اثقل کے نہیں آتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ مانحن فیہ میں معنے اضر کے واضح اور انسب ہیں مع حکایت نفس الامری کے مولانا واعظ صاحب نے پھر اس کا ایجاب فرما کر سلسلہ گفتگو کا ختم کر دیا اور مجمع منتشر ہو گیا مہمانان ہر دو فریق مکان ضیافت پر کھانا کھانے کی غرض سے تشریف لے گئے۔

دستخط جناب مولوی صاحب/محمد ظہور الحسین الفاروقی النقشبندی المجددی الرامفوری

دستخط جناب مولوی صاحب/محمد منور العلی غفرلہ رامپوری

اتم التصحیح

شعروادب

﴿قسمة الشعر و الادب﴾

بقلم حضرة مولانا ظفر احمد العثمانی رئیس جمعیة علماء الاسلام پاکستان، ڈھاکہ

رثاء حکیم الامتؒ

وقلت ارثی سیدی حکیم الامة مجدد الملة مفسر العصر فقیه الدهر مولانا محمد اشرف علی التهانوی رحمة اللّٰه علیه توفی الی رحمة اللّٰه لیلة الثلثاء لسادس عشر من رجب ۱۳۶۲ھ (و تاریخ وفات "اشرف علی نور اللّٰه مرقدهٗ") ظفر احمد

بقلبیَ هَمٌّ لایکاد یزولُ — ثقیلٌ وهمُّ العاشقین ثقیلُ

یُسهِّرنی لیلا طویلا ولم اکن — لاسهر الآن یبینَ خلیلُ

الی اللّٰه اشکوما اُلاقی من النویٰ — ولو ان قلبی للجبال حَمولُ

کأنّ بعینی ما بقلبی من الجویٰ — فمن طرفها عن الحَمیم تسیلُ

وداعٍ دعا اذ قام باللیل ناعیًا — فطار بقلبی القول حین یقولُ

فقلتُ لهٗ کُن غیر اشرفَ ناعیًا — فدته الوریٰ لوللفداء قبولُ

فبکی و نادیٰ ان اشرف قدثوی — فضجّت قلوبٌ بالبکا وعقولُ

نعی خیر اهل الارض نفسا و محتدا — واشرفَ حُرٍّ یحتویه قبیلُ

مجدّد هذا القرن حقا حکیمُه — فقیهٌ لدیهٖ للفروع اصولُ

مفسّرِ هذا العصر من غیر ریبة — له فی المعالی رأیة و رعیلُ

تقی نقی حجة ذواصابة — من الرأی اذرأی الانام افولُ

لـــهٗ كتـــب فـي كـل عـلـم جـمـيـلـة | بهـا يُشتـفـىٰ لـلـطـالبين غليلُ
تـفـطّــر قـلـبـي اذ رأيتك راحـلا | وكـادت لهـاشُمّ الجبال تزولُ
فـواحسـر تـامـا اقبحَ البينَ بيننـا | وافـظـعَـه والـنـائبـات تهـولُ
ويـا قـاتـل اللّٰـه الـنـوى مـا امـرَّهٗ | واصـرعـه لـلـمـراحين يصولُ
فيـــاليـــتَ ايـــامَ الـفـراق رواحلاً | ويـاليـت ايـامَ الوصـال تؤولُ
فـمـن لـعـلـوم قـد كشفـتَ لِثامهـا؟ | ولم يقتبسها عن سواك سَؤولُ
ومـن لـمـعـانٍ قـد نطقـتَ بسـرّهـا؟ | وزلـت بـاقـدام العقول وُحولُ
ومَـن لـنـكـاتٍ قـد فـتـحت كنوزها؟ | لهـا غُـرربيـن الـورٰى وحجولُ
ومَـن لـعُـضـال اعـجز الـنـاس طبّـه؟ | وانت لكشف المعُضَلات كفيلُ
ومـن لبيـان فـي الـقـلـوب مـؤثـر؟ | وبـعـدك قول القائلين فضولُ
يـبكيك اهـل الـعـلـم والبّر والنهى | سـواء شبـابٌ منهـم وكهولُ
يـبـكيك اهـل الارض فـي كل ليلة | وفـــي كـــل يـوم رنّة وعَـويـلُ
فـقـد حـاق بـالـنـاس البلا كل جانب | وكـنـتَ طبيبًا والـزمـان عليلُ
وكـنـتَ مـلاذا لـلانـام غيـاثهـم | ووجهك سيف للهموم صقيلُ
تـذكـرت ايـامـا مـضـت في حلاوة | اذا انـت حـي والـزمـان جميلُ
مَضَت فمضى ماكان من طيب عيشة | بـمـجلس خير مالذاك عديلُ
اقـومُ ومـا لـي غيـر ذكـراك ملهَجُ | وارقـد والافـكـار فيك تجولُ
بـنـفسِـيَ مـن لـم يـنسَنى عند موتـه | دعـانـي باسمي واللسان كليلُ
وقـد كـان فـي مـاقبل يومين خطّ لي | كتـابـالـه فـي المرُجفين صليلُ
بشـارةُ شيـخ عـارف عـنـد مـوتـه | لــنـــعـمـة ربـــي اٰية و دليـلُ

جـزاهُ الـلـه الـعـرف خيـرا بـمُـدّهٗ
بـخيـر عـظـيـم والـجـزاء جـزيُـلُ

جريح الفؤاد ظفر احمد العثمانی عفا اللّٰه عنه ۱۵ شعبان ۱۳۶۲ھ بدكة المحمية

نداء الحزين

هـذه قـصيدةٌ ارسلها الينا حضرة الفاضل العلامة مولانا ظفر احمد العثمانی الانصاری. اما تعریف هذه الاشعار فنذکرہٗ بکلامهٖ ولفظهٖ کما قال. (التحریر)

رثـاء حبیبتـی و روح حیـاتی زوجی ام عمر عارفه خاتون الملقبة بـمشتـری تـوفیـت الـی رحمة اللّٰه عشیة یوم الخمیس عند اذان المغرب لـلثـالـث عشـر من المحرم ۱۳۷۰ ھ والسـادس و الـعشـرین من اکتوبر ۱۹۵۰ء فـی ارض دکـه (ڈھـاکـه) و دفـنـت فـی مـقـبـرة النواب عند قبر الـمـرحـوم مـولانا الحافظ المحدث محمد براءت رحمة اللّٰه تعالیٰ علیه وعـلیهـا وعـلـے مـن فے جوار هما من المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات. (ظفر احمد العثمانی)

اشـکـوالـی الـلّٰـه حـزنـا هاج احزنا — ولوعةً اضرمت فی القلب نیرانا

یـا فـرحة اقبـلـت حتـی اذا کـملت — غـابت و بدّلت الافراح احزانا

کـانـت وقـلبـی عن الافکار مشتغل — بـحسـن طلعتها البیضاء فرحانا

راحـت فـراح بهـا مـا کـان من فرح — فی الدهر والخیر عنا بعد ها بانا

کـانـت وکـنـا وکان الشمل مجتمعا — ثـم افتـرقنا کأنَّ الجمع ما کانا

ضـاءت ببـهـجتهـا ارض بهـا دفنت — اِنَّ الـجـمیلَ جمیل حیثما کانا

قد کنت فی سکرة من حُسن طلعتها — ولا أری مثـلها فی الناس انسانا

فـی غـفـلة من صروف الدهر فاجئة — حتـی فُـجِـعـتُ بما لا مثلُه الآنا

یـــاربة الـحُـسـن ان الـدار مـوحشة — مذغبتِ عنها وقد اُدرجتِ اکفانا

یـاربة الـحُـسـن مـاهـذا الـجفاء وقد — کـنـا جـمـعیا کرُوح حَلَّ ابدانا

یـاامُـنیة الـقـلـب ان الروح فی کمد — والـقـلـب فی قلق نوما ویقظانا

یـا راحة الروح مالی عنکِ مصطبر — عودی فعودی الی الاحباب احیانا

مـا کنتُ اخشاک یا روحی ویا املی — ان تترکی خلکِ المشتاق حیرانا

مـا کان ذَنْبی سوی حبیک یاسکنی — وانني کنت من رؤیاکِ جذلانا

فهـل جـزائـی بـلاء قـد بـلیتُ بـه — تـرکتنی مفردا فی الدهر وَلْهانا

غـاد رتـنـی دفـنـا حیرانِ مندهشا — مادمت حیا علی مافات حسرانا

بـالـلّـه عـودی مـریضـا لا دواء لـهُ — الا لـقاء کِ غصنَ البان مَیْسانا

یـا ام عَـمـرٍ و جـزاکِ الـلّـه مکرمةً — ردّی عـلـی فـؤادی أیـنـما کانا

نلتِ الشهادة فی الشهر الحرام وقد — اثنی علیک الوری سرا وا علانا

وافیـتِ مـنـزلة مـانـا لهـا احـد — مـن الـنسـاء ذُرافات و وجدانا

قـدکـنـتِ عـابـدة لـلّـه زاهـدة — مُـحِبة لـرسـول الـلّـه ایمـانـا

تلّاءَ ـةٍ کتـاب الـلّـه نـاطقةً — بـالـحق راحجَة الآراء میزانـا

والـلّـهُ اولاک مـا لا اعین نظـرت — فی جنة الخلد اکراما و احسانا

ونـور الـلّـه قبـر اقـد حـلـلَـتِ بـه — فعاد من حُسنک الوهّاج بُستانا

یـالیتهـا بـقیـت او لبیتهـا رجعـت — یـومـاً فـکـل عـزیـز بعدها هانا

زیـنُ الـنَسـاء واعـلا هـن مـنـزلة — فی الحُسن کانت لصنع اللّٰه برهانا

فـصیـحة کـنظـام الـدر مـنـطـقهـا — بـلیغةٌ افـحـمـت ضدا واقرانا

بسّـامة تـضـحک الثکـلی ولؤلؤة — نـفیسـه فـردة من آل عثمـانـا

مـنـی الســلام عـلیهـاد ائـمـا ابـدا

ورحـمة الـلّـه والـغـفـران رضـوانـا

طریق الاستقلال

فلا بدلاستقلال الاسلام، من زوال هذه الاوهام، ومن انتشار المعارف التی لایجتمع مع الذلّ فی مکان، ولاتبرح دون تلک الغایة مصاعب وقحم. و مصائب و غُمّم، ولیال مظلمة طوال، ومعارک تشیب لها ذوائب الاطفال. (شکیب ارسلان)

رثاء آخر لامّ عُمَر (رحمها اللّٰه تعالیٰ)

هذه ثانیة القصیدتین اللتین ارسلهما الینا العلامة مولانا ظفر احمد العثمانی من دکة فی رثاء زوجتهٖ نشرنا الاولی فی العدد القادم وهذه الاخریٰ نتشرف بنشرها الآن (المدیر)

مـالـلـضیـاء تبـدلـت بظـلام ... مـالـلـحیـاة تـحولت لِحمام
تَبًّا لِدُنیا لایدوم نعیمُها ... دار الغرور تم کالاحلام
شِیْبَت حَلاوةُ عیشها بمرارةٍ ... لم تصفُ لذتها من الآلام
قدکنت محسودَ الانام بِعیشةٍ ... مرضیة فی ظلِ کل همام
ثم ابتلیتُ بفقدهم متتابعا ... حتی فقدتُ حبیبتی فی العام
وافرقتاه فکیف عیشی بعدها ... وَهْیَ الحیاةُ ترحلت بسلام
کانت فکان بها الزمان منوّرا ... ومضت فغاب بها ضیا الایّام
شمس النهار بحسنها و ضیاءِ ها ... وجمالُها باللیل بدر تمام
زین العشیرة صدرُ کل مجالس ... قد شرفته تکرّما بکلام
واذا تبسّمت الحبیبةُ خِلتَها ... برقا تلألأ فی خلالِ غمام

حلو الشمائل بضة ريحانة ۔۔۔ غيداء نا عمة بحسن قوام

اللّٰهُ زينها بحُسن ملاحة ۔۔۔ وصباحة برقت كلون مُدام

كانت حياةً للنفوس وراحةً ۔۔۔ للمستهام ببارد دبسّام

كانت فريدة عصر ها فى خلقها ۔۔۔ قدكان كل امور ها بنظام

كانت مطيعة ربها و مُحِبّةً ۔۔۔ لرسوله، ظفرت بحسن ختام

تلاّءة لكتابه ذ كّارة ۔۔۔ صوّامة قوّامة بظلام

صبّارة شكارة بسّامةً ۔۔۔ امّارة بشرائع الاحكام

قوّالةً بالحق مدة عمرها ۔۔۔ لم تخش قط ملامة اللُوّام

فاقت بهمتها الرجال و غادرت ۔۔۔ همم النساء وراء ها بمقام

حجّت الى البيت الحرام بهمّة ۔۔۔ علياء فوق شوامخ الاعلام

حجت مع الوالدين تحمل واحدا ۔۔۔ فى حجرها بمزالق الاقدام

ركبت ومار كبت حمار اقبله ۔۔۔ واتت من التنعيم بالاحرام

اعجب بهمتها لا مر صلاتها ۔۔۔ حتى الممات بقعدة وقيام

قرأت كتاب اللّٰه ثم تعلمت ۔۔۔ معناه عند مجدد الاسلام

اشرف على المقتدى بفعاله ۔۔۔ قطب الهداية للحقيقة حامى

روّى الالٰه ضريحها واثابها ۔۔۔ حُسن الثواب غدًا بدار سلام

لاتبعدى فَلاَ نتِ وسط قلوبنا ۔۔۔ وعيونِنا فى يقظة ومنام

لاتبعدى فجميلُ ذكركِ خالدٌ ۔۔۔ والذكرُ للانسان عُمُرٌ نامى

ولأنت عارفة وانت حميدة ۔۔۔ فى عالم الارواح والاجسام

ثم السلام على النبى وآله

وعلى الحبيبة مُشترى بدوام

ظفر احمد العثمانى عفا اللّٰه عنه (من دكة ۱۰ ج ۱
۱۳۸۱ھ)

جہادِ فلسطین

(حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار)

ایک عربی قصیدہ جہادِ فلسطین بھیج رہا ہوں، یہ اسرائیل کی پہلی جنگ کے موقعہ پر لکھا تھا اور حفلۃ العلماء منعقدہ مئی ۴۸ء کے یومِ فلسطین میں پڑھا گیا تھا۔ مگر شائع نہیں کیا گیا۔ اب اس کی اشاعت کا وقت ہے۔

والدعاء ظفر احمد عثمانی

جاء البريد على الهوا بكتاب — من عندنا عمة القوام كعاب

نفسي ومابيدى فدا مصرية — من آل عثمانٍ ذوى الاحساب

يامنية العشاق كيف رثيت لى — من بعد طول تبتل وعتاب

قالت دعوتك كى تطهر ساحتى — من قوم دجال وجوه كلاب

من معشرباء وابلعنة ربهم — فى العالمين مُدنَّسى الاثواب

جاء وا اوقد ضربت عليهم ذلة — من عند ربّىَ سيد الارباب

جاء ت اميريكا لنصرة معشر — لُعنو الأخر هذه الاحقاب

من ينصر الملعون باء بلعنة — وتردُّ نصرته على الاعقاب

من يلعن اللّٰهُ فلن تجدواله — من ناصريا معشر الاحزاب

نرجو الالٰه ولا نخاف كتيبة — سارت الى اخواننا الاعراب

يكفى الالٰه المؤمنين قتالهم — ويثيبنا فى الاجر خير ثواب

جاء ت يهود لكى تغالب ربها — فليُغلبنَّ مُغالب الغَلاّب

يامعشر الاسلام قوما واضربوا — اعداء كم ضربا بغير حساب

ياقومنا قوموا اليهم وانزعوا — بيت الُمُقَدَّس من يد الخلاّب

طوبىٰ لقوم قُدموا فتقدموا — لنكال كل مكذب مرتاب

يامعشر العرب الكرام فديتكم — لايغلبنكم اليهود بباب

انتم جنود اللّٰه فى يوم الوغىٰ — انتم اُسوُد فى صريمة غاب

یاقوم لا تهنوا ولا تخشوهمُ ... وامحوا ظلامهمُ بضوء شهاب

بُعد او سُحقا للیهود ومن اتیٰ ... معُهم یرید غنائم الاسلاب

اللّٰه ینصر کم علی اعدائکم ... ویبیدهم حقا بشر عقاب

هذی فلسطین لنا من غیر ما ... ریب عطاء ملیکنا الوهاب

ثم الصلوٰة علی النبی محمد ... خیر الوریٰ والاٰل والاصحاب

جتنا علم قرآن میں ہے

جتنا علم قرآن میں ہے

اس سے زیادہ علم اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیا تھا

از حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث دارالعلوم اشرف آباد (ٹنڈو اللہ یار) سندھ

حضرت العلامہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی جزاء اللہ عنا وعن سائر المسلمین کا ایک مضمون ''منکرین حدیث اور خطیب بغدادی'' الصدیق کے اندر ۱۸ قسطوں میں شائع ہو کر پچھلے شمارہ میں مکمل ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر منکرین حدیث بہت سٹ پٹائے۔ ادارہ طلوع اسلام نے ہمیں لکھا تھا کہ الصدیق کے وہ پرچے جن میں طلوع اسلام کے مسلک پر تنقید کی گئی ہے۔ ہماری طرف ارسال کرو۔ مگر بغیر قیمت کے ہم کس لئے ارسال کرتے۔ جبکہ طلوع اسلام ہمارے پاس قیمتاً آتا رہا۔

اس مقالہ میں منکرین حدیث کے ایک اور مضمون کا جواب دیا گیا۔ جس کا عنوان ہے ''حدیث مثلہ کی حقیقت'' اس مضمون پر ادارہ طلوع اسلام کو بڑا ناز ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا نے تصریح فرمائی ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ حضرت مولانا موصوف، رحمہ اللہ منکرین حدیث کا خوب تعاقب فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت علامہ مدظلہ العالی کو جزائے خیر عطا فرماوے اور آپ کے مضامین اس فتنہ کی سرکوبی کیلئے ہمیشہ جاری رہیں۔ (ادارہ)

اب تک طلوع اسلام کے اس مضمون کا جواب تھا جو عنوان ''مقام حدیث امام اعظم ابوحنیفہ کی نظر میں'' کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اختصار کے ساتھ اس مضمون کا بھی جواب دینا چاہتا ہوں جو حدیث مثلہ معہ کی حقیقت کے عنوان سے اسی شمارہ میں درج کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس پر بھی ادارہ طلوع اسلام کو بڑا ناز ہے۔ مدیر نے جابجا حاشیہ میں

مضمون نگار کو بہت داد دی ہے۔ اس مضمون پر جو تعارفی نوٹ دیا اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ

''قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے دینا تھا وہ قرآن کے اندر محفوظ و مصئون ہے اور قرآن کے باہر خدا کی وحی کہیں نہیں ہے۔''

ادارہ طلوعِ اسلام کو قرآن کا یہ دعویٰ کہ قرآن کے باہر خدا کی وحی کہیں نہیں ہے قرآن سے ثابت کرنا چاہیے۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ہرگز قرآن سے اس مدعا کو ثابت نہیں کرسکتا۔ بہت سے بہت وہ کھینچ تان کر یہ کہے گا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ دین کی تمام باتیں کر دینے کے لئے اتارا گیا ہے۔ اور یہ کہ دین کی باتوں میں قرآن نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔''

اس میں اول تو دین کی قید بڑھانا محتاج دلیل ہے قرآن تو اپنے کو تبیانا لکل شیئ کہتا ہے کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے اور مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْئٍ ہم نے اس قرآن میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، تم نے اس میں دین کی قید کہاں سے لگائی؟ اگر کہا جائے کہ عقل سے لگائی۔ تو اپنی عقل کا حجت ہونا قرآن سے ثابت کر دو۔ ورنہ علامہ طنطاوی کا قول دلیل قرآن سے رد کرو جو قرآن میں سائنس اور طبیعات و فلکیات اور صنعت و حرفت اور طب وغیرہ کا بیان بھی ان ہی آیتوں سے ثابت کرتا ہے۔

اس سوال سے قطع نظر کر کے ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قرآن میں دین کی تمام باتوں کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ہر جاہل و عالم اس سے احکام معلوم کرسکتا ہے یا کچھ باتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں۔ کچھ بالا جمال، اور کچھ بطور اشارہ؟ اگر پہلی صورت ہے تو مشاہدہ کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ قرآن فہمی میں ہر عالم و جاہل برابر نہیں ہے۔ قرآن جاہلوں کے متعلق خود کہتا ہے۔

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اہل علم سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کیا اہل علم اور غیر اہل علم برابر ہو سکتے ہیں؟ اگر دوسری صورت ہے تو قرآن کے اشارات واجمال کو سمجھنے کا معیار کیا ہے؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اجمال واشارات کو واضح کیا ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بیان اور توضیح قرآن میں ہے یا قرآن سے باہر؟ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کا بیان قرآن میں نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں تو جو کچھ ہے خدا کا کلام ہے لامحالہ قرآن سے باہر ہی ہوگا۔

اسی کو ہم حدیث اور سنت کہتے ہیں اور اس سے قرآن کا ناقص ہونا ہرگز لازم نہیں آتا۔ ہاں یہ ضرور لازم آتا ہے کہ قرآن میں دین کی سب باتیں کھول کھول کر بیان نہیں کی گئیں کچھ احکام اجمال واشارہ کے طور پر بھی بیان کئے گئے۔ جن کی تشریح وتوضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے اگر ادارۂ طلوع اسلام کو اس حقیقت کے ماننے سے انکار ہے تو وہ بتلائے کہ قرآن میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْآنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنَاهُ ○ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ ہمارے ذمہ ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھ دینا تو جب ہم قرآن کو پڑھیں اس کی قرأت کا اتباع کرو پھر ہمارے ذمہ اس کا بیان کرنا بھی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ دو چیزوں کی الگ الگ ذمہ داری لے رہے ہیں۔ ایک قرآن کے جمع کی دوسری اس کے بیان وتوضیح کی۔ اگر قرآن کا بیان اس سے الگ نہیں تو دو چیزوں کا الگ الگ بیان کرنا فضول ہو جاتا ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ قرآن کا جمع اور محفوظ کر دینا ہمارے ذمہ ہے ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

پھر دوسری آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہوا ہے۔

﴿وَ اَنزَلنَا اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم﴾

''اور ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اس چیز کو واضح کر دیں۔ جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے''

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ دین کی سب باتوں کو تنہا قرآن سے سب لوگ نہیں سمجھ سکتے بلکہ بیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ضرورت ہے اور اس سے قرآن کا ناقص ہونا ہرگز لازم نہیں آتا کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کچھ بھی ہے۔ قرآن ہی کا بیان ہے اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔

اگر قرآن سے باہر خدا کی وحی کہیں نہیں ہے تو اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

﴿وَ اَنزَلَ اللّٰہُ عَلَیکَ الکِتَابَ وَالحِکمَةَ وَ عَلَّمَکَ مَالَم تَکُن تَعلَمُ وَ کَانَ فَضلُ اللّٰہِ عَلَیکَ عَظِیمًا﴾

''اللہ نے نازل کی آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھلائیں آپ کو وہ باتیں جو آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔''

یہاں دو چیزوں کا نزول اللہ کی طرف بتلا دیا گیا ہے۔ ایک کتاب دوسری حکمت، اگر حکمت قرآن ہی کا نام ہے تو اس کو الگ سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بس اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی۔ مگر قرآن کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ کتاب اللہ کے علاوہ دوسری چیز بھی آپ پر نازل کی گئی ہے۔ جس کا نام حکمت ہے۔ اسی کو ہم سنت کہتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حکمت کو قرآن سے الگ جا بجا بیان کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں فرمایا گیا ہے۔ رَبَّنَا وَابعَث فِیھِم رَسُولاً مِّنھُم یَتلُو عَلَیھِم اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الکِتَابَ وَالحِکمَةَ وَ یُزَکِّیھِم اِنَّکَ اَنتَ العَزِیزُ الحَکِیمُ (بقرہ) مسلمانوں پر اپنا انعام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کَمَا اَرسَلنَا فِیکُم رَسُولاً مِّنکُم یَتلُوا

عَلَيْكُمْ اٰيَاتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ) دوسری آیت میں فرماتے ہیں لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران) سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ان تمام آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند فرائض بتلائے گئے ہیں (۱) تلاوت آیات (۲) تزکیہ ظاہر و باطن (۳) تعلیم کتاب اللہ (۴) تعلیم حکمت (۵) ایسی باتوں کی تعلیم جو بغیر آپ کے بتلائے ہوئے کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اگر قرآن کے سوا کوئی وحی آپ پر نہیں آئی تو حکمت وغیرہ کی تعلیم کو الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ منکرین حدیث کے نزدیک تو رسول کا کام صرف تلاوت قرآن تھا کہ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنا دیں۔ تعلیم قرآن بھی رسول کا کام نہ تھا۔ ورنہ ہم کو بتلایا جائے کہ رسول نے تلاوت آیات کے علاوہ کتاب اللہ کی تعلیم کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ کہاں ہے؟ یقیناً وہ حدیث وسنت ہی میں ہے جب قرآن میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے تو یقیناً یہ تین چیزیں ہیں۔ پس یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف تلاوت آیات تھا اور آپ نے قرآن کی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ نہیں فرمایا نہ آپ نے حکمت کی تعلیم دی سراسر قرآن کے بیان کو جھٹلانا ہے۔ مجموعہ آیات سے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح قرآن نازل کیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری چیز حکمت بھی نازل کی ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور جس طرح آپ نے قرآن کی تلاوت کر کے تبلیغ وحی کا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے امت کو اس کے معانی ومطالب کی بھی تعلیم دی ہے اور ہر کلام سے

اصل مقصود معانی و مطالب ہی ہوتے ہیں تو اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ سے جس طرح الفاظ قرآن کی حفاظت کا وعدہ مفہوم ہو رہا ہے اس کے معانی و مطالب کی حفاظت کا بھی وعدہ مفہوم ہو رہا ہے۔ خصوصاً وہ معانی و مطالب جو رسول نے بامر الٰہی تعلیم کتاب کے سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں پس یہ کہنا غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کے الفاظ و نقوش کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن بھی محفوظ رہے گا۔ اور جن چیزوں پر اس کا سمجھنا موقوف ہے وہ بھی محفوظ رہیں گی۔ جن میں سب سے پہلے وہ حکمت داخل ہے جو رسول پر قرآن کی طرح نازل کی گئی اور رسول کی وہ تعلیمات بھی داخل ہیں جو قرآن و حکمت کے سلسلہ میں آپ نے امت کو دی ہیں۔

تمنا عمادی صاحب نے یہ تو تسلیم کرلیا ہے کہ اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ o سے صرف اوراق یا حروف و نقوش کی حفاظت مراد نہیں۔ بلکہ اصل دین کی حفاظت کا وعدہ مقصود ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی حفاظت کے معنی یہی ہیں کہ دین ہر طرح محفوظ ہے۔ اسی لئے دین کے تمام احکام سارے اوامر نواہی اسی کتاب میں محصور رکھے گئے اور اسی کو تبیانا لکل شیئ فرمایا گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سب مقدمات مسلم ہیں مگر اسی کے ساتھ آپ کو آیت وانزل اللّٰہ علیک الکتاب والحکمة سے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قرآن کے علاوہ آپ پر حکمت بھی نازل کی گئی تھی اسی کی مدد سے قرآن کا تبیانا لکل شیئ ہونا رسول پر واضح ہوا۔

قرآن کے بعض اشارات کو رسول نے بھی دوسری وحی سے سمجھا ہے۔ جس کا نام حکمت ہے تنہا قرآن سے نہیں سمجھا چنانچہ احادیث میں بہت مسائل ایسے موجود ہیں۔ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا اور آپ نے جواب نہیں دیا وحی کا انتظار فرمایا وحی کے بعد جو جواب دیا وہ قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں ہے۔ اشارۃً ہوگا مگر وہ اشارہ رسول کو بھی مستقل وحی سے معلوم ہوا۔ جیسے ایک شخص نے حالت احرام میں عمرہ میں

خوشبو لگانے اور جبہ پہننے کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے وحی کے بعد جواب دیا کہ خوشبو کو دھوؤ جبہ الگ کرو قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں۔ جب رسول کے حق میں بھی قرآن کا تبیانا لکل شیئ ہونا بغیر نزول حکمت کے واضح نہ تھا تو امت کے حق میں بغیر ان تعلیمات کے جو کتاب وحکمت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دی ہیں۔ کس طرح اس کا تبیانا لکل شیئ ہونا واضح ہوسکتا ہے؟ اور جب ان تعلیمات کے علم پر قرآن کا تبیانا لکل شیئ ہونا موقوف ہے۔ تو دین اس وقت تک محفوظ نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ تعلیمات رسول محفوظ نہ ہوں۔ ورنہ تمنا عمادی صاحب ہم کو بتلائیں کہ نکاح کے لئے کم از کم دو گواہوں کا ہونا شرط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو نکاح اور زنا میں فرق بتلائیں؟ اگر شرط ہے تو قرآن سے اس شرط کو ثابت کریں؟ نیز گدھے، کتے، بندر، خچر کی حرمت کا قرآن سے ثبوت دیں۔ آپ نے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ سے جو ان کی حرمت ثابت کی ہے محض لغو ہے کیونکہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ بَهِيْمَةُ الانعام (اونٹ گائے بکری) حلال نہیں۔ یہ کہاں معلوم ہوا کہ ان کے ماسوا سب حرام ہیں۔ یہ تو مفہوم مخالف سے استدلال ہوا اور مفہوم مخالف کا حجت ہونا مسلم نہیں اس میں بہت اختلاف ہے اگر وہ مفہوم مخالف کو حجت سمجھتے ہیں تو اس کا ثبوت بھی قرآن سے پیش کریں۔ پھر مفہوم مخالف کو حجت مان بھی لیا جائے تو اس آیت سے یہ مفہوم ہوگا کہ مرغی، بطخ، مرغابی، مور، سرخاب سب حرام ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بہیمۃ الانعام سے خارج ہیں اور قرآن نے صرف بہیمۃ الانعام کو حلال کیا ہے۔ اس کے سوا سب درندے پرندے چرندے حرام ہیں۔''

اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ قرآن بغیر تعلیمات رسول کی حفاظت کے تبیانا لکل شیئ نہیں ہے۔ اور تعلیمات رسول قرآن ہی کی تفسیر و بیان ہیں۔ اس کے بعد تمنا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ وحی جس کا تعلق احکام شریعت دینی اوامر و نواہی اور حلال وحرام

سے یا تبشیر و تنذیر سے ہے (انذار کہنا چاہیے) وہ صرف قرآن مبین اور اس کی آیتیں ہیں۔ اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں بھی لوگوں کو دینی باتیں سمجھاتے ہوں گے تو قرآن ہی کے مضامین بیان فرماتے ہوں گے۔ شکر ہے کسی قدر راستے پر آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے الفاظ میں جو قرآنی مضامین بیان فرمائے ہیں۔ وہ محفوظ ہیں یا نہیں؟ اور محفوظ ہیں تو حجت ہیں یا نہیں؟ اگر حجت نہیں تو کیا آپ قرآنی مضامین کی حجیت سے بھی انکار کرتے ہیں؟ اگر حجت ہیں تو حدیث کی حجیت سے انکار باطل ہوگیا۔ کیونکہ جو جماعت حدیث کو دینی حجت مانتی ہے وہ یہی کہتی ہے کہ سنت میں جو کچھ ہے قرآن ہی کی تفسیر وشرح ہے۔ قرآن ہی کے مضامین کی توضیح وتشریح ہے۔ اور اگر تعلیمات رسول محفوظ نہیں تو ہم بتلا چکے ہیں کہ تنہا قرآن امت کے حق میں تبیانا لکل شیئ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ قرآن سے نہ نماز کا طریقہ معلوم کرسکتی ہے۔ نہ زکوٰۃ کا نہ روزہ کا نہ حج کا نہ نکاح کا، اور نہ غذاؤں میں حلال وحرام کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ جس کا جو جی چاہے گا دعویٰ کرنے لگے گا اور کوئی صورت تعیین مراد قرآن کی نہ ہوگی۔ اسی مقالہ میں بطور نمونہ کے ہم نے چند مجملات قرآن کا حوالہ دیا ہے۔ تعلیمات رسول کے بغیر ان مجملات کی مراد واضح نہیں ہوسکتی۔ تمنا صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھ لی دوسری آیت نہ پڑھی۔ جس میں حق تعالیٰ نے قرآن کے علاوہ حکمت کا نازل کرنا بھی بیان فرمایا ہے وانزل اللّٰہ علیک الکتاب والحکمۃ اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتے تھے، وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ایسی تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا نام حدیث وسنت ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ''اسی لئے حدیثوں کی صحت کا اصلی اور قطعی معیار مطابقت قرآن مبین ہے۔'' میں بتلا چکا ہوں کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو۔ وہ کسی کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں مگر اس کا فیصلہ کرنا کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ فقہاء ومجتہدین ہی کا کام ہے۔ ایرا غیر انتھو خیرا کا

کام نہیں۔ اور آپ کا یہ دعویٰ کہ جن احادیث میں ایسے مضامین ہیں۔ جن سے قرآن خاموش ہے وہ بھی قرآن کے خلاف ہیں سراسر غلط ہے۔ ورنہ چاہیے کہ جہاں قرآن میں اجمال ہے وہاں بھی حدیث خاموش رہے اور اجمال کی تفسیر وتوضیح نہ کرے۔ کیونکہ قرآن نے تفسیر نہیں کی۔ تو پھر مشکلات قرآن کا حل کیا۔ تمنا صاحب کی رائے سے کہا جائے گا؟ اور اگر ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن میں کسی جگہ اجمال اور اشکال ہے ہی نہیں۔ تو وہ قرآن دانی سے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں چند نمونے پیش کر دیئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اور بھی مثالیں مجملات قرآن کی پیش کر دی جائیں گی دیکھیں تمنا صاحب کہاں تک اجمال کا انحصار کرتے ہیں۔ آیت قرآنی وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ میں بالا جمال اعتکاف کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور اس کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل سے بتلا دیا تھا۔ جس پر آج تک امت کا عمل چلا آ رہا ہے اور مولانا تمنا عمادی بھی غالباً اسی کے موافق اعتکاف کرتے آئے ہیں۔ مگر طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۶ء میں اسی طرح اعتکاف کرنے کو رھبانیت قرار دیا گیا اور اس کی حقیقت ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں کسی کو روک دینا بتلائی ہے اگر اس کا نام قرآن فہمی ہے تو تمنا صاحب ذرا اس پر بھی روشنی ڈالتے جائیں۔ ورنہ جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ اگر قرآن کو تعلیمات رسول سے الگ کر دیا گیا۔ تو ہرا یرا غیرا نتھو خیرا جو جی میں آئیگا کہے گا اس کی زبان وقلم کو لگام دینے والی کوئی چیز نہ ہوگی۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا اور بتلا دوں کہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۶ء میں آیت وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا O کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے ''اور خدا نے اے پیغمبر اسلام تم پر کتاب اور حکمت (دونوں) نازل کی ہیں اور تمہیں وہ چیزیں سکھائی ہیں۔ جو تم نہیں جانتے تھے اور خدا کا تم پر بڑا فضل رہا ہے۔'' جس میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو چیزیں نازل ہوئی ہیں ایک کتاب دوسری حکمت۔ اگر حکمت بھی کتاب ہی ہے تو دو چیزوں کا نزول نہ ہوگا صرف ایک کا ہوگا۔ حالانکہ قرآن میں الکتاب والحکمۃ معطوف معطوف علیہ ہیں جو الگ الگ دو چیزوں کا مقتضی ہے اور طلوع اسلام نے بھی ترجمہ میں ان کا دو ہونا تسلیم کیا ہے اور جب حکمت کتاب سے الگ ہے تو ثابت ہوگیا کہ آپ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ جس کا نام حکمت ہے۔ اور جن آیات میں تعلیم الکتاب والحکمۃ بار بار آیا ہے ان سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح امت کو کتاب کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرح حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اسی تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا مجموعہ حدیث وسنت ہے اور جب قرآن کی حفاظت سے مراد صرف نقوش وحروف کی حفاظت مراد نہیں بلکہ اس کے معانی ومطالب ومقاصد کی حفاظت بھی مراد ہے تو اس سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا محفوظ رہنا بھی لازم آ گیا جو کتاب وحکمت کے سلسلہ میں آپ نے ارشاد فرمائی ہیں۔ اور جب خود قرآن سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور حکمت (دونوں) نازل فرمائی ہیں تو اگر محدثین نے حدیث مثلہ معہ کو قرآن کے موافق دیکھ کر قبول فرمالیا اور اس کو اپنی کتابوں میں درج فرما دیا تو کیا قصور کیا؟ رہا یہ کہ حکمت سے مراد قانون الٰہی کی علت و وجہ ہے یا مطلق سنتِ رسول جو علل احکام پر بھی مشتمل ہے اور شرح کتاب اللہ پر بھی تو ان میں سے جو بھی مراد ہو آیت وانزل اللّٰہ علیک الکتاب والحکمۃ میں عطف سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ کہ حکمت بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ ہے۔ کیونکہ عطف میں اصل مغایرت ہے اور اصل سے بلا دلیل عدول نہیں ہوسکتا۔ اور جب حکمت بھی منزل من اللہ ہے۔ تو حدیث مثلہ معہ اس کے موافق ہے۔ پس مدیر طلوع اسلام کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ قرآن سے باہر رسول پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی اور ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ جو حدیث عموم قرآن یا ظاہر

قرآن کے موافق ہو اگر چہ اس کی سند ضعیف ہو قابل قبول ہوگی۔ حدیث مثلہ معہ کی یہی شان ہے کہ وہ آیت وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ کے موافق ہے تو اس کو تمنا صاحب بھی رد نہیں کر سکتے جن کے نزدیک حدیث کی صحت کا معیار موافق قرآن ہی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی عادت کے موافق ایسی بات کو دہرایا ہے۔ جس کو ہر مضمون میں ذکر کیا کرتے ہیں کہ منافقین عجم نے جھوٹی اور مفسدانہ حدیثیں گھڑنے کے لئے اور اسلام کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے کے لئے کچھ مراکز بنا رکھے تھے۔ جیسے خراسان، کوفہ شام، نیشاپور وغیرہ وغیرہ۔

یہ محض ان کی قیاس آرائی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حدیث روایت کرنے والوں میں بعضے اہل اھواء اور اہل بدعت کذابین وضاعین بھی تھے۔ جیسا ہر جماعت میں اچھوں کے ساتھ برے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی جھوٹی اور من گھڑت حدیثوں کو ناقدین ماہرین وحفاظ حدیث نے اس طرح نکال پھینکا تھا جیسے دودھ میں سے مکھی۔ مگر یہ کہ وضع حدیث کسی منظّم سازش کے ماتحت تھی۔ اور اس کے مراکز بلاد اسلام میں قائم تھے۔ محض افسانہ اور قیاس آفرینی ہے۔ اگر ایسے قیاسات سے منظم سازش کا ثبوت ہوسکتا ہے تو یہ قیاس بھی مان لینا چاہیے کہ انکار حدیث کے سلسلہ میں جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ سراسر یہودی سازش ہے۔ کیونکہ حجیت حدیث کا انکار کرنے والے جتنی باتیں حدیث کے متعلق کہتے ہیں یہ سب ایک شامی یہودی کے قول کی صدائے بازگشت ہے جس نے سب سے پہلے یہ باتیں اپنی کتاب میں لکھی تھیں تا کہ مسلمانوں کے دلوں میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں اور اسلام کی قدیم شکل مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ چنانچہ انگریزی دان طبقہ اس یہودی کے فریب میں آ گیا اور مصر و شام و ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں انکار حدیث کے مراکز قائم ہو گئے۔ جن کو یہودیوں اور یہود نواز برطانیہ سے امداد پہنچتی رہتی ہے۔ تو کیا تمنا صاحب اس قیاس آرائی کو قبول

فرمائیں گے؟

اس کے بعد آپ نے خطیب کی کفایہ سے یہ عبارت نقل کر کے باب ما جاء فی التسویۃ بین حکم کتاب اللہ وحکم سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجوب العلم ولازم التکلیف اور اس کا مہمل ترجمہ کر کے فرمایا ہے کہ ''جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اس لئے کہ سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے احکام کی تعلیم جس طرح خود رسول نے کی اور رسول کی تعلیم کے مطابق صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے کی تو سنت رسول دراصل قرآن کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ قرآنی احکام کی عملی تفسیر کا نام سنت رسول ہے۔ اس لئے سنت رسول کا اتباع عین قرآن کا اتباع ہے۔ جس طرح قرآن میں ارشاد فرمایا گیا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ تو جس طرح اللہ کی اطاعت رسول ہی کی اطاعت ہے۔ اسی طرح قرآن کا اتباع سنت صحیحہ رسول کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے۔ خط کشیدہ عبارت میں آپ نے تسلیم کرلیا ہے کہ قرآن کا اتباع سنت صحیحہ رسول کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے۔ اس کے بغیر ممکن نہیں پھر طلوع اسلام حجیت حدیث کا انکار کیسے کرتا ہے؟ جب سنت صحیحہ رسول کے اتباع پر قرآن کا اتباع موقوف ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سنت صحیحہ دینی حجت ہے اور جب احکام قرآن غیر متبدل ہیں تو سنت صحیحہ متبدل کیسے ہوسکتی ہے۔ جس کے اتباع پر قرآن کا اتباع موقوف ہے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ

''قرآنی احکام کی عملی تفسیر کا نام سنت رسول ہے اس لئے سنت رسول قرآن کے علاوہ کچھ نہیں۔'' اس پر سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام کی جو کچھ عملی تفسیر بیان کی ہے وہ قرآن کے اندر مذکور ہے یا اس سے باہر ہے؟ ظاہر ہے کہ حضور کی عملی تفسیر آپ کے عمل سے ہوئی ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ بلکہ اس کو سنت صحیحہ نے بیان کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ قرآن تبیانا لکل شئ نہیں ہے۔

بلکہ رسول کی عملی تفسیر کو ملا کر تبیانا لکل شیٔ ہے۔ یا یوں کہئے کہ قرآن تو تبیانا لکل شیٔ ہے۔ امت کو قرآن پر عمل کرنے اور اس کے مطالب کو سمجھنے کے لئے سنت صحیحہ رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ یہی ہم کہتے ہیں۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کے خلاف کوئی حدیث قابل قبول نہیں۔ مگر کسی حدیث کا خلاف قرآن ہونا زید وعمر کی رائے سے قبول نہ کیا جائے گا۔ اس میں فقہا مجتہدین کی رائے مانی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کا خود فیصلہ ہے وفوق کل ذی علم علیم اور فقہاء مجتہدین کا دوسروں سے فوق ہونا ظاہر و بدیہی ہے۔

رہا آپ کا یہ دعویٰ کہ جن مسائل میں قرآن خاموش ہے ان کے متعلق بھی جو حدیثیں وارد ہونگی وہ قرآن کے خلاف ہوں گی۔'' اس کا غلط ہونا اوپر واضح کر چکا ہوں اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن مسائل میں حدیث ناطق ہے اور آپ قرآن کو ساکت سمجھتے ہیں یہ آپ کی فہم کا قصور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ان مسائل میں بھی قرآن ساکت نہ تھا۔ آپ دوسروں سے زیادہ قرآن کو سمجھتے ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی ایسی باتیں بیان فرمادیں۔ جن کو دوسرے قرآن سے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ قرآن سب کے حق میں مساوی طور سے تبیانا لکل شیئ نہیں ہے رسول کے حق میں دوسروں سے زیادہ تبیانا لکل شیئ ہے۔ اور اس سے انکار کرنے کا کسی مسلمان کو حق نہیں۔ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کا علم نہیں تو آپ کے برابر قرآن کو کون سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے حضرات صحابہ کو جب کوئی حکم قرآن میں صراحۃً نہ ملتا تو سنت رسول میں تلاش کرتے تھے۔ سنت رسول میں بھی نہ ملتا تو خلفاء راشدین کے قضایا میں تلاش کرتے ان میں بھی نہ ملتا تو اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ یہی فقہا امت کا طریقہ رہا ہے۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن کے سمجھنے میں سب برابر نہیں ہیں اس کو سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے۔ آپ کے بعد خلفاء

راشدین کا مرتبہ تھا۔ پھر دیگر فقہاء صحابہ کا پھر مجتہدین تابعین و تبع تابعین کا تو جن مسائل مین حدیث ناطق ہے۔ اور قرآن ساکت ہے وہاں یہی کہا جائے گا کہ ہمارے اور آپ کے نزدیک قرآن ساکت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ساکت نہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا قرآن ہی سے سمجھ کر فرمایا ہے گو ہمیں معلوم نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کس آیت سے کس لفظ سے کس اشارہ سے یہ مسئلہ سمجھا۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایسے نظائر موجود ہیں کہ فقہاء مجتہدین نے قرآن کی بعض آیات سے وہ باتیں سمجھی ہیں۔ جہاں دوسروں کی فہم نہیں پہنچ سکتی تھی اور اگر وہ ان پر طریق استدلال کو بیان نہ کرتے تو دوسرے ہرگز نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس آیت سے یہ مسائل بھی مستبط ہوسکتے ہیں۔ جن کو شک ہو وہ احکام القرآن لابن عربی و احکام القرآن للجصاص الرازی کا مطالعہ کر کے اس حقیقت پر مطلع ہوسکتا ہے تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اشارات سے وہ باتیں سمجھی ہوں۔ جن تک فقہا مجتہدین کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی تھی؟ تو جن مسائل میں حدیث ناطق ہے اور قرآن ہمارے آپ کے نزدیک ساکت ہے وہاں یہی کہا جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حدیث میں فرمایا ہے قرآن سے ہی سمجھ کر فرمایا ہے۔ گو ہماری عقل وفہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوئی۔ تمنا صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کر کے کہ قرآن کا اتباع سنت صحیحہ رسول کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے۔ حدیث مثلہ معہ کے ماننے والوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مگر یہاں تو مراد ہی کچھ اور ہے۔ ہر حدیث مروی کو سنت قرار دے کر تمام حدیثوں کو حکم و وجوب عمل میں قرآن کا ہم پلہ بنانا ان کا مقصود ہے جیسا اس باب کی حدیثوں سے ظاہر ہے۔''

یہاں تمنا صاحب نے تعارف جاہلانہ سے کام لے کر عوام کو دھوکہ دینا چاہا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فقہاء و محدثین ہرگز حدیث کو قرآن کا ہم پلہ نہیں بناتے تمام

کتب اصول میں قرآن کو پہلے حجت مانا گیا ہے اس کے بعد سنت کو چنانچہ محدثین نے حجیت حدیث کے باب میں حضرت معاذ کی ایک حدیث روایت کی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا تھا کیف تقضی؟ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ قال اقضی بما فی کتاب اللہ کہا میں کتاب اللہ سے فیصلہ کرونگا۔ قال فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر کوئی مسئلہ قرآن میں نہ ہو (یعنی تم کو کتاب اللہ میں نہ ملے) قال فبسنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ کہا تو پھر میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروں گا۔ قال ان لم یکن فی سنة رسول اللہ حضور نے پوچھا اگر کوئی مسئلہ سنت رسول میں بھی نہ ہو (وہی مطلب ہے کہ تم کو سنت رسول میں نہ ملے) قال اجتهد رایی. کہا تو پھر میں اپنی عقل سے اجتہاد کروں گا۔ قال الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حضور نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ جس نے رسول اللہ کے قاصد کو توفیق خیر دی (ترمذی۔ ابوداؤد۔ احمد۔ دارمی۔ بیہقی وصححہ ابن القیم فی زاد المعاد وقوی امرہ وقال انہ مشہور عن معاذ) اس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیث مثلہ معہ سے حدیث کو قرآن کا ہم پلہ بنانا مقصود نہیں بلکہ قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کرنے کا امر ہے۔

حضرات صحابہ کا طرز عمل یہی تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

﴿اذا سئلتم عن شیئ فانظروا فی کتاب اللّٰہ فان لم تجدوه فی کتٰاب اللّٰہ ففی سنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فان لم تجدوه فی سنة رسول اللّٰہ فما اجمع علیہ المسلمون فان لم یکن فیما اجتمع علیہ المسلمون فاجتهد رأیک اخرجه الدارمی و البیهقی و رجاله ثقات ونحوه عن ابن عباس بسند صحیح عند

البیھقی و عن شریح فی کتاب عمر رضی اللّٰہ عنہ عند
الدارمی و رجالہ ثقات ﷺ اھ۔

''جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو پہلے کتاب اللہ میں
دیکھو اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو سنت رسول اللہ میں دیکھو اگر سنت
رسول اللہ میں نہ پاؤ تو مسلمانوں کے اجماعی مسائل میں دیکھو اگر
اجماعی مسائل میں بھی نہ ملے تو اپنی عقل وفہم سے اجتہاد کرو۔ اس
کے رجال ثقہ ہیں اور عبداللہ بن عباس سے بھی بسند صحیح اس کے
موافق مروی ہے۔ حضرت عمرؓ نے شریح قاضی کے نام پر جو خط لکھا
تھا۔ اس میں بھی ایسا ہی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

ان ہی احادیث و آثار کو فقہاء نے کتب اصول میں بیان کر کے شرعی حجتوں میں یہی ترتیب بیان کی ہے کہ سب سے پہلے قرآن حجت ہے پھر حدیث رسول پھر اجماع امت پھر قیاس مجتہد''۔

حدیث مثلہ معہ میں جو حدیث کو مثل قرآن کہا گیا ہے۔ تمنا صاحب خوب جانتے ہیں کہ تشبیہ میں عادات من کل وجہ نہیں ہوا کرتی کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے نور کی مثال چراغ کے نور سے دی ہے تو کیا چراغ کا نور حق تعالیٰ کے نور کے برابر ہوگیا؟ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اسی طرح ان حدیثوں میں حدیث کو مثل قرآن کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل قرآن کی مثل ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی حکم قرآن میں تم کو نہ ملے اور سنت میں مل جائے تو سنت پر عمل کرنا واجب ہے یہ کہنا جائز نہیں کہ قرآن اس حکم سے ساکت ہے اس لئے ہم قرآن کے سوا اور کچھ نہ مانیں گے۔

تمنا صاحب کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ محدثین ہر حدیث مروی کو سنت قرار دے کر

واجب العمل قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر محدثین نے ہر حدیث مروی کو واجب العمل قرار دیا ہوتا تو بخاری اور مسلم اور ابوعوانہ و ابن جارود اور حاکم و ابن السکن وغیرہم کو صحیح حدیثیں جمع کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور ترمذی کو ہر حدیث کا درجہ بتلانے کی حاجت نہ ہوتی۔

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اخبار آحاد میں سے باب احکام میں صرف حدیث صحیح یا حسن کو واجب العمل سمجھا گیا ہے۔ اب حدیث صحیح اور سنت صحیحہ کا معیار معلوم کرنا باقی رہا۔ سو کتب اصول حدیث و اصول فقہ میں محدثین وفقہاء نے اس کا معیار روایت اور درایت دونوں کے اعتبار سے مفصل بیان کر دیا ہے۔ میں نے اپنی کتاب انہار السکن مقدمۂ اعلاء السنن میں حنفیہ کے اصول حدیث بیان کر دیئے ہیں۔ مولانا تمنا عمادی اپنے اصول بیان فرمائیں۔ حدیث کی صحت کے لئے یہ شرط تو سب کے نزدیک ہے کہ وہ کتاب اللہ کے خلاف نہ ہو مگر میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب پھر کہتا ہوں کہ اس باب میں زید و عمر کا قول قبول نہ کیا جائے گا۔

قرآن کے خلاف اس حدیث کو کہا جائے گا۔ جس کو فقہاء و محدثین نے خلاف سمجھا ہے کیونکہ وہ ہم سے آپ سے زیادہ قرآن و حدیث کو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا تمنا عمادی سے چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) جس راوی کو کچھ لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ اور بعض نے اس پر جرح کی ہے اور تعدیل و جرح دونوں مبہم ہیں۔ وہاں ترجیح کس کو ہوگی؟ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ ہر راوی کو جس میں کسی ایک نے بھی جرح کی ہے۔ مجروح قرار دیتے ہیں اس کے متعلق آپ کو اپنا اصول واضح کرنا چاہیے۔

(۲) اگر کسی روایت کے متعدد طرق ہوں تو کثرت طرق سے اس کو تقویت ہوگی یا نہیں؟ حدیث مثلہ معہ کے متعلق آپ کو تسلیم ہے کہ بائیس طرق سے مروی ہے پھر بھی آپ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف کی ضعیف ہی ہے حالانکہ محدثین و فقہاء کے

نزدیک حدیث حسن کثرت طرق سے صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے اور حدیث ضعیف کثرت طرق سے حسن لغیرہ بن جاتی ہے۔ مگر آپ کے نزدیک کچھ بھی نہیں بنتی تو اس کے متعلق بھی اپنا اصول واضح کریں۔

(۳) جس راوی میں جرح مبہم بھی ہو اور تعدیل مفسر بھی وہاں آپ کس کو ترجیح دیں گے۔

(۴) قرآن اور سنت صحیحہ سے استنباط احکام کے اصول آپ کے نزدیک کیا ہیں؟

یا صاحب معارف القرآن کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ اور تفسیر ہی کی مدد سے آپ قرآن کو سمجھتے ہیں؟ اگر استنباط احکام کے اصول وہی ہیں جو فقہاء نے بیان کئے ہیں تو اس کی تصریح کرنا چاہیے۔ اگر ان کے علاوہ کچھ اصول ہیں تو مع دلائل پیش فرمائیں۔

میں بتلا چکا ہوں کہ حدیث مثلہ معہ آیت وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کے موافق ہے اور مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ اور تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ کے ہرگز خلاف نہیں پھر اس کو ضعیف یا موضوع قرار دینا ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

ولکن هذا آخر الكلام فی هذا المرام والعلم عند الله الملک العلام والصلوة والسلام علی سیدالانام سیدنا محمد و آله و اصحابه البررة الكرام الی یوم القیام و بعده علی الدوام والحمد لله رب العلمین.

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

انسائیکلوپیڈیا

مؤلف

ڈاکٹر ذوالفقار کاظم

بیت العلوم

۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

انسائیکلوپیڈیا

مؤلف

ڈاکٹر ذوالفقار کاظم

بیت العلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۲۴۸۳

انبیائے کرام علیہم السلام

اِنسائیکلوپیڈیا

مؤلف

ڈاکٹر ذُوالفقار کاظم

بیتُ العُلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۲۸۳

ازواجِ مطہراتؓ وصحابیاتؓ انسائیکلوپیڈیا

مؤلف

ڈاکٹر ذوالفقار کاظم

بیتُ العُلوم

۲۰- نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۲۸۳